باسمہ تعالیٰ یا فتاح

(عکسی)

عظیم اسلامی انسائیکلوپیڈیا

(اول)

جسمیں

علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، تاریخ فرقِ اسلام، کفر و ایمان و تقلید کی حقیقت ردِ بدعت، قادیانیت و شیعیت، عربی میں خطبۂ جمعہ کیوں؟ سمتِ قبلہ، قرآنی رسم الخط کے علاوہ "فلسفۂ اسلام" علم کلام، اور سائنس شریعت کے درپیش جدید مسائل کے حل پر مشتمل چوبیس ۲۴ تحقیقی، فقہی کتابوں کا مجموعہ

تالیف

فقیہ ملت مفتیٔ اعظم حضرت مولانا
مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ

ترتیب

ابن الشفیع مولانا مفتی محمد رفیع صاحب
استاذ حدیث دار العلوم (کراچی)

(جدید تزئین نشر) مولوی شاہد حسن قاسمی (ابن، مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ
حال استاذ دار العلوم دیوبند

مولوی خورشید حسن قاسمی — ایف. ڈی. بی. اے. علیگ
رفیق دار الافتاء دار العلوم . دیوبند

ناشر:- مکتبہ تفسیر القرآن، عارف کمپنی، سید منزل جامع مسجد دیوبند یو.پی

رعایتی ہدیہ اول [illegible] (حقوق ترتیب محفوظ) دوم: ۲۴/- سوم ۲۸/- بقیہ زیر طبع

یافتاح

۸۶

عرضِ ناشر

میرے جد المکرم فقیہہ الملت مفتیٔ اعظم اسلام حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ طائفۂ کاملین و جماعت عارفین کے ممتاز ترین طبقہ میں فرد وحید اور مدام شخصیت ہیں۔

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق ۝ ثبت ست بر جریدهٔ عالم دوامِ ما

میرے والد بزرگوار حضرت مولانا سید حسن صاحبؒ، خلیفۂ اجاز حضرت تھانویؒ۔ اور ۴۴ برس تک دار العلوم دیوبند کے عظیم استاذ تفسیر و حدیث رہے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کے حقیقی بھانجے ہونے کے ناطے قریبی حالات کے شاہد سے فرماتے تھے کہ حقوق اللہ و حقوق العباد کے عظیم امتزاج کا مظہر حضرت مفتی صاحبؒ کی ذاتِ گرامی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی کثیر تصانیف میں جو پیش نظر کتاب جواہر الفقہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو بوادر النوادر کو حضرت تھانویؒ سے۔

جواہر الفقہ۔ جو درحقیقت عظیم اسلامی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ کتاب حضرت مفتی صاحبؒ کے ان قیمتی مضامین و کتب کا مجموعہ ہے جو شائع نہ ہو سکے۔ یا شائع ہو کر گم ہو گئے۔ برادرم مولوی خورشید حسن صاحب قاسمی۔ بی۔ اے۔ جو اس وقت دار الافتاء دار العلوم میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حضرتؒ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل زیارت اور قیام مسلسل کا شرف پا سکے۔ ان سے جواہر الفقہ کی اشاعت گویا حضرت مفتی صاحبؒ کی آخری وصیت تھی جس کی مندرجہ ذیل خصوصیات کے ساتھ تکمیل کی جا رہی ہے۔

(الف) ترتیب دیگر حضرت مفتی صاحبؒ کا رسالہ احکام و فضائل دعا کا جدید اضافہ کیا گیا ہے

(ب) خصوصی توجہ و نظر کے ساتھ آیات کلام اللہ پر اعراب اور مزید تشریح و تعارف کا اضافہ ہے

(ج) حروف اور تحریری ترکہ کی اصلاح کے لیے کتاب کی نیچنگ اور تزئین کی گئی ہے۔

پیش نظر ۲۴ رسائل کے مجموعہ کا ہدیہ کراچی ایڈیشن میں ۲۵ روپے ہے۔ ایسے ہی دوسری بیش کتب کا مجموعہ (زیر طبع ہے) اس کا ہدیہ بھی ۲۵ روپے ہے۔

(۱) ــــــ ہم پانچ روپیہ فیس ممبری ادا کرنے والے ممبر کو خصوصی رعایت کے ساتھ یہ جلد اور اگلی جلد پیش کریں گے۔ البتہ ممبران کو پانچ خریدار بنانے ضروری ہوں گے
(تفصیلات کے لیے ادارہ سے خط و کتابت کریں)

فقط۔ شاہد حسن قاسمی۔ بن مولانا سید حسن صاحبؒ حال مدرس دار العلوم دیوبند۔ جمعہ ۲۶ ۱۱/۹۱ھ

فہرست مضامین جواہر الفقہ (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

بقلم مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی، نائب مفتی دارالعلوم کراچی

ایسے رسائل کی تصنیف کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے جن میں کسی ایک مسئلہ کی تحقیق اس انداز میں کی گئی ہو کہ اُس کے جملہ متعلقات کا ضروری مواد مرتب شکل میں جمع ہو جائے۔ ایسی تصنیف کو محدثین کی اصطلاح میں "جزء" اور عام علمی اصطلاح میں "رسالہ" کہا جاتا ہے۔

ایسے رسائل کی ابتدائی مثالیں عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب الصدقہ جو آپؐ نے عاملوں کو بھیجنے کے لئے آخر حیات میں لکھوائی تھی اور بعد میں وہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس محفوظ رہی۔ اس میں زکوٰۃ کی شرحیں اور نصابوں کی تفصیلات درج تھیں (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ ص ۲۱۸ تا ۲۲۰ ج ۱) اسی طرح کا ایک رسالہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بحرین بھیجتے وقت لکھ کر دیا تھا۔ یہ بھی زکوٰۃ ہی کی تفصیلات پر مشتمل تھا۔ صحیح بخاری میں اس کے اقتباسات کئی جگہ آئے ہیں (مثلاً ص ۱۹۴ تا ۱۹۶ ج ۱ کتاب الزکوٰۃ)

عہدِ صحابہؓ کے بعد نت نئے حالات کی وجہ سے ایسے رسالوں کی ضرورت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس ضرورت کو پورا کرنے والے مردانِ علم و فضل بھی ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے اس طرح مختلف فقہی مسائل پر ہر دور میں بے شمار مستقل رسالے لکھے گئے اور بعض فقہاء کے ایسے رسائل کے متعدد مجموعے مرتب کر کے شائع کئے گئے جو بعد کے اہلِ علم کے لئے نہایت مفید ثابت

ہوئے، رسائل ابن نجیمؒ، رسائل ابن عابدینؒ اور رسائل مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔

اس قسم کے رسالے اس لحاظ سے نہایت گراں قدر اور مفید ہوتے ہیں کہ ان میں مصنف ذہنی یکسوئی کے ساتھ صرف ایک مسئلہ کو اپنی تحقیق کا محور بناتا اور امکانی حد تک ان تمام کتابوں کو کھنگالتا ہے جن میں متعلقہ مواد ملنے کا ادنیٰ احتمال بھی نظر آئے، وہ اپنی پوری تحقیقی صلاحیت اور نظر و فکر کے تمام اسلوب بروئے کار لاکر اپنی کاوش کا نچوڑ مختصر رسالہ میں جمع کر دیتا ہے۔

اس نئے دور میں انگلستان کے صنعتی انقلاب اور فرانس کے سیاسی انقلاب نے جو گہرے اثرات پوری دنیا پر مرتب کئے پھر جدید فلسفہ، نئے نظام تجارت و معیشت، مغربی سیاست و قانون اور تہذیب جدید نے جن نوع بہ نوع گتھیوں کو جنم دیا، نیز نئے نئے ذہنوں کی پیدائش اور طرح طرح کی گمراہیوں کے پھیلنے سے جو مسائل پیدا ہوئے ان کا اسلامی حل پیش کرنا علماء عصر کی اہم ذمہ داری بن گئی تھی۔۔ ماضی کی طرح اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء و فقہاء اس دور میں بھی پیدا فرما دیئے جنہوں نے اپنی تحقیق و تصنیف کے ذریعہ عصری پیچیدگیوں کو ضروری حد تک سلجھایا اور ثابت کر دیا کہ دینِ اسلام آج بھی وہ واحد دین ہے جو ہر زمانہ کی ہر مشکل کا حل پیش کر سکتا ہے، اور انتہائی بدلے ہوئے حالات میں بھی اس کے احکام نہ صرف قابلِ عمل بلکہ دنیا و آخرت کی فلاح کے ضامن ہیں۔

اس صدی کے جن نامور محققین علماء و فقہاء نے یہ خدمت انجام دی ان میں سرِفہرست حکیم الامت، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا نام گرامی ہے، جن کی تقریباً ایک ہزار تصانیف اس صدی کا عظیم ترین علمی سرمایہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی تصانیف

والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی ذاتِ گرامی بھی اس صدی کے ان خوش بخت علماء کرام میں ممتاز مقام رکھتی ہے، جنہوں نے

اس نازک کام میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کی دو سو کے قریب تصانیف جو تفسیر، حدیث، عقائد،
فقہ، تصوف، تاریخ، سیاست، ادب، لغت، وعظ و ارشاد غرض ہر دینی شعبے سے متعلق
ہیں اِن سب کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عصرِ جدید کے ایسے مسائل کو خاص طور
سے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جن کے بارے میں سلف کی کتابوں میں تفصیلی مباحث نہیں ملتے۔

یہ تصانیف علوم و معارف کا بیش بہا خزانہ ہونے کے علاوہ ایک لحاظ سے برِ صغیر
پاک و ہند کے ان تمام نظریاتی، سیاسی اور معاشرتی رجحانات کی تاریخ بھی ہیں جو پچھلے
پچاس برس میں اُمت کے مختلف طبقات میں پیدا ہوئے، کیونکہ اس پُوری مدت میں جو
نیا مسئلہ پیدا ہوا، یا جس نئے فتنہ نے علمی راہ سے ذہنوں کو مسموم کرنے کی کوشش کی حضرت
والد ماجد مدظلہم نے اُس میں اپنے فتاویٰ، تصنیف، تحقیقی مضامین و مقالات اور رسائل
سے اُمت کی بروقت رہنمائی فرمائی۔ اس طرح دین کے ہر شعبہ میں موصوف کی کئی کئی تصانیف
وجود میں آگئیں، صرف فقہ پر آپ کی پچانوے (۹۵) تصانیف ہیں۔ جن میں سے بعض
اگر صرف سات آٹھ صفحات پر مشتمل ہیں تو بعض کی ضخامت نوسو (۹۰۰) تک پہنچی ہوئی ہے
مثلاً فتاویٰ دار العلوم دیوبند (اُردو) اور احکام القرآن (عربی)

ان فقہی تصانیف کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ یہ فقہی تحقیقات کے سلسلے کی ایک
ناگزیر کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں، ان سے قطع نظر کرکے موجودہ بہت سے مسائل کا شرعی حل
اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ اِن تصانیف کو اگر بیچ سے نکال دیا جائے تو ماضی
اور مستقبل کے درمیان ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جسے پُر کرنا مستقبل کے اہلِ فتویٰ کے لئے
انتہائی کٹھن مرحلہ ہوگا۔

والد ماجد مدظلہم کی ان فقہی تصانیف و رسائل کی ایک بڑی تعداد تو مستقل کتابی
شکل میں شائع ہوتی رہی ہے جن میں سے اکثر کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ نیز سات
رسائل فقہیہ احکام القرآن (عربی) کا جزو بن کر طبع ہوئے ہیں جن کا اُردو ترجمہ کرنے
کی ضرورت ہے، نہ معلوم یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے کس کے نصیب میں لکھی ہے۔ نیز انیس
(۱۹) فقہی رسائل فتاویٰ دار العلوم دیوبند کا جزو بن کر شائع ہو چکے ہیں، اِن سب

تصانیف کا مختصر مختصر تعارف اس کتاب کے آخر میں قارئین کو ملے گا۔

جواہر الفقہ

پینتالیس (۴۵)، فقہی رسائل ایسے تھے جو یا تو اب تک طبع ہی نہیں ہو سکے تھے، یا محض کسی ماہنامہ وغیرہ میں ایک مضمون کی حیثیت سے شائع ہوئے تھے، یا طبع ہو کر نایاب ہو گئے تھے، یا نایاب کبھی نہیں ہوئے تھے مگر ضخامت بہت کم ہونے کے باعث ان کو الگ الگ محفوظ رکھنا، اور بر وقت، اُن سے استفادہ آسان نہ تھا۔ باذوق اہلِ علم کا عرصہ سے اصرار تھا کہ ایسے سب رسائل کو ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ اُن سے استفادہ آسان ہو، اور یہ عظیم علمی سرمایہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی محفوظ ہو جائے، حضرت شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہٗ، جو والد ماجد کی تصانیف کے بجا طور پر بہت مداح اور قدر شناس تھے اور ہر تصنیف کا ہر ایڈیشن حاصل کرنے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اُن کا تو ہمیشہ ہی یہ اصرار رہتا تھا۔

میرے برادر بزرگوار جناب مولانا محمد زکی صاحب کیفی رحمۃ اللہ علیہ جن کو آج "رحمۃ اللہ علیہ" لکھتے ہوئے جگر پاش پاش ہوا جاتا ہے اور جو ابھی اٹھارہ روز قبل اچانک اِس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے، انھوں نے پچھلے سال لاہور میں اس کام کا آغاز نہایت اہتمام سے فرمایا، ایسے رسائل کو بمشکل تمام مختلف جگہوں سے حاصل کیا۔ بعد ازاں کراچی میں کچھ اور رسائل و مقالات حضرت والد صاحب مدظلہم کے مسودات میں، اور کچھ ماہنامہ القاسم دیوبند، ماہنامہ المفتی دیوبند، اور ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے پُرانے فائلوں میں دستیاب ہو گئے اور جوں جوں تلاش جاری رہی ایسے رسائل ملتے چلے گئے، یہ گراں مایہ رسائل جس انداز میں نایاب، منتشر یا مخفی ہو گئے تھے خطرہ تھا کہ کچھ عرصہ بعد ضائع ہی ہو جاتے، غرض ان تمام رسائل کو جمع کر کے حضرت والد ماجد مدظلہم کی اجازت سے مرتب کیا گیا، ہر رسالہ کی تاریخ و مقامِ تصنیف اور مختصر تعارف ہر رسالہ کے شروع میں لکھ دیا گیا، اسی اثناء میں بعض رسائل پر حضرت والد ماجد مدظلہم نے نظرِ ثانی بھی فرمائی، اس طرح فقہی رسائل کا یہ عظیم الشان مجموعہ

بحمد اللہ تیار ہو گیا، برادر بزرگوار جناب مولانا محمد زکی صاحب کیفی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مجموعہ کا نام "جواہر الفقہ" تجویز کیا تھا جسے والد ماجد مدظلہم نے پسند فرمایا اور اب اسی نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

میری خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جمع و ترتیب میں احقر کو بھی کچھ وقت صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائی، مگر افسوس ہے کہ اس کی تکمیل آج اس وقت ہو رہی ہے جب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اور برادر بزرگوار جناب کیفی صاحب رحمۃ اللہ علیہما اس دنیا میں اسے دیکھنے کے لئے موجود نہیں۔ ان دونوں حضرات کو اس مجموعے سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی، وہی اس کے سب سے پہلے محرک تھے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ سے نوازے۔ آمین۔

اس مجموعہ کی خصوصیات

۱۔ اس مجموعہ میں حضرت والد ماجد مدظلہم کے صرف فقہی رسائل شامل کئے گئے ہیں۔ دوسرے دینی موضوعات پر ایسے رسائل کا مجموعہ الگ زیر ترتیب ہے۔

۲۔ اس مجموعہ میں فقہی رسائل بھی صرف وہ شامل کئے گئے ہیں جو

(الف) اب تک طبع نہیں ہوئے یا

(ب) کسی ماہنامہ وغیرہ میں مضمون کی حیثیت سے شائع ہوئے الگ کتابی شکل میں نہ آئے تھے یا

(ج) طبع ہو کر عرصے سے نایاب ہو گئے تھے یا

(د) نایاب بھی نہ تھے مگر ضخامت بہت کم ہونے کے باعث اُن کا الگ الگ محفوظ رکھنا اور بروقت اُن سے استفادہ آسان نہ تھا۔

۳۔ اس مجموعہ میں رسائل کی باہمی ترتیب امکانی حد تک ابواب فقہیہ کی ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہے، مثلاً نماز سے تعلق رکھنے والے رسائل کو ان رسائل پر مقدم کیا گیا ہے جن کا تعلق روزہ اور رمضان سے ہے۔ اسی طرح آخر تک ہے۔

۴۔ ہر رسالہ کے شروع میں اس کا مختصر تعارف اور اُس کی تصنیف کا پس منظر بیان کردیا گیا ہے۔

۵۔ اس مجموعہ کے بعض رسائل عوام کے لئے آسان زبان میں لکھے گئے تھے اور اکثر کا اسلوبِ تحریر تحقیقی و اصطلاحی ہے کیونکہ وہ خاص اہلِ علم کے لئے لکھے گئے تھے۔

۶۔ تمام رسائل کی مفصل فہرست مضامین مجموعہ کے بالکل شروع میں ترتیب وار درج کردی گئی ہے۔

۷۔ اکثر رسائل میں عنوانات خود حضرت والد ماجد مدظلہم کے قائم کردہ ہیں صرف تین رسالوں (۱) عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ (۲) ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی حدود شرعیہ (۳) یتیم پوتے کی میراث، میں عنوانات احقر نے قائم کئے ہیں۔

۸۔ یہ سب کام مؤلف مدظلہم کے ایماء و اجازت سے کیا گیا ہے۔

۹۔ ان میں سے کئی رسائل پر حضرت مؤلف مدظلہم نے حال ہی میں نظر ثانی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ مشکل مسائل میں یہ عظیم مجموعہ عرصہ دراز تک اُمت کی رہنمائی کرے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ والصلوٰۃ والسلام
علیٰ سیدنا محمد خاتم النبیین۔ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین
الیٰ یوم الدین

محمد رفیع عثمانی

نائب مفتی دارالعلوم کراچی ۱۴۰

۲۸ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ

وصول الافکار
الیٰ
اصول الاکفار

تکفیر کے اُصول

اور

آغاخانی فرقہ کا حکم

اس کے علاوہ

کفر اور ایمان کی تعریف
ردِّ قادیانیت و مرزائیت
ردِّ بدعت اور گمراہ فرقوں کی تاریخ
اور
اُن کے عقائدِ باطلہ کی تردید

تاریخ تالیف ـــــــــــ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ

مقامِ تالیف ـــــــــــ دیو بند ضلع سہارنپور

طبع اوّل ـــــــــــ دارالاشاعت دیو بند ۱۳۵۱ھ

"کفر اور اسلام کا معیار کیا ہے؟ کسی مسلمان کو کس وجہ سے مرتد یا خارج از اسلام کہا جا سکتا ہے؟ اور کونسی گمراہیاں انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس مقالہ کا موضوع ہے، اور اس ضمن میں چکڑالوی، مرزائی اور آغاخانی فرقوں کی صحیح حیثیت بھی واضح کی گئی ہے۔"

سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہ کی رائے گرامی

رسالہ وصول الافکار الی اصول الاکفار کے متعلق

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک مفصل خط پر تنقید کے آخر میں حضرت تھانویؒ نے مندرجہ ذیل جملے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ خط ۷ر شعبان ۱۳۵۱ھ کا تحریر فرمودہ ہے اور ماہنامہ "النور" تھانہ بھون ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا تھا اور پھر امداد الفتاوی مبوّب کی جلد چہارم ص ۵۲۹ پر شائع ہوا ہے۔ وہ جملے یہ ہیں۔

"مولوی محمد شفیع صاحب نے اصول تکفیر میں ایک مختصر اور جامع مانع اور نافع رسالہ لکھا ہے۔ بعض اجزاء میں مَیں بھی اُلجھا تھا، مگر ان کی تقریر و تحریر سے قریب قریب مسئلہ صاف ہوگیا وہ عنقریب چھپ جاوے گا میں نے اس کا نام رکھا ہے وصول الافکار الی اصول الاکفار"۔ ۷ر شعبان ۱۳۵۱ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً سیدنا محمد المجتبیٰ ومن بھدیہ اھتدیٰ

امّا بعد

کسی مسلمان کو کافر یا کافر کو مسلمان کہنا دونوں جانب سے نہایت ہی سخت معاملہ ہے۔ قرآن کریم نے دونوں صورتوں پر شدید نکیر فرمائی ہے۔ مسلمان کو کافر کہنے کے متعلق ارشاد ہے:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰہِ مَغَانِمُ کَثِیْرَۃٌ کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَتَبَیَّنُوْا اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۔ (نساء: ۹۴)

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش میں یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو مسلمان نہیں کیونکہ خدا کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا سو غور کرو بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (یعنی جب تم اول مسلمان ہوئے تھے اگر تمہیں بھی یہی کہہ دیا جاتا کہ تم مسلمان نہیں تو تم کیا کرتے)

الغرض اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنا اسلام ظاہر کرے تو جب تک اس کے کفر کی پوری تحقیق نہ ہو جائے اس کو کافر کہنا ناجائز اور وبال عظیم ہے اسی طرح اس کے مقابل یعنی کافر کو مسلمان کہنے کی ممانعت اس آیت میں ہے۔

اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَھْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا (نساء: ۸۸)

کیا تم لوگ اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اس کے لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے۔

سلف صالح صحابہ وتابعین اور مابعد کے ائمہ مجتہدین نے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لینے کی ہدایتیں فرمائی ہیں حضرات متکلمین اور فقہاء نے اس باب کو نہایت اہم اور دشوار گذار سمجھا ہے۔ اور اس میں داخل ہونے والوں کے لئے بہت زیادہ تیقظ وبیداری کی تلقین فرمائی ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ قاریؒ نے شرح شفاء فصل التحقیق القول فی کفار المتاولین میں فرمایا ہے:۔

ادخال کافر فی الملة الاسلامیة	کسی کافر کو اسلام میں داخل سمجھنا یا مسلمان
او اخراج مسلم عنہا عظیم فی الدین	کو اسلام سے خارج سمجھنا (دونوں چیزیں)
(شرح شفاء ص ۵۰۰ ج ۲)	سخت ہیں۔

لیکن آج کل اس کے برعکس یہ دونوں معاملے اس قدر سہل سمجھ لئے گئے ہیں کہ کفر و اسلام اور ایمان و ارتداد کا کوئی معیار اور اصول ہی نہ رہا۔

ایک جماعت ہے جس نے تکفیر بازی کو ہی مشغلہ بنا رکھا ہے۔ ذرا سی خلاف شرع بلکہ خلاف طبع کوئی بات کسی سے سرزد ہوئی اور اُن کی طرف سے کفر کا فتویٰ لگا ادنیٰ ادنیٰ فرعی باتوں پر مسلمانوں کو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں۔ ادھر اُن کے مقابل دوسری جماعت ہے جن کے نزدیک اسلام و ایمان کوئی حقیقت محصلہ نہیں رکھتے بلکہ وُہ ہر اُس شخص کو مسلمان کہتے ہیں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے خواہ تمام قرآن و حدیث اور احکامِ اسلامیہ کا انکار اور توہین کرتا رہے اُن کے نزدیک اسلام کے مفہوم میں ہر قسم کا کفر کھپ سکتا ہے۔ انھوں نے ——— دوسرے مذاہب باطلہ کی طرح اسلام کو بھی محض ایک قومی لقب بنا دیا ہے کہ عقائد جو چاہے رکھے اقوال و اعمال میں جس طرح چاہے آزاد ہے۔ وہ بہرحال مسلمان ہے۔ اور اُس کو اپنے نزدیک وسعتِ خیال اور وسعتِ حوصلہ سے تعبیر کرتے ہیں اور تمام سیاسی مصالح کا محور و مدار اسی کو بنا رکھا ہے۔

لیکن یہ ورہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کجروی اور افراط و

تفریط کے دونوں پہلوؤں سے سخت بیزار ہیں۔ اسلام نے اپنے پیرووں کے لئے ایک آسمانی قانون پیش کیا ہے جو شخص اُس کو ٹھنڈے دل سے تسلیم کرے اور کوئی تنگی اپنے دل میں اُس کے ماننے سے محسوس نہ کرے وہ مسلمان ہے اور جو اس قانونِ الٰہی کے کسی ادنیٰ حکم کا انکار کر بیٹھے وہ بلا شبہ و بلا تردد دائرۂ اسلام سے خارج ہے اُس کے دائرۂ اسلام میں داخل رکھنے سے اسلام بیزار ہے اور اُس کے ذریعہ اسلامی برادری کی مردم شماری بڑھانے سے اسلام اور مسلمانوں کو غیرت ہے۔ اور ان چند لوگوں کے داخلِ اسلام ماننے سے ہزاروں مسلمانوں کے خارج از اسلام ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے جیساکہ بہت دفعہ اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہو چکا ہے۔

اور یہ ایک مضرت ایسی ہے کہ اگر فی الواقع ہزاروں مصالح بھی اس کے مقابلہ میں موجود ہوں تو وہ کسی مذہب دوست مسلمان کے لئے ہرگز قابلِ التفات نہیں ہو سکتیں بالخصوص جب کہ وہ مصالح بھی محض موہوم اور خیالی ہوں

الغرض ابنائے زمانہ کی اس افراط و تفریط اور کفر و اسلام کے معاملہ میں بے احتیاطی کو دیکھ کر مدت سے خیال ہوتا تھا کہ اس بحث پر ایک مختصر جامع رسالہ لکھا جائے جس میں کفر و اسلام کا معیار ہو۔

اور اصولی طور پر یہ بات منقح کر دی جائے کہ وہ کون سے عقائد یا اقوال و افعال ہیں جن کی بنا پر کوئی مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اسی اثناء میں ذیل کے سوال کا جواب لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ تو اسی کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا گیا جس سے علاوہ اصولِ تکفیر معلوم ہونے کے بعض فرقوں کا حکم بھی واضح ہو گیا۔ اور مرتد کے بعض احکام بھی معلوم ہو گئے اور اس مجموعہ کا نام "وصول الافکار الی اصول الاکفار" رکھا گیا ہے۔[1]

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۵

[1] یہ رسالہ حضرت مجدد حکیم الامت دام بالله سیدی و سندی حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم نے با ستیعاب ملاحظہ فرمایا اور بہت سی اصلاحات سے مزین فرمایا۔ اور اس کا نام "وصول الافکار الی اصول الاکفار" تجویز فرمایا۔

سوالِ اوّل

کفر و اسلام کا معیار کیا ہے اور کس وجہ سے کسی مسلمان کو مرتد یا خارج از اسلام کہا جا سکتا ہے؟

الجواب!

ارتداد کے معنی لغت میں پھر جانے اور لوٹ جانے کے ہیں۔ اور اصطلاحِ شریعت میں ایمان و اسلام سے پھر جانے کو ارتداد اور پھرنے والے کو مرتد کہتے ہیں۔ اور ارتداد کی صورتیں دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی کم بخت صاف طور پر تبدیلِ مذہب کر کے اسلام سے پھر جائے۔ جیسے عیسائی، یہودی، آریہ سماجی وغیرہ مذہب اختیار کرے یا خداوندِ عالم کے وجود یا توحید کا منکر ہو جائے۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر دے (والعیاذ باللہ تعالیٰ)۔

دوسرے یہ کہ اس طرح صاف طور پر تبدیلِ مذہب اور توحید و رسالت سے انکار نہ کرے۔ لیکن کچھ اعمال یا اقوال یا عقائد ایسے اختیار کرے جو انکارِ قرآن مجید یا انکارِ رسالت کے مرادف و ہم معنی ہیں۔ مثلاً اسلام کے کسی ایسے ضروری و قطعی حکم کا انکار کر بیٹھے جس کا ثبوت قرآن مجید کی نص صریح سے ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریقِ تواتر ثابت ہوا ہو۔ یہ صورت بھی باجماعِ اُمت ارتداد میں داخل ہے اگرچہ اس ایک حکم کے سوا تمام احکامِ اسلامیہ پر شدت کے ساتھ پابند ہو۔

ارتداد کی اس دوسری صورت میں اکثر مسلمان غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور یہ اگرچہ بظاہر ایک سطحی اور معمولی غلطی ہے۔ لیکن اگر اس کے ہولناک نتائج پر نظر کی جائے تو اسلام اور مسلمان کے لئے اس سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں کفر و اسلام کے حدود ممتاز نہیں رہتے کافر و مومن میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ اسلام کے چالاک دشمن اسلامی برادری کے ارکان بن کر مسلمانوں کے لئے

"مار آستین" بن سکتے ہیں۔ اور دوستی کے لباس میں دشمنی کی برقرار داد کو مسلمانوں میں نافذ کر سکتے ہیں۔

اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس صورت ارتداد کی توضیح کسی قدر تفصیل کے ساتھ کردی جائے اور چونکہ ارتداد کی صحیح حقیقت ایمان کے مقابلہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اس لئے پہلے اجمالاً ایمان کی تعریف اور پھر ارتداد کی حقیقت لکھی جاتی ہے۔

ایمان وارتداد کی تعریف

ایمان کی تعریف مشہور و معروف ہے جس کے اہم جزو دو ہیں۔ ایک حق سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان لانا۔ دوسرے اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ لیکن جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان کے یہ معنی نہیں کہ صرف اُس کے وجود کا قائل ہو جائے بلکہ اُس کی تمام صفات کا مثلاً علم، سمع، بصر، قدرت وغیرہ کو اُسی شان کے ساتھ ماننا ضروری ہے جو قرآن وحدیث میں بتلائی ہیں۔ ورنہ یوں تو ہر مذہب وملت کا آدمی خدا کے وجود وصفات کو مانتا ہے۔ یہودی، نصرانی، مجوسی، ہنود سب ہی اس پر متفق ہیں۔

اِسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا بھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ آپ کے وجود کو مان لے کہ آپ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تریسٹھ سال عمر ہوئی فلاں فلاں کام کئے۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی حقیقت وہ ہے جو قرآن مجید نے بالفاظِ ذیل بتلائی ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔	قسم ہے آپ کے رب کی کہ یہ لوگ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ آپ کو اپنے تمام نزاعات واختلافات میں حکم نہ بنا دیں اور پھر جو فیصلہ آپ فرما دیں اُس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی

محسوس نہ کریں اور اُس کو پوری طرح تسلیم نہ کریں۔

روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر سلف سے اس طرح نقل فرمائی ہے:۔

فقد روی عن الصادق رضی اللّٰہ	حضرت جعفر صادق رضی سے منقول ہے کہ اگر کوئی

عنه انه قال لو ان قوما عبدوا الله تعالیٰ واقاموا الصلوٰة واتوا الزکوٰة وصاموا رمضان وحجوا البیت ثم قالوا لشیٔ صنعه رسول الله صلی الله علیه وسلم الا صنع خلاف ما صنع او وجدوا فی انفسهم حرجا لکانوا مشرکین ثم تلا هذه الاٰیة

قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور نماز کی پابندی کرے ۔ اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کے حج کرے مگر پھر کسی ایسے فعل کو جس کا ذکر حضور سے ثابت ہو یوں کہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا اس کے خلاف کیوں نہ کیا ۔ اور اُس کے ماننے سے اپنے دل میں تنگی محسوس کرے تو یہ قوم مشرکین میں سے ہے ۔

(روح المعانی ص ۶۷ ج ۵)

آیت مذکورہ اور اُس کی تفسیر سے واضح ہوگیا کہ رسالت پر ایمان لانے کی حقیقت یہ ہے کہ رسول کے تمام احکام کو ٹھنڈے دل سے تسلیم کیا جائے اور اس میں کسی قسم کا پس وپیش یا تردد نہ کیا جائے ۔

اور جب ایمان کی حقیقت معلوم ہوگئی تو کفر وارتداد کی صورت بھی واضح ہوگئی کیونکہ جس چیز کے ماننے اور تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے ۔ اُسی کے نہ ماننے اور انکار کرنے کا نام کفر وارتداد ہے (صرح بہ فی شرح المقاصد) اور ایمان وکفر کی مذکورہ تعریف سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کفر صرف اسی کا نام نہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرے سے نہ مانے ۔ بلکہ یہ بھی اُسی درجہ کا کفر اور نہ ماننے کا ایک شعبہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام قطعی ویقینی طور پر ثابت ہیں اُن میں سے کسی ایک حکم کے تسلیم کرنے سے (یہ سمجھتے ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے) انکار کر دیا جائے اگرچہ باقی سب احکام کو تسلیم کرے اور پورے اہتمام سے سب پر عامل بھی ہو ۔

اور وجہ یہ ہے کہ کفر وارتداد حضرت مالک الملک والملکوت کی بغاوت کا نام ہے اور سب جانتے ہیں کہ بغاوت جس طرح بادشاہ کے تمام احکام کی نافرمانی اور مقابلہ پر کھڑے ہو جانے کو کہتے ہیں اسی طرح یہ بھی بغاوت ہی سمجھی جاتی ہے کہ کسی ایک قانون

شاہی کی قانون شکنی کی جائے اگرچہ باقی سب احکام کو تسلیم کرلے۔

شیطان ابلیس جو دنیا میں سب سے بڑا کافر ہے اُس کا کفر بھی اسی دوسری قسم کا کفر ہے کیونکہ اُس نے بھی نہ تبدیل مذہب کیا نہ خدا تعالیٰ کے وجود قدرت وغیرہ کا انکار کیا نہ ربوبیت سے منکر ہوا صرف ایک حکم سے سرتابی کی جس کی وجہ سے ابدالآباد کے لئے مطرود و ملعون ہوگیا۔

حافظ ابن تیمیہ الصارم المسلول ص ۲۶۷ میں فرماتے ہیں:۔

کما ان الردۃ تتجرد عن السب فکذلک تتجرد عن قصد تبدیل الدین وارادۃ التکذیب بالرسالۃ کما تجرد کفر ابلیس عن قصد التکذیب بالربوبیۃ۔

جیسا کہ ارتداد بغیر اس کے بھی ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ یا اُس کے رسول کی شان میں سب وشتم سے پیش آوے اسی طرح بغیر اس کے بھی ارتداد متحقق ہوسکتا ہے کہ آدمی تبدیل مذہب کا یا تکذیب رسول کا قصد کرے جیسا کہ ابلیس لعین کا کفر تکذیب ربوبیت سے خالی ہے۔

الغرض ارتداد صرف اسی کو نہیں کہتے کہ کوئی شخص اپنا مذہب بدل دے یا صاف طور پر خدا اور رسول کا منکر ہوجائے بلکہ ضروریاتِ دین کا انکار کرنا اور قطعی الثبوت والدلالۃ احکام میں سے کسی ایک کا بعد علم انکار کردینا بھی اُسی درجہ کا ارتداد اور کفر ہے۔

تنبیہ ہاں اس جگہ دو باتیں قابلِ خیال ہیں۔ اول تو یہ کہ کفر و ارتداد اُس صورت میں عائد ہوتا ہے جب کہ حکم قطعی کے تسلیم کرنے سے انکار اور گردن کشی کرے اور اُس حکم کے واجب التعمیل ہونے کا عقیدہ نہ رکھے لیکن اگر کوئی شخص حکم کو تو واجب التعمیل سمجھتا ہے مگر غفلت یا شرارت کی وجہ سے اُس پر عمل نہیں کرتا تو اس کو کفر و ارتداد نہ کہا جائے گا اگرچہ ساری عمر میں ایک دفعہ بھی اس حکم پر عمل کرنے کی نوبت نہ آئے بلکہ اس شخص کو مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔ اور پہلی صورت میں کہ کسی حکم قطعی کو واجب التعمیل ہی نہیں جانتا اگرچہ کسی وجہ سے وہ ساری عمر اُس پر عمل بھی کرتا رہے جب بھی کافر مرتد قرار دیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص پانچوں وقت کی نماز کا شدت کے

ساتھ پابند ہے مگر فرض اور واجب التعمیل نہیں جانتا یہ کافر ہے اور دوسرا شخص جو فرض جانتا ہے مگر کبھی نہیں پڑھتا وہ مسلمان ہے اگرچہ فاسق و فاجر اور سخت گناہگار ہے۔

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے احکامِ اسلامیہ کی مختلف قسمیں ہو گئی ہیں۔ تمام اقسام کا اس بارہ میں ایک حکم نہیں۔ کفر و ارتداد صرف اُن احکام کے انکار سے عائد ہوتا ہے جو قطعی الثبوت بھی ہوں اور قطعی الدلالت بھی قطعی الثبوت ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ اُن کا ثبوت قرآن مجید یا ایسی احادیث سے ہو جن کے روایت کرنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر آج تک ہر زمانہ اور ہر قرن میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہوں کہ اُن سب کا جھوٹی بات پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے (اسی کو اصطلاحِ حدیث میں تواتر اور ایسی احادیث کو احادیثِ متواترہ کہتے ہیں)۔

اور قطعی الدلالۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو عبارت قرآن مجید میں اس حکم کے متعلق واقع ہوئی ہے یا حدیثِ متواترہ سے ثابت ہوئی ہے وہ اپنے مفہوم مراد کو صاف صاف ظاہر کرتی ہو اس میں کسی قسم کی اُلجھن نہ ہو کہ جس میں کسی کی تاویل چل سکے۔

پھر اس قسم کے احکام قطعیہ اگر مسلمانوں کے ہر طبقہ خاص و عام میں اس طرح مشہور و معروف ہو جائیں کہ اُن کا حاصل کرنا کسی خاص اہتمام اور تعلیم و تعلّم پر موقوف نہ رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو وراثۃً وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا فرض ہونا چوری، شراب خوری کا گناہ ہونا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیا ہونا وغیرہ تو ایسے احکام قطعیہ کو ضروریاتِ دین کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جو اس درجہ مشہور نہ ہوں وہ صرف قطعیات کہلاتے ہیں ضروریات نہیں۔

اور ضروریات اور قطعیات کے حکم میں یہ فرق ہے کہ ضروریاتِ دین کا انکار باجماعِ اُمت مطلقاً کفر ہے ناواقفیت و جہالت کو اس میں عذر نہ قرار دیا جائے گا اور نہ کسی قسم کی تاویل سُنی جائے گی۔

اور قطعیاتِ محضہ جو شہرت میں اس درجہ کو نہیں پہنچتے تو حنفیہ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی عامی آدمی بوجہ ناواقفیت و جہالت کے اُن کا انکار کر بیٹھے تو بھی اس کے کفر و ارتداد کا حکم نہ کیا جائے گا مگر پہلے اُس کو تبلیغ کی جائے گی کہ یہ حکم اسلام کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت احکام میں سے ہے اس کا انکار کفر ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنے انکار پر قائم رہے تب کفر کا حکم کیا جائے گا۔

کما فی المسایرۃ والمسامرۃ لابن الہمام ولفظہ واما ما ثبت قطعاً ولم یبلغ حد الضرورۃ کاستحقاق بنت الابن السدس مع البنت الصلبیۃ باجماع المسلمین فظاہر کلام الحنفیۃ الاکفار بجحدہ بانہم لم یشترطوا فی الاکفار سوی القطع فی الثبوت (الی قولہ) ویجب حملہ علی ما اذا علم المنکر ثبوتہ قطعاً (مسامرہ ص ۱۴۹)

اور جو حکم قطعی الثبوت تو ہو مگر ضرورت کی حد کو نہ پہنچا ہو جیسے میراث میں: اگر پوتی اور بیٹی حقیقی جمع ہوں تو پوتی کو چھٹا حصہ ملنے کا حکم اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ سو ظاہر کلام حنفیہ کا یہ ہے کہ اس کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم کیا جاوے کیونکہ انہوں نے قطعی الثبوت ہونے کے سوا اور کوئی شرط نہیں لگائی (الی قولہ) مگر واجب ہے کہ حنفیہ کے اس کلام کو اُس صورت پر محمول کیا جاوے کہ جب منکر کو اس کا علم ہو کہ یہ حکم قطعی الثبوت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس طرح کفر و ارتداد کی ایک قسم تبدیلِ مذہب ہے اسی طرح دوسری قسم یہ بھی ہے کہ ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کر دیا جائے یا ضروریاتِ دین میں کوئی ایسی تاویل کی جائے جس سے اُن کے معروف معانی کے خلاف معنی پیدا ہو جائیں اور غرض معروف بدل جائے اور ارتداد کی اِس قسم دوم کا نام قرآن کی اصطلاح میں الحاد ہے۔

قال تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا۔ الآیۃ

جو لوگ ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔

اور حدیث میں اس قسم کے ارتداد کا نام زندقہ رکھا گیا ہے جیسا کہ صاحب مجمع البحار نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

اتی علی بزنادقة هی جمع زندیق (الی قوله) ثم استعمل فی کل ملحد فی الدین والمراد ههنا قوم ارتدوا عن الاسلام۔

(مجمع البحار ص ٦٩٥)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس چند زنادقہ (گرفتار کرکے) لائے گئے۔ زنادقہ جمع زندیق کی ہے اور لفظ زندیق ہر اُس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو دین میں الحاد (یعنی بے جا تاویلات) کرے اور اس جگہ مراد ایک مرتد جماعت ہے۔

اور علمائے کلام اور فقہاء اس خاص قسم ارتداد کا نام باطنیت رکھتے ہیں۔ اور کبھی وہ بھی زندقہ کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

شرح مقاصد میں علامہ تفتازانی اقسامِ کفر کی تفصیل اس طرح نقل فرماتے ہیں۔

"یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ کافر اُس شخص کا نام ہے جو مومن نہ ہو۔ پھر اگر وہ ظاہر میں ایمان کا مدعی ہو تو اُس کو منافق کہیں گے۔ اور اگر مسلمان ہونے کے بعد کفر میں مبتلا ہوا ہے تو اُس کا نام مرتد رکھا جائے گا۔ کیونکہ وہ اسلام سے پھر گیا ہے۔ اور اگر دو یا دو سے زیادہ معبودوں کی پرستش کا قائل ہو تو اُس کو مشرک کہا جائے گا۔ اور اگر ادیانِ منسوخہ یہودیت و عیسائیت وغیرہ میں کسی مذہب کا پابند ہو تو اُس کو کتابی کہیں گے۔ اور اگر عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہو اور تمام واقعات وحوادث کو زمانہ کی طرف منسوب کرتا ہو تو اُس کو دہریہ کہا جائے گا اور اگر وجود باری تعالیٰ ہی کا قائل نہ ہو تو اُس کو معطل کہتے ہیں اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اقرار اور شعار اسلام نماز روزہ وغیرہ کے اظہار کے ساتھ کچھ ایسے عقائد دل رکھتا ہو جو بالاتفاق کفر ہیں تو اُس کو زندیق کہا جاتا ہے۔ (ترجمہ عبارت شرح مقاصد ص ٢٦٨ و ص ٢٦٩ ج ٢)" و مثلہ فی کلیات ابی البقاء ص ٥٥٣ و ص ٥٥٤۔

زندیق کی تعریف میں جو عقائد کفریہ کا دل میں رکھنا ذکر کیا گیا ہے اُس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مثل منافق کے اپنا عقیدہ ظاہر نہیں کرتا بلکہ یہ مراد ہے کہ اپنے عقیدۂ کفریہ کو ملمع کرکے اسلامی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

کما ذکرہ الشامی حیث قال

علامہ شامی نے فرمایا ہے کہ زندیق اپنے کفر پہ ملمع

فان الزندیق یموه کفره و یروج عقیدته الفاسدة و یخرجها فی الصورة الصحیحة و هذا معنی ابطان الکفر فلا ینافی اظهاره الدعوی۔

(شامی باب المرتد ص ۳۵۸ ج ۳)

سازی کرتا ہے اور اپنے عقیدۂ فاسدہ کو رائج کرنا چاہتا ہے اور اُس کو عمدہ صورت میں ظاہر کرتا ہے اور زندیق کی تعریف میں جو یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے کفر کو چھپاتا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ اپنے کفر کو ایسے عنوان اور صورت میں پیش کرتا ہے جس سے لوگ مغالطہ میں پڑ جائیں، اس لئے یہ اخفاء کفر اظہارِ دعویٰ کے منافی نہیں۔

کفر کی اقسام مذکورہ بالا میں سے آخری قسم اس جگہ زیرِ بحث ہے جس کے متعلق شرح مقاصد کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ جس طرح اقسامِ سابقہ کفر کے انواع ہیں اسی طرح یہ صورت بھی اُسی درجہ کا کفر ہے کہ کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن مجید کے احکام کو تسلیم کرنے کے باوجود صرف بعض احکام و عقائد میں اختلاف رکھتا ہو اگرچہ دعوٰی مسلمان ہونے کا کرے اور تمام ارکانِ اسلام پر شدت کے ساتھ عامل بھی ہو۔

ایک شبہ کا جواب

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر جائز نہیں اور کتب فقہ و عقائد میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں نیز بعض احادیث سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہے۔

کما رواه ابوداؤد فی الجهاد عن انس رض قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ثلث من اصل الایمان الکف عمن قال لا اله الا اللّٰه و لا تکفره بذنب و لا تخرجه من الاسلام بعمل الحدیث۔

حضرت انس رض فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی اصل تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ جو شخص کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اس سے تعرض سے باز رہو۔ اور کسی گناہ کی وجہ سے اُس کو کافر مت کہو اور کسی عمل بد کی وجہ سے اُس کو اسلام سے خارج نہ قرار دو۔

اس لئے مسئلہ زیرِ بحث میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جو شخص نماز روزہ کا پابند ہے وہ اہلِ قبلہ میں داخل ہے تو پھر بعض عقائد میں خلاف کرنے یا بعض احکام کے تسلیم نہ کرنے

سے اُس کو کیسے کافر کہا جا سکتا ہے۔ اور اسی شبہ کی بنیاد پر آج کل بہت سے مسلمان قسم ثانی کے مرتدین یعنی ملحدین و زنادقہ کو مرتد و کافر نہیں سمجھتے۔ اور یہ ایک بھاری غلطی ہے جس کا صدمہ براہِ راست اصولِ اسلام پر پڑتا ہے۔ کیونکہ میں اپنے کلامِ سابق میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر قسم دوم کے ارتداد کو ارتداد نہ سمجھا جائے تو پھر شیطان کو بھی کافر نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس شبہ کے منشا کو بیان کر کے اُس کا شافی جواب ذکر کیا جائے۔ اصل اُس کی یہ ہے کہ شرح فقہ اکبر وغیرہ میں امام اعظم ابوحنیفہ رح سے اور حواشی شرح عقائد میں شیخ ابوالحسن اشعری سے اہل سنت والجماعۃ کا یہ مسلک نقل کیا گیا ہے:-

ومن قواعد اهل السنة والجماعة ان لا يكفر واحد من اهل القبلة (كذا فی شرح العقائد النسفية ص ۱۲۰) وفی شرح التحرير ص ۳۱۸ ج ۳ وسياقها عن ابی حنيفة رح و لا نكفر اهل القبلة بذنب انتهى فتقيد ه بالذنب فی عبارة الامام واصله فی حديث ابی داؤد كما مر آنفاً۔

اہل سنت والجماعۃ کے قواعد میں سے ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی شخص کی تکفیر نہ کی جائے (شرح عقائد نسفی) اور شرح تحریر ص ۳۱۸ ج ۳ میں ہے کہ یہ مضمون امام اعظم ابوحنیفہ رح سے منقول ہے کہ ہم اہل قبلہ میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے سو اس میں بذنب کی قید موجود ہے اور غالباً یہ قید حدیث ابوداؤد کی بنا پر لگائی گئی ہے جو ابھی گذر چکی ہے۔

جس کا صحیح مذہب تو یہ ہے کہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر مت کہو خواہ کتنا ہی بڑا گناہ ہو بشرطیکہ کفر و شرک نہ ہو، کیونکہ گناہ سے مراد اس جگہ پر وہی گناہ ہے جو حدِ کفر تک نہ پہنچی ہو۔

كما فی كتاب الايمان لابن تيمية حيث قال و نحن اذا قلنا اهل السنة متفقون على ان لا يكفر بالذنب فانما نريد به المعاصی كالزنا والشر

جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان میں ہے کہ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اہل سنۃ والجماعۃ اس پر متفق ہیں کہ اہلِ قبلہ میں سے کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہیں تو اس جگہ گناہ سے ہماری مراد معاصی

انتھٰی واوضحہ القونوی فی شرح العقیدۃ الطحاویۃ ۔

مثل زنا و شراب خوری وغیرہ ہوتے ہیں اور علامہ قونوی نے عقیدہ طحاوی کی شرح میں اس مضمون کو خوب واضح کر دیا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

ورنہ پھر اس عبارت کے کوئی معنی نہیں رہتے اور لفظ بذنب کے اضافہ کی جیسا کہ فقہ اکبر اور شرح تحریر کے حوالہ سے اوپر نقل ہوا ہے، کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اب شبہات کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ بعض علماء کی عبارتوں میں اختصار کے مواقع میں بذنب کا لفظ بوجہ معروف و مشہور ہونے کے چھوڑ دیا گیا۔ اور مسئلہ کا عنوان عدم تکفیر اہل القبلہ ہو گیا۔ حدیث و فقہ سے ناآشنا اور غرض متکلم سے ناواقف لوگ یہاں سے یہ سمجھ بیٹھے کہ جو شخص قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے اُس کو کافر کہنا جائز نہیں خواہ کتنے ہی عقائد کفریہ رکھتا ہو۔ اور اقوالِ کفریہ بکتا پھرے۔ اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ اگر یہی لفظ پرستی ہے تو اہل قبلہ کے لفظوں سے تو یہ بھی نہیں نکلتا کہ قبلہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھے بلکہ ان لفظوں کا مفہوم تو اس سے زائد نہیں کہ صرف قبلہ کی طرف منہ کرے خواہ نماز بھی پڑھے یا نہ پڑھے۔ اگر یہ معنی مراد لے جائیں تو پھر دنیا میں کوئی شخص کافر ہی نہیں رہ سکتا کیونکہ کبھی نہ کبھی ہر شخص کا منہ قبلہ کی طرف ہو ہی جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ اہل قبلہ کی مراد تمام اوقات و احوال کا استیعاب باستقبال قبلہ نہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ لفظ اہل قبلہ ایک شرعی اصطلاح ہے جس کے معنی اہلِ اسلام کے ہیں اور اسلام وہی ہے جس میں کوئی بات کفر کی نہ ہو۔ لہٰذا یہ لفظ صرف اُن لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو تمام ضروریات دین کو تسلیم کریں۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر بشرط ثبوت ایمان لائیں۔ نہ ہر اُس شخص کے لئے جو قبلہ کی طرف منہ کرلے۔ جیسے دنیا کی موجودہ عدالتوں میں اہل کار کا لفظ صرف اُن لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو باضابطہ ملازم اور قوانین ملازمت کا پابند ہو۔ اُس کے مفہوم لغوی کے موافق ہر کام والے آدمی کو اہل کار نہیں کہا جاتا۔ اور یہ جو کچھ لکھا گیا علم فقہ و عقائد کی کتابیں تقریباً تمام اس پر شاہد ہیں جن میں سے بعض عبارات درج ذیل ہیں :-

حضرت ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:۔

اعلم ان المراد باهل القبلة الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الدين كحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم الله تعالى بالكليات والجزئيات وما اشبه ذلك من المسائل المهمات فمن واظب طول عمره على الطاعات والعبادات مع اعتقاد قدم العالم او نفي الحشر او نفي علمه سبحانه وتعالى بالجزئيات لا يكون من اهل القبلة وان المراد بعدم تكفير احد من اهل القبلة عند اهل السنة انه لا يكفر احد ما لم يوجد شئ من امارات الكفر وعلاماته ولم يصدر عنه شئ من موجباته

تو سب سمجھ لو کہ اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان تمام عقائد پر متفق ہوں جو ضروریات دین میں سے ہیں جیسے حدوث عالم و قیامت میں حشر بدن اور اللہ تعالیٰ کا علم تمام کلیات و جزئیات پر حاوی ہونا اور اسی قسم کے دوسرے عقائد اہمہ پس جو شخص تمام عمر طاعات و عبادات پر مداومت کرے مگر ساتھ ہی عالم کے قدیم ہونے کا معتقد ہو یا قیامت میں مردوں کے زندہ ہونے کا یا حق تعالیٰ کے علم جزئیات کا انکار کرے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور یہ کہ اہل سنت کے نزدیک اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد یہی ہے کہ اُن میں سے کسی شخص کو اُس وقت تک کافر نہ کہیں جب تک اُس سے کوئی ایسی چیز سرزد نہ ہو جو علامات کفر یا موجبات کفر میں سے ہے۔

اور شرح مقاصد مبحث سابع میں مذکور الصدر مضمون کو مفصل بیان کرتے ہوئے کہا ہے:۔

فلا نزاع في كفر اهل القبلة المواظب طول العمر على الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفي الحشر ونفي علمه بالجزئيات ونحو ذلك وكذا بصدور شئ من موجبات الكفر عنه

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے اُس شخص کو کافر کہا جاوے گا جو اگرچہ تمام طاعات و عبادات میں گزارے مگر عالم کے قدیم ہونے کا اعتقاد رکھے یا قیامت و حشر کا یا حق تعالیٰ کے علم جزئیات ہونے کا انکار کرے اسی طرح وہ شخص جس سے کوئی چیز موجبات کفر میں سے صادر ہو جائے۔

اور علامہ شامی نے ردالمحتار باب الامامۃ جلد اول میں بحوالہ تحریر الاصول نقل فرمایا ہے:۔

لا خلاف في كفر المخالف من اهل القبلة

اس میں کسی کا خلاف نہیں کہ اہل قبلہ میں سے جو شخص

اى للضروريات ۱۲

المواظب طول عمرہ علی الطاعات کما فی شرح التحریر (ص ۳۰۰ ج ۱)

ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو وہ کافر ہے اگرچہ تمام عمر طاعات و عبادات میں گزار دے۔

اور شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس ص ۲، ۵ میں ہے۔

اهل القبلة فی اصطلاح المتکلمین من یصدق بضروریات الدین الی قوله فمن انکر شیئًا من الضروریات (الی قوله) لم یکن من اهل القبلة ولو کان مجاهدا بالطاعات وکذلک من باشر شیئًا من امارات التکذیب کسجود الصنم والاهانة بامر شرعی والاستهزاء علیه فلیس من اهل القبلة ومعنی عدم تکفیر اهل القبلة ان لا یکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور الخفیة غیر المشهورة هذا ما حققه المحققون۔

اہل قبلہ متکلمین کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو تمام ضروریاتِ دین کی تصدیق کرے پس جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اگرچہ عبادت و اطاعت میں مجاہدات کرنے والا ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جو علامات کفر و تکذیب میں سے کسی چیز کا مرتکب ہو جیسے بت کو سجدہ کرنا یا کسی امر شرعی کی اہانت و استہزاء کرنا وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہیں اور نہ ایسے امور کے انکار کی وجہ سے کافر کہیں جو اسلام میں مشہور نہیں یعنی ضروریات دین میں سے نہیں۔

تنبیہ

کسی مسلمان کو کافر کہنے کے معاملہ میں آج کل ایک عجیب افراط و تفریط رونما ہے ایک جماعت ہے کہ جس نے مشغلہ ہی اختیار کر لیا ہے کہ ادنیٰ معاملات میں مسلمانوں پر تکفیر کا حکم لگا دیتے ہیں اور جہاں ذرا سی کوئی خلاف شرع حرکت کسی سے دیکھتے ہیں تو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں۔ اور دوسری طرف نو تعلیم یافتہ آزاد خیال جماعت ہے جس کے نزدیک کوئی قول و فعل خواہ کتنا ہی شدید اور عقائد اسلامیہ کا صریح

مقابل ہو کفر کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ ہر مدعی اسلام کو مسلمان کہنا فرض سمجھتے ہیں اگرچہ اوس کا کوئی عقیدہ اور عمل اسلام کے موافق نہ ہو اور ضروریاتِ دین کا انکار کرتا ہو۔ اور جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا ایک سخت پُرخطر معاملہ ہے اسی طرح کافر کو مسلمان کہنا بھی اوس سے کم نہیں کیونکہ حدودِ کفر و اسلام میں التباس بہردو صورت لازم آتا ہے اس لئے علمار اُمت نے ہمیشہ ان دونوں معاملوں میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ امرِ اوّل کے متعلق تو یہاں تک تصریحات ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی کام خلاف شرع صادر ہو جائے اور اوس کلام کی مُراد میں محاورات کے اعتبار سے چند احتمال ہوں اور سب احتمالات میں یہ کلام ایک کلمہ کفر بنتا ہو لیکن صرف ایک احتمال ضعیف ایسا بھی ہو کہ اگر اس کلام کو اس پر حمل کیا جائے تو معنی کفر نہیں رہتے بلکہ عقائدِ حقہ کے مطابق ہو جاتے ہیں تو مفتی پر واجب ہے کہ اسی احتمال ضعیف کو اختیار کر کے اوس کے مسلمان ہونے کا فتویٰ دے جب تک کہ خود وہ متکلم اس کی تصریح نہ کرے کہ میری مُراد یہ معنی نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی ایسے عقیدہ کا قائل ہو جاوے جو ائمہ اسلام میں سے اکثر لوگوں کے نزدیک کفر ہو لیکن بعض ائمہ اوس کے کفر ہونے کے قائل نہ ہوں تو اوس کفر مختلف فیہ سے بھی مسلمان پر کفر کا حکم کرنا جائز نہیں (صرح بہ فی البحر الرائق باب المرتدین جلد ۵) ومثلہ فی رد المحتار وجامع الفصولین من باب کلمات الکفر۔

اور امر دوم کے متعلق بھی صحابہ کرام اور سلف صالحین کے تعامل نے یہ بات متعین کردی کہ اس میں تہاون و تکاسل کرنا اصولِ اسلام کو نقصان پہنچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے تھے اون کا ارتداد قسم دوم ہی کا ارتداد تھی۔ صریح طور پر تبدیل مذہب (عموماً) نہ تھا۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اون پر جہاد کرنے کو اتنا زیادہ اہم سمجھا کہ نزاکت وقت اور اپنے ضعف کا بھی خیال نہ فرمایا۔ اسی طرح مسیلمہ کذاب مدعی نبوت اور اس کے ماننے والوں پر جہاد کیا جس میں جمہور صحابہ شریک تھے جن کے اجماع سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو شخص ختم نبوت کا انکار کرے یا نبوت کا دعویٰ کرے وہ مرتد ہے اگرچہ تمام ارکان اسلام کا پابند اور زاہد و عابد ہو۔

ضابطۂ تکفیر اس لئے تکفیر مسلم کے بارہ میں ضابطہ شرعیہ یہ ہوگیا کہ جب تک کسی شخص کے کلام میں تاویل صحیح کی گنجائش ہو اور اُس کے خلاف کی تصریح متکلم کے کلام میں نہ ہو۔ یا اوس عقیدہ کے کفر ہونے میں ادنیٰ سے ادنیٰ اختلاف ائمہ اجتہادمیں واقع ہو۔ اوس وقت تک اس کے کہنے والے کو کافر نہ کہا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا کوئی ایسی ہی تاویل وتحریف کرے جو اوس کے اجماعی معانی کے خلاف معنی پیدا کردے تو اس شخص کے کفر میں کوئی تامل نہ کیا جائے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تنبیہ ضروری

مسئلہ زیر بحث میں اس بات کا ہر وقت خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ مسئلہ نہایت نازک ہے۔ اس میں بیباکی اور جلد بازی سے کام لینا سخت خطرناک ہے۔ مسئلہ کی دونوں جانب نہایت احتیاط کی مقتضی ہیں کیونکہ جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا وبالِ عظیم ہے اور حسب تصریح حدیث اس کہنے والے کے کفر کا اندیشہ قوی ہے۔ اسی طرح کسی کافر کو مسلمان کہنا یا سمجھنا بھی اس سے کم نہیں جیسا کہ عبارتِ شفاء سے منقول ہے۔ اور شفاء میں مسئلہ کی نزاکت کو بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:۔

ولمثل هذا ذهب ابو المعالی فی اجوبته الی محمد عبد الحق و کان سائله عن المسألة فاعتذر له بان الغلط فیه یصعب لان ادخال کافر فی الملة الاسلامیة او اخراج مسلم عنها عظیم فی الدین (شرح شفا فصل فی تحقیق القول فی اکفار المتأولین ص ۵۰۰ ج ۲)۔	ابو المعالی نے جو محمد عبد الحق کے سوالات کے جواب لکھے ہیں اُن میں ان کا بھی یہی مذہب ثابت ہے کیونکہ ان سے ایسا ہی سوال کیا گیا تھا جس کے جواب میں انہوں نے عذر کردیا کہ اس بارہ میں غلطی سخت مصیبت کی چیز ہے کیونکہ کسی کافر کو مذہب اسلام میں داخل سمجھنا یا مسلمان کو اس سے خارج سمجھنا دین میں بڑے خطرہ کی چیز ہے۔

اسی لئے ایک جانب تو یہ احتیاط ضروری ہے کہ اگر کسی شخص کا کوئی مبہم کلام سامنے آئے جو مختلف وجوہ کو محتمل ہو اور سب وجوہ سے عقیدۂ کفریہ قائل کا ظاہر ہوتا ہو لیکن صرف ایک وجہ ایسی بھی ہو جس سے اصطلاحی معنی اور صحیح مطلب بن سکے۔ گو وہ وجہ ضعیف ہی ہو۔ تو مفتی دفتی کا فرض ہے کہ اس وجہ کو اختیار کر کے اس شخص کو مسلمان کہے (کما صرح بہ فی الشفاء فی ہذہ الصفحۃ ومثلہ صرح فی البحر وجامع الفصولین وغیرہ)۔

اور دوسری طرف یہ لازم ہے کہ جس شخص میں کوئی وجہ کفر کی یقیناً ثابت ہو جاوے اس کی تکفیر میں ہرگز تاخیر نہ کرے اور نہ اس کے متبعین کو کافر کہنے میں دریغ کرے جیسا کہ علماءِ اُمت کی تصریحات محررہ بالا سے بخوبی واضح ہو چکا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

تتمہ مسئلہ از امداد الفتاوی جلد سادس

یہ کل بیان اس صورت میں تھا جب کہ کسی شخص یا جماعت کے متعلق عقیدۂ کفریہ رکھنا یا اقوال کفریہ کا کہنا متیقن طریق سے ثابت ہو جائے لیکن اگر خود اسی میں کسی موقع پر شک ہو جائے کہ یہ شخص اس عقیدہ کا معتقد یا اس قول کا قائل ہے یا نہیں تو اس کے لئے احوط و اسلم وہ طریق ہے جو امداد الفتاوی میں درج ہے جس کو بعینہٖ ذیل میں بطور تتمہ نقل کیا جاتا ہے:

اگر کسی خاص شخص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم با لکفر میں تردد ہو خواہ تردد کے اسباب علماء کا اختلاف ہو خواہ قرائن کا تعارض ہو یا نصوص کا غموض تو اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جاوے نہ اسلام کا حکم اول میں تو خود اس کے معاملات کے اعتبار سے احتیاط ہے اور حکم ثانی میں دوسرے مسلمانوں کے معاملات کے اعتبار سے احتیاط ہے پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا یعنی اس سے نہ عقد مناکحت کی اجازت دیں گے نہ اس کی اقتدار کریں گے نہ اس کا ذبیحہ کھائیں گے اور نہ اس پر سیاست کافرانہ جاری کریں گے۔ اگر تحقیق کی قدرت ہو اس کے عقائد کی تفتیش کریں گے اور اس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے ہی احکام جاری کریں گے اور اگر تحقیق کی قدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے اس کی نظیر وہ حکم ہے

جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے۔

لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم وقولوا آمنا بالله وما انزل الينا الآية رواه البخاري۔

نہ اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب بلکہ یوں کہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس وحی پر جو ہم پر نازل ہوئی الخ

دوسری فقہی نظیر احکام خنثیٰ کے ہیں؛

يؤخذ فيه بالاحوط والاوثق في امور الدين وان لا يحكم بثبوت حكم وقع الشك في ثبوته واذا وقف خلف الامام قام بين صف الرجال والنساء ويصلي بقناع ويجلس في صلاته جلوس المرأة ويكره له في حياته لبس الحلي والحرير وان يخلو به غير محرم من رجل او امرأة او يسافر مع غير محرم من الرجال والاناث ولا يغسله رجل ولا امرأة وييمم بالصعيد ويكفن كما يكفن الجارية وامثاله مما نصه الفقهاء

۱۱ر شعبان سنہ ۵۱ھ

خنثیٰ مشکل کے بارہ میں امور دین میں وہ صورت اختیار کی جاوے جس میں احتیاط ہو اور کسی ایسی چیز کے ثبوت کا اس پر حکم نہ کیا جاوے جس کے ثبوت میں شک ہو اور جب وہ امام کے پیچھے نماز کی صف میں کھڑا ہو تو مردوں اور عورتوں کی صف کے درمیان کھڑا ہو۔ اور عورتوں کی طرح دوپٹہ اوڑھ کر نماز پڑھے اور قعدہ میں اس طرح بیٹھے جیسے عورتیں بیٹھتی ہیں اور اس کے لئے زیور اور ریشمی کپڑا پہننا مکروہ ہے اور یہ بھی مکروہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت غیر محرم اس کے ساتھ خلوت میں بیٹھے یا ایسے مرد یا عورت کے ساتھ سفر کرے جو اس کا محرم نہ ہو اور مرنے کے بعد اس کو نہ کوئی مرد غسل دے نہ عورت بلکہ تیمم کرا دیا جائے اور کفن ایسا دیا جائے جیسا لڑکیوں کو دیا جاتا ہے اور اسی طرح دوسرے احکام جن کو فقہاء نے مفصل لکھا ہے۔

مشورہ

یہ بحث کہ کن امور سے کوئی مسلمان خارج از اسلام ہو جاتا ہے اور حکم تکفیر کے لئے شرعی ضابطہ کیا ہے۔ اور اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کی کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق ایک، جامع مانع بہترین رسالہ رئیس المحدثین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

کا اکفار الملحدین کے نام سے عربی زبان میں شائع ہوچکا ہے۔ جو حضرات ان مسائل کو مکمل دیکھنا چاہتے ہیں اس کی مراجعت کریں۔

سوال دوم

اس عام سوال کے بعد چند فرقوں کے متعلق خاص طور پر سوال کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اوّل فرقہ چکڑالویہ۔ دوم فرقہ مرزائیہ۔ سوم فرقہ رافضیہ۔ ان تینوں فرقوں کے عقائد درج ذیل ہیں۔ ان عقائد کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے ان فرقوں کے متعلق تحریر فرمایا جائے کہ یہ فرقے دائرۂ اسلام میں داخل ہیں یا نہیں؟

فرقہ چکڑالویہ کے عقائد

پنجاب میں ایک فرقہ ہے جو اپنے کو اہلِ قرآن کہتا ہے۔ اس کا بانی عبداللہ چکڑالوی ہے اور اُسی کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ اس فرقہ کے عقائد کا نمونہ خود بانیٔ فرقہ عبداللہ چکڑالوی کی کتاب (برہان الفرقان علیٰ صلوٰۃ القرآن) سے بحوالہ صفحات لکھا جاتا ہے تاکہ علماء کرام اس پر غور فرمائیں کہ یہ فرقہ اور اس کے متبعین مسلمان ہیں یا نہیں وُہ عقائد بعینہٖ اس کے الفاظ میں یہ ہیں:-

منقول از برہان الفرقان علیٰ صلوٰۃ القرآن از عبداللہ چکڑالوی

۱۔ قرآن مجید ہی کی سکھائی نماز پڑھنی فرض ہے اور اُس کے سوا اور کسی طرح کی نماز پڑھنا کفر و شرک ہے ص ۵ سطر ۶

۲۔ سنو کہ وُہ شے محض قرآن مجید ہی ہے جو رسول اللہ کی طرف وحی کی گئی اس کے سوا اور کوئی چیز ہرگز ہرگز خاتم النبیین پر وحی نہیں ہوئی۔ ص ۹ سطر ۳۔

۳۔ آسمانی کتاب کے سوا ہر ایک دینی کام کرنا شرک و کفر ہے خواہ کوئی ہو جو ایسا کرے وہ مشرک ہوجاتا ہے۔ ص ۱۲ سطر ۱۶

۴۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم نے سوائے کتاب اللہ کے بھی احکام بتائے ہیں وہ حقیقت میں خاتم النبیین پرست کرتے ہیں ص ۵ اسطر ۱۲۔

۵۔ سوائے اللہ تعالےٰ اور کا حکم ماننا بھی اعمال صحیح کا باطل کرنے والا باعث ابدی و دائمی عذاب ہے افسوس شرک فی الحکم میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں ص ۶ سطر ۲۱

۶۔ لیکن شرک فی الحکم لوگوں کی طبیعتوں میں ایسا مل گیا ہے کہ اس کو اب وہ ایک دینی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس کے بڑا ہونے کا ان کو خیال تک بھی نہیں آتا بلکہ اس کے بُرا سمجھنے والے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ علماء بڑے زور و شور سے کہتے ہیں اور اس اپنے کہنے پر قرآن شریف سے دلیل پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ کا حکم ماننا فرض ہے اسی طرح رسول اللہ سلام علیہ کا عجب ثم العجب اور اس مشرکانہ خیال کو اصل اصول جانتے ہیں ص ۱۷ اسطر ۲۔

۷۔ پس واضح ہو کہ مطابق الرحمٰن علم القرآن کے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تعلیم دی ہے اور بس دیگر ذریعہ سے تعلیم نہیں دی۔ ص ۱۹ اسطر ۱۵۔

۸۔ اور جس رسول کی فرماں برداری کا حکم ہوا ہے وہ خاص قرآن مجید ہی ہے واجب الاتباع دو چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی شے ہے قرآن مجید اور محمد رسول اللہ سلام علیہ بے شک دو چیزیں ہیں۔ لیکن آپ کی فرماں برداری کا قرآن مجید میں کسی جگہ حکم نہیں ہوا۔ ص ۲۱ سطر ۱۱۔

۹۔ میں محمد رسول اللہ کو دل وجان سے رسول جانتا ہوں مگر جن آیات میں رسول اللہ کی فرماں برداری کا حکم ہوا ہے وہاں رسول اللہ سے مراد فقط قرآن مجید ہی ہے ص ۲۴ سطر ۱۹

۱۰۔ لیکن محمد رسول اللہ بذات اپنے زمانہ کے لوگوں کے ہی پاس آئے تھے آج کل کے لوگوں میں سے آپ کسی کے پاس نہیں آئے اگر کسی صاحب کے پاس آپ کی آمد و رفت ہو تو بتا دیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ اس جگہ رسول اللہ سے مراد آپ کی ذات نہیں ہو سکتی ورنہ معنی غلط ہو جاتے ہیں، لہٰذا رسول اللہ سے مراد اس جگہ پر قرآن مجید ہی ہے۔ ص ۳۰ سطر ۱۔

۱۱۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ واضح ہو کہ پیروی اور اتباع سے صرف یہ مراد ہے کہ جس طرح قرآن مجید پر میں عمل کرتا ہوں اسی طرح تم بھی عمل کرو کسی مومن یا رسول کا ہر ایک فعل واجب الاتباع نہیں ص ۴۲ سطر ا۔

۱۲۔ واضح ہو کہ کتاب اللہ میں جنبی کو صرف نماز سے روکا گیا ہے جیسے کہ آیت وَلَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ سے ثابت ہے لیکن قرآن مجید پڑھنے سے کہیں نہیں روکا گیا ص ۵۸ سطر ۱۰۔

۱۳۔ مسواک کے بیان کے ذیل میں لکھتا ہے کہ اگر بالفرض رسول اللہ سلام علیہ نے یہ باتیں کہی بھی ہیں تو وحی خفی سے نہیں کہیں بلکہ عقل انسانی سے ص ۶۰ سطر ۱۴۔

۱۴۔ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلٰى آخر الآية۔
مطابق آیت بالا یقیناً پاؤں کا دھونا بھی فرض ہے مسح جائز نہیں خواہ ننگے پاؤں پر ہو خواہ جرابوں پر یا موزوں پر جس قدر ایسی احادیث ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ سلام علیہ نے موزوں اور جرابوں پر مسح کیا اور دوسروں کو ایسا کرنے کی اجازت دی، سب باطل اور رسول اللہ پر افتراء ہیں۔ ص ۷۴ سطر ا۔

۱۵۔ قرآن سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ شرمگاہ کو ہاتھ لگنے اور نکسیر پھوٹنے آگ کی پکی ہوئی چیزیں یا اونٹ کا گوشت کھانے یا قے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے جن احادیث میں یہ مضمون ہے کہ یہ چیزیں وضو کو توڑنے والی ہیں وہ بیہودہ اور مردود ہیں۔
ص ۸۲ سطر ا۔

عقائد فرقہ ہذا مندرجہ الصلوٰۃ لعبد

عقائد فاسدہ	دلائل کاسدہ
(۱) آسمانی کتابوں میں کوئی فرق نہیں سب ہم رتبہ و ہم پایہ ہیں۔	(۱) جس چیز کا نیچ ازل سے جاری ہو ابد تک رہے گا بدلنے کا امکان نہیں ہے

عقائد فاسدہ	دلائل کاسدہ
	ایسی ہی کتابیں ایک خدا کی ہیں سب یکساں ہوں گی لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ
(۲) نبیوں میں فرق نہیں ہے سب ایک درجہ کے ہیں اور سلسلہ نبوت تاقیامت جاری رہے گا۔	(۲) لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔
(۳) اوقاتِ نماز چار ہیں۔ تہجد، فجر، مغرب، ظہر۔	(۳) تہجد کا وقت نفل کے لیے باقی کا فرض کے لیے ہے دلیل یہ ہے رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ الخ
(۴) قبلہ پورب اور پچھم دو طرف ہے تہجد و فجر مشرق جانب اور ظہر و مغرب پچھم جانب ہیں۔	(۴) دلیل رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ہے (غرض جب آفتاب پورب کی سمت میں ہو تو پورب کرے جیسے تہجد و فجر میں اور جب پچھم ہو تو پچھم کی جانب جیسے ظہر و مغرب میں۔
(۵) تکبیر نماز اللہ اکبر نہیں ہے، بلکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔	(۵) سلیمان علیہ السلام کا قصہ اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ موجود ہے۔
(۶) ارکان چودہ ہیں جو داخل نماز ہیں اور وہ یہ نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں۔	(۶) اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ کوثر سے مراد سبع مثانی۔ سبع مثانی سے مراد چودہ اور چودہ سے مراد ارکان قرآن میں ذکر نہیں ہے بلکہ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ آیا ہے۔
(۷) یہ اذان ممنوع ہے آثار آسمانی سے نمازی آوے گا۔	
(۸) وضو کا لفظ خود ساختہ اور غلط ہے اصل لفظ غسل سکر ہے۔	(۸) فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ
(۹) وضو میں صرف ہاتھ منہ دھونا ہے اور سر پیر کا مسح کرنا ہے بس۔	
(۱۰) جب سے زمانہ نے رنگ بدلا اور میرے جانشین بنے تو اصلی نماز کی صورت بگاڑ دی اور ستر کا نہ دفیں شامل کر	

عقائد فاسدہ	دلائل فاسدہ
دی ہیں۔	اِلَی الْمَرَافِقِ۔
(۱۱) رکعت کا لفظ قصر (قصر) تعریف ہو کر بنتا ہے اصل قصر اولیٰ قصر اخری ہے رکعت اولیٰ رکعت اخری نہیں ہے۔	
(۱۲) صلوٰۃ جنازہ میں ہاتھ نہ باندھے	(۱۲) وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ دلیل ہے۔
(۱۳) رمضان شریف کا مہینہ ۳۰ تیس دن کا ہے۔	(۱۳) وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً دلیل ہے۔
(۱۴) شہر رمضان سے شمسی مہینہ مراد ہے۔	
(۱۵) صورت نماز اہل قرآن یہ ہے کہ اپنی تکبیر کہتا ہوا بصورت قعدہ بیٹھ جاوے پھر تکبیر کے ساتھ کھڑا ہو پھر بایاں ہاتھ دائیں بغل میں دباوے اور دایاں ہاتھ بائیں شانے پر رکھے پھر رکوع کرے پھر سجدہ میں ٹھوڑی رکھے پھر سر۔ پھر جلسہ میں آدے اور سینہ میں ہاتھ رکھے پھر سجدہ کرے وغیرہ وغیرہ	(۱۴) ورنہ آیت بالا کے معنیٰ درست نہ ہوں گے۔

الجواب

۱۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران: ۳۲)

(۲) قال اللہ تبارک و تعالیٰ:۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (نساء: ۶۴)

(۳) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ الآیۃ

(سورہ نساء: ۵۹)

(۴) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۔ (سورہ تغابن: ۱۲)

(۵) مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔ (الاحزاب: ۳۶)

(۶) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔

(نساء: ۶۵)

(۷) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(سورہ آل عمران: ۳۰)

(۸) وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔

(سورہ حشر: ۷)

(۹) هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سورہ جمعہ: ۲)

(۱۰) وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (سورہ نحل: ۴۴)

(۱۱) وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ٥ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۔

(سورۂ نساء: ۷۹، ۸۰)

(۱۲) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔

(سورۂ احزاب: ۲۱)

(۱۳) وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ٥ (سورۂ نساء: ۱۱۵)

(۱۴) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ٥ (الاعراف: ۱۵۸)

(۱۵) فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (سورۂ نور: ۶۳)

(۱۶) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (سورۂ نساء: ۶۱)

آیاتِ مذکورۂ بالا و نیز دیگر آیاتِ کثیرہ سے نہایت صراحت اور وضاحت کے ساتھ دو امر ثابت ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو جس طرح احکامِ قرآنیہ کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے جیسا کہ آیت ۱ تا آیت ۸ سے ثابت ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ آپ قرآن مجید کے صحیح مطلب و صحیح تفسیر بیان فرمادیں جیسا کہ آیت ۹ و ۱۰ سے ثابت ہے۔

اسی لئے جب کسی آیت کے متعلق آپ سے کوئی تفسیر منقول ہو تو اس کے

مخالف کوئی دوسری تفسیر ہرگز قابلِ التفات نہ ہوگی۔ اگرچہ الفاظِ قرآن میں باعتبار لغت کے اُس کا احتمال بھی موجود ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے آج تک تمام اُمتِ محمدیہ کا یہی اعتقاد رہا ہے۔ اور اگر کسی نے کبھی اس کے خلاف عقیدہ ظاہر کیا ہے تو اُس کو باتفاق مسلمین کافر و مرتد سمجھا گیا اور اُس کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو کفار و مرتدین کے ساتھ شریعت میں معمول ہے۔

ایسی ہی تفسیر کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْۤ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ (حٰمٓ سجدہ ۵، ۴۰)

ابن عباس رضؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

هو یضع الکلام علی غیر موضعہ	الحاد کرنے والا وہ شخص ہے جو کلام کو بے
اخرجہ ابن ابی حاتم	محل استعمال کرے۔
(کذا فی الاتقان ص ۱۹۱ ج ۲)	

اور تفسیر روح المعانی میں ہے۔

ینحرفون فی تأویل اٰیات القراٰن	وہ آیات کی تفسیر میں صحت و استقامت سے
عن جهة الصحة والاستقامة	علٰحدہ ہوتے ہیں اور اُن کو معانی باطلہ پر محمول
بحملونها علی المحامل الباطلة	کرتے ہیں اور یہی مراد حضرت ابن عباس کی ہے
وهو مراد ابن عباس بقوله یضعون	اس ارشاد سے کہ وہ لوگ کلام کو بے محل ستعمل
الکلام فی غیر موضعه انتهی (ثم	کرتے ہیں (اس کے بعد حق تعالیٰ کے ارشاد افمن
قال فی تفسیر قوله تعالیٰ) اَفَمَنْ	یلقٰی فی النار الآیہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ
یُّلْقٰی فِی النَّارِ الاٰیة تنبیه علی	یہ اس پر تنبیہ ہے کہ کفار ملحدین کی سزا کیسی ہو
کیفیة الجزاء۔ (ثم قال فی قوله)	گی (پھر اعملوا ما شئتم کی تفسیر میں

اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ تہدید شدید مکفرۃ الملحدین الذین یلقون فی النار	فرماتے ہیں کہ یہ تہدید شدید ہے کفار ملحدین کے لئے جو جہنم میں ڈالے جائیں گے ۔

(روح ص ۱۱۲ و ۱۱۳ ج ۲۴)

عقائد نسفی میں ہے :-

النصوص علی ظاهرها و العدول عنها الی معان یدعیها اهل الباطل الحاد ۔	نصوص اپنے ظاہری معانی پر محمول ہیں اور اُن معانی سے ایسے معانی کی طرف عدول کرنا جن کا اہل باطل دعویٰ کرتے ہیں الحاد ہے ۔

اور علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص آیت کریمہ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗ کے الفاظ کو تحلیل کر کے مَنۡ ذَلَّ ذِیۡ قرار دے کر یہ تفسیر کرتا تھا کہ جو شخص اپنے نفس کو ذلیل کرے وہ اللہ کے نزدیک شفاعت کر سکتا ہے ۔

شیخ الاسلام سراج الدین بلقینیؒ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو یہ فتویٰ دیا کہ وہ ملحد زندیق ہے (اتقان مصری ص ۱۹۱ ج ۲ فصل ما یحتاج الیہ المفسر) ۔

اور قرآن شریف میں ہے :

لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ	اے پیغمبر آپ قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کر دینا اور اس کا پڑھوا دینا تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے پھر اس کا بیان کر دینا ہمارے ذمہ ہے ۔

غرض آیات و عبارات مذکورہ سے واضح ہوا کہ جو شخص وہ عقائد رکھے جو فرقہ چکڑالویہ کی کتابوں سے سوال میں نقل کئے گئے ہیں وہ بلا شبہ ملحد و زندیق اور کافر خارج از اسلام ہے کیونکہ وہ بہت سی ضروریات دین کا منکر ہے ۔ جیسا کہ عقائد مذکورہ کے دیکھنے والے پر مخفی نہیں رہ سکتا عقائد مذکورہ کا ضروریات دین کے خلاف ہونا چونکہ بالکل بدیہی اور آفتاب کی طرح روشن ہے اس لئے ضرورت نہیں کہ ہر عقیدے کے متعلق جدا جدا کچھ لکھا جاوے ۔

علاوہ ازیں اس وقت ہجوم مشاغل کے سبب فرصت بھی نہیں ۔ انشاء اللہ اگر فرصت ہوئی تو کسی

دوسرے صاحب نے ہمت کی اور اس کی تفصیل لکھ دی تو ان شاء اللہ تعالیٰ اُس کو اس رسالہ کا ضمیمہ بنا دیا جاوے گا۔

فرقہ مرزائیہ کے عقائد

مرزا غلام احمد ساکن قادیان ضلع گورداسپور پنجاب اس فرقہ کا بانی ہے اور اس وقت اس فرقہ کی تین پارٹیاں مشہور ہیں ایک ظہیر الدین اروپی کی متبع اور دوسری مرزا محمود کی متبع جس کو قادیانی پارٹی کہا جاتا ہے تیسرے مسٹر محمد علی لاہوری کی متبع جس کو لاہوری پارٹی کہا جاتا ہے

پہلی پارٹی مرزا غلام احمد کے مذہب کو بغیر کسی نفاق و تاویل کے ظاہر کرتی ہے اور اس کو اُن کی تعلیم کے مطابق نبی اور رسول مستقل ناسخ شریعت مانتی ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو معاذ اللہ منسوخ کہتی ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت میں مرزا کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

دوسری پارٹی خواہ اپنی چالاکی کی وجہ سے کہ مسلمان ایسے شدید کفر سے فوراً متنفر ہو جائیں گے۔ یا اپنی کم فہمی کی وجہ سے مرزا کی تصریحات کے خلاف اُس کو صاحب شریعت ناسخ تو نہیں مانتی، لیکن نبی اور رسول ہونے کا بلکہ دوسرے انبیاء سے افضل ہونے کا اعتقاد رکھتی اور ظاہر کرتی ہے۔

تیسری پارٹی اُس کو مسیح موعود اور مہدی و امام کہتی ہے۔ نبی اور رسول کا لفظ بھی اس کے لئے استعمال کرتی ہے مگر یہ کہہ کر کہ لغوی اور مجازی اُمتی نبی ہیں ایسے نہیں جیسے پہلے انبیاء گزرے ہیں۔

ان تینوں پارٹیوں کے عقائد مفصل حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب دام مجدہم نے اپنے رسالہ "اشد العذاب" میں اُن کی کتابوں سے بقید صفحات نقل کئے ہیں جن میں سے بعض نمونہ اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

اروپی مرزائی کے عقائد | رسالہ المبارک ص ۳ میں اروپی کہتا ہے۔ اپنے عقائد کا خلاصہ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوئے

حسن طور پر یہ بیان کرنا ہوگا کہ لا الہ الا اللہ احمد جری اللہ۔ اور اسی کتاب کے صفحہ مذکور پر ہے۔ قرآن کریم کو سچے دل سے منجانب اللہ یقین کرتے ہوئے اس تازہ وحی الٰہی پر یقین لانا مقدم سمجھنا ہوگا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلاۃ والسلام پر نازل ہوئی۔

پھر اسی صفحہ میں لکھتا ہے اور خدا کی عبادت کرتے وقت مسجد اقصیٰ اور مسیح موعود کے مقام قادیان کی طرف منہ کرنے کو ترجیح دینی ہوگی۔ پھر رسالہ "تبدیل قانون ص ۲۰۲ میں مفصل تحریر کے ذیل میں لکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے لئے وہ شریعت نہیں رہی جو آج سے تیرہ سو برس پہلے تھی۔ دیکھو حضرت مسیح موعود کیسی وضاحت سے لکھتے ہیں الخ

قادیانی پارٹی کے عقائد

مرزا محمود خلیفہ قادیان اپنی کتاب حقیقۃ النبوۃ ص ۱۴۷ میں لکھتے ہیں "پس شریعت اسلام نبی کے جو معنی کرتی ہے اس کے معنی سے حضرت صاحب ہرگز مجازی نبی نہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔

اور اخبار الفضل جلد دوم ۱۲۲ و ۱۲۳ مورخہ ۱۴ و ۶ اپریل ۱۹۱۵ء میں ہے حکم کیا ہے حضرت مسیح موعود نبی ہیں یہ بلحاظ نفس نبوت یقیناً ایسے ایسے ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم حکم کیا ہے۔ نبی کا منکر اُولٰئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا کے فتوے کے نیچے داخل ہے (اشد العذاب ص ۵۴ بحوالہ رسالہ موجودہ قادیانی مذہب)

اور رسالہ موجودہ قادیانی مذہب ص ۳ میں بحوالہ تشحیذ الاذہان جلد ۲ نمبر ۱۴ لکھا ہے قرآن شریف میں انبیاء کے منکرین کو کافر کہا گیا ہے۔ اور ہم لوگ حضرت مسیح موعود کو نبی اللہ مانتے ہیں اس سے ہم آپ کے منکروں کو کافر کہتے ہیں۔

لاہوری پارٹی کے عقائد

اشد العذاب ص ۷۵ میں بحوالہ پیغام صلح ۲ ص اقبل سن کے کہ جناب میاں صاحب اللہ اُن کے مریدین کے عقائد کو خلاف عقائد حضرت مسیح موعود دکھایا جاوے یہ بتادینا ضرور ہے کہ ہم حضرت مسیح موعود کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپ امام الزمان مجدد ملہم من اللہ جزوی ظلی بروزی مجازی اُمتی نبی بمعنی محدث نہ بمعنی نبی مہدی و مسیح موعود ہیں۔

یہ تو وہ عقیدہ ہے جو لاہوری پارٹی مرزا کے متعلق رکھتی ہے اس کے علاوہ خود اس

کے رئیس مسٹر محمد علی صاحب نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں بہت سی آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تحریف کی ہے جن میں سے ہر ایک مستقل وجہ کفر معلوم ہوتی ہے۔ ان عقائد پر غور کرتے ہوئے ہر ایک پارٹی کے متعلق جُداجُدا تحریر فرمایا جاوے کہ یہ پارٹیاں خارج از اسلام ہیں یا ان میں کوئی تفصیل ہے؟

الجواب

ان تینوں پارٹیوں میں چند وجوہ کفر مشترک ہیں اور بعض وجوہ خاص خاص پارٹیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس جگہ مشترک وجوہ میں سے چند وجوہ پر اکتفا کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) مرزا کو باوجود ایسے صاف دعویٰ نبوت کے جس میں کسی تاویل کی ہرگز گنجائش نہیں مسلمان بلکہ مہدی و مسیح سمجھنا۔

(۲) ختم نبوت کے مسئلہ میں جو کہ ضروریاتِ دین میں سے ہے تاویل فاسد کرنا اور اس کے اجماعی مفہوم کو بدلنا۔

(۳) مرزا کو باوجود کھلی ہوئی توہین انبیاء کے مسلمان سمجھنا یہ وجوہ کفر ایسی ہیں جو تینوں پارٹیوں میں مشترک ہیں اور ان کے کفر کے لئے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری بہت سی وجوہ اور بھی ہیں جن کے استیعاب کی اس جگہ ضرورت نہیں اور وجوہ مذکورہ بالا کے کفر ہونے کا ثبوت تمام کتب مذہب میں موجود ہے جن میں سے چند عبارات اس جگہ نقل کی جاتی ہیں۔

علامہ خفاجی شرح شفاء میں فرماتے ہیں:-

وکذلک ابن القاسم فی من تنبأ و زعم انہ یوحی الیہ و قالہ سحنون و قال ابن القاسم فیمن تنبأ انہ کالمرتد سواء کان دعا ذلک الی متابعۃ نبوتہ سرا اوجھرا	ابن قاسم اس شخص کے متعلق کہتے ہیں جو نبوت کا دعویٰ کرے کہ وہ شل مرتد کے ہے خواہ اپنی نبوت کی طرف وہ لوگوں کو سراً دعوت دے یا جہراً جیسے مسیلمہ کذاب لعنہ اللہ تعالےٰ اور اصبغ بن فرح فرماتے ہیں کہ وہ یعنی وہ شخص جو

كمسيلمة لعنه الله وقال اصبغ بن الفرج هو اي من زعم انه نبي يوحى اليه كالمرتد في احكامه لانه قد كفر بكتاب الله لانه كذبه صلى الله عليه وسلم في قوله انه خاتم النبيين ولا نبي بعده مع الفرية على الله .

کہے کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے تمام احکام میں مثل مرتد کے ہے اس لئے کہ وہ کتاب اللہ کا منکر ہے۔ کیونکہ اُس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکم میں تکذیب کی کہ آپ خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر افترا بھی کرتا ہے (کیونکہ اُس نے اس کو نبی صاحب وحی نہیں بنایا یہ محض افترا کرتا ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے)۔

ابن حبان فرماتے ہیں۔

من ذهب الى ان النبوة مكتسبة لا تنقطع او الى ان الولي افضل من النبي فهو زنديق يجب قتله

(زرقانی ص ۱۸۸ ج ۶)

جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ نبوت کسب و عمل سے حاصل ہو سکتی ہے اور کبھی منقطع نہ ہوگی یا یہ کہ نبی سے ولی افضل ہے وہ زندیق ہے اُس کا قتل واجب ہے۔

اور شفاء قاضی عیاض میں ہے۔

وقد قتل عبد الملك ابن مروان الحارث المتنبئ وصلبه وفعل ذلك غير واحد من الخلفاء والملوك باشباههم واجمع علماء وقتهم على صواب فعلهم والمخالف في ذلك من كفرهم كافر۔

(از اکفار ص ۴۳)

عبد الملک ابن مروان نے حارث مدعی نبوت کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا اور یہی معاملہ بہت سے خلفاء اور شاہانِ اسلام نے مدعیانِ نبوت کے ساتھ کیا ہے اور ہر زمانہ کے علماء نے اس پر اجماع و اتفاق کیا کہ ان خلفاء اور ملوک کا فعل درست ہے اور جو شخص ان مدعیانِ نبوت کے کفر میں اختلاف کرے وہ بھی کافر ہے۔

اور شرح شفاء میں ہے :-

وكذلك نكفر من ادعى نبوة احد مع نبينا صلى الله عليه وسلم اى في زمنه كمسيلمة الكذاب و

اسی طرح ہم اُس شخص کو بھی کافر سمجھتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی کو نبی مانے یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں کسی

والاسود العنسی او ادعی نبوة احد بعده فانه خاتم النبیین بنص القرآن والحدیث فهذا تکذیب الله ورسوله صلی الله علیه وسلم کالعیسویة۔
(شرح شفاء)

کو نبی تسلیم کرے جیسے مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی یا آپ کے بعد کسی شخص کی نبوت کا قائل ہو اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنص قرآن وحدیث خاتم النبیین ہیں تو آپ کے ساتھ یا آپ کے بعد کسی کو نبی قرار دینا، اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کی تکذیب ہے جیسے عیسویہ کہتے ہیں۔

اور صبح الاعشیٰ ص ۳۰۵ میں ہے:-

وهاتان المسئلتان من جملة ما کفروا به بتجویز النبوة بعد النبی صلی الله علیه وسلم الذی اخبر تعالیٰ انه خاتم النبیین۔

اور یہ دونوں مسئلے اُن مسائل میں سے ہیں جن کی وجہ سے اُن لوگوں کی تکفیر کی گئی ہے کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت جاری رہنے کو جائز قرار دیا۔ جن کے متعلق حق تعالےٰ نے خبر دی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری ص ۲۶۳ ج ۲ میں ہے:-

اذا لم یعرف ان محمدا صلی الله علیه وسلم اخر الانبیاء فلیس بمسلم ولو قال انا رسول الله او قال بالفارسیة من پیغمبرم یرید به من پیغام می برم یکفر۔
(فتاویٰ عالمگیری)

جو کوئی شخص یہ اعتقاد نہ رکھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخر الانبیاء ہیں وہ مسلمان نہیں ہے اور اگر یہ کہے کہ میں رسول ہوں اگرچہ اُس کی مراد حقیقی رسول و پیغمبر نہ ہو، بلکہ پیغام رساں مراد ہو جب بھی وہ کافر ہے (کیونکہ یہ تاویل بے معنی اور الحاد کا دروازہ کھولنے والی ہے)۔

علامہ ابن حجر مکی شافعی اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:-

من اعتقد وحیا بعد محمد صلی الله علیه وسلم کفر باجماع المسلمین۔

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئی وحی کا اعتقاد کرے وہ باجماع مسلمین کافر ہے۔

اشباہ والنظائر کتاب السیر والردۃ میں لکھتے ہیں :۔

اذا لم یعرف ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم آخر الانبیاء فلیس بمسلم لانہ من الضروریات

جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر الانبیاء نہ سمجھے وہ مسلمان نہیں اس لئے کہ یہ مسئلہ ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

(اشباہ ص ۲۹۶)

۞ ۞ ۞

اور ملا علی قاری شرح شمائل میں مہر نبوت کے متعلق فرماتے ہیں :۔

واضافتہ الی النبوۃ لانہ ختم بہ بیت النبوۃ حتی لا یدخل بعدہ احد۔

خاتم النبوت میں خاتم کی اضافت نبوت کی طرف اس لئے کی گئی کہ اس نے بیت نبوت پر مہر لگا دی کہ اس کے بعد اس میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا

اور نیز علامہ موصوف شرح فقہ اکبر ص ۱۹۱ میں فرماتے ہیں :۔

ودعوی النبوۃ بعد نبینا صلی اللہ علیہ وسلم کفر بالاجماع

اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا باجماع مسلمین کفر ہے۔

(مطبوعہ گلزار محمدی لاہور)

۞ ۞ ۞

اور علامہ سید محمود آلوسی مفتی بغداد نے اپنی تفسیر روح المعانی میں اس مسئلہ کو نہایت مکمل لکھا ہے جس کے چند جملے یہ ہیں :۔

وکونہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین مما نطقت بہ الکتاب وصدعت بہ السنۃ واجمعت علیہ الامۃ فیکفر مدعی خلافہ ویقتل ان اصر۔

(روح المعانی ص ۶۵ ج ۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا ان چیزوں میں سے ہے جن پر قرآن مجید نے تصریح فرمائی اور احادیث نبویہ نے ان کو واضح کر دیا۔ پس جو شخص اس کے خلاف کا مدعی ہو اس کو کافر کہا جاوے گا اور اگر اس پر اصرار کرے گا تو قتل کیا جائے گا

اور تحفہ شرح منہاج میں لکھا ہے :۔

وکذب رسولا او نبیا او

یا کسی رسول و نبی کی تکذیب کرے یا

نقصه بأي منقص كان صغر اسمه مريدا تحقيره او جوز نبوة احد بعد وجود نبوة نبينا صلى الله عليه وسلم وعيسى عليه السلام نبي قبل فلا يرد۔
(از اکفار ص ۲۴)

طرح تنقیص شان کرے خواہ اس طرح پر کہ ان کے نام کی تصغیر بقصد تحقیر کرے یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد کسی دوسرے شخص کے لئے نبوت کو جائز رکھے (وہ کافر ہے) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اس سے ختم نبوت پر شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبی ہو چکے ہیں۔

۞ ۞ ۞

اور ص ۲۴۹ جلد ۲ میں فرماتے ہیں:۔

وكذلك من قال (الى قوله) او ان بعد محمد صلى الله عليه وسلم نبيا غير عيسىٰ بن مريم عليه السلام فانه لا يختلف اثنان في تكفيره لصحة قيام الحجة بكل

ایسے ہی وہ شخص بھی کافر ہے جو یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بجز عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی اور نبی ہے کیونکہ یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ اس میں دو آدمی بھی اختلاف نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ اس پر حجت قائم ہے۔

اور شیخ ابو شکور سالمی رح تمہید میں تحریر فرماتے ہیں:۔

وقالت الروافض ان العالم لا يكون خاليا من النبي قط وهذا كفر لان الله تعالى قال وخاتم النبيين ومن ادعى النبوة في زماننا فانه يصير كافرا ومن طلب منه المعجزات فانه يصير كافرا لانه شك في النص فيجب الاعتقاد بانه ما شركة لاحد في النبوة لمحمد صلى الله عليه وسلم

روافض کہتے ہیں کہ عالم کسی وقت ہرگز نبی سے خالی نہیں رہ سکتا اور یہ کفر ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے (وخاتم النبیین) اور جو شخص ہمارے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کرے وہ کافر ہو جاتا ہے اور جو شخص اس سے (بنظر اعتقاد) معجزات طلب کرے وہ بھی کافر ہے کیونکہ اس نے نص قرآنی میں شک کیا۔ پس واجب ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جاوے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت میں کسی کی شرکت نہیں ہے۔ بخلاف روافض کے جو کہتے ہیں

بخلاف ما قاله الروافض ان علیا کان شریکاً لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم فی النبوۃ وھذا منھم کفر۔

کہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت میں شریک تھے۔ اور یہ اُن کا (کھلا ہوا) کفر ہے۔

اور امام غزالی اپنی کتاب اقتصاد میں فرماتے ہیں:۔

ان الامۃ فھمت من ھذا اللفظ انہ افھم عدم نبی بعدہ ابدا وعدم رسول بعدہ ابدا وانہ لیس فیہ تاویل ولا تخصیص فکلامہ من انواع الھذیان لا یمنع الحکم بتکفیرہ لانہ مکذب لھذا النص الذی اجمعت الامۃ علی انہ غیر ماول ولا مخصوص۔

تمام امت محمدیہ نے اس لفظ (یعنی خاتم النبیین) سے یہی سمجھا ہے کہ اس نے یہ تبلایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک نہ کوئی نبی ہوگا نہ رسول۔ اور یہ کہ نہ اُس میں کوئی تاویل ہے نہ تخصیص اور جو شخص اُس میں کسی قسم کی تخصیص و تاویل کرے اُس کا کلام مجنونانہ ہذیان (بڑ) ہے اور یہ تاویل اُس پر حکم کفر کرنے سے مانع نہیں ہے کیونکہ وہ اس نص قرآنی کی تکذیب کرنے والا ہے جس کے متعلق اُمت کا اجماع ہے کہ وہ نہ مؤول ہے نہ مخصوص۔

⁘ ⁘ ⁘

اور حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں:۔

ادعت ایضا ان علیا نبی (الی قولہ) ای الروافض ۱۲ لعنھم اللہ والملائکۃ وسائر خلقہ الی یوم الدین وقلع اباد خضرائھم ولا جعل منھم فی الارض دیارا فانھم بالغوا فی غلوھم ومردوا علی الکفر وترکوا الاسلام وفارقوا الایمان وجحدوا الا الہ الا اللہ والرسل والتنزیل

روافض نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علیؓ نبی ہیں۔ لعنت کرے اللہ تعالےٰ اور اس کے فرشتے اور تمام مخلوق اُن پر قیامت تک، اور برباد کرے اُن کی کھیتیوں کو اور نہ چھوڑے ان میں سے کوئی گھر میں بسنے والا۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے غلو میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور کفر میں جم گئے۔ اور اسلام و ایمان کو چھوڑا اور انبیاء اور قرآن کا انکار کیا۔ پس ہم اللہ تعالےٰ

فنعوذ باللہ من ذھب الی ھذہ المقالۃ

سے پناہ مانگتے ہیں اُس شخص سے جس نے یہ قول اختیار کیا۔

اور علامہ عارف باللہ شیخ عبد الغنی نابلسیؒ شرح فرائد میں روافض کی تکفیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فساد مذھبھم غنی عن البیان لشھادۃ العیان کیف و ھو یؤدی الی تجویز نبی مع نبینا صلی اللہ علیہ وسلم او بعدہ و ذلک یستلزم تکذیب القرآن اذ قد نص علی انہ خاتم النبیین و آخر المرسلین و فی السنۃ العاقب لا نبی بعدی واجمعت الامۃ علی ابقاء ھذا الکلام علی ظاھرہ وھذا احد المسائل المشھورۃ التی کفرنا بھا الفلاسفۃ لعنھم اللہ تعالی (از اکفار ص ۴۲)

اُن کے مذہب کا فساد محتاج بیان نہیں بلکہ مشاہد ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا بعد بھی کوئی نبی پیدا ہو سکتا ہے اور اس سے قرآن کی تکذیب لازم آتی ہے اس لئے کہ اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ خاتم النبیین اور آخر المرسلین ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ میں عاقب ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں اور امت کا اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر پر بغیر کسی تاویل و تخصیص کے رکھا جائے اور یہ بھی اُنھیں مسائل میں سے ہے جن کی وجہ سے ہم نے فلاسفہ ملاعنہ کی تکفیر کی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ مرزا کو باوجود ان خیالات وعقائد باطلہ کفریہ کے جو باجماع امت کفر ہیں اور جن سے مرزائی کتابیں لبریز ہیں نہ صرف مسلمان بلکہ مسیح موعود مہدی موعود۔ محدث وغیرہ مانتے ہیں جس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ (معاذ اللہ) تمام اسلاف اُمت صحابہ و تابعین اور ائمہ اجتہاد اور ساڑھے تیرہ سو برس تک کے تمام علماء گمراہی وضلالت میں تھے کہ وہ جن اقوال وافعال کو باجماع کفر وضلال کہتے ہیں وہ بجائے کفر وضلالت کے ہدایت مجسمہ اور مسیحیت موعودہ ہے۔ اور کوئی ایسا عقیدہ رکھنا جس سے تمام اُمت کو گمراہی پر قرار دینا لازم آئے باتفاق کفر ہے۔

شفا، قاضی عیاض اور اس کی شرح ملا علی قاری میں ہے۔

وکذلک نقطع بتکفیر کل قائل قال قولا یتوصل بہ الی تضلیل الامۃ المرحومۃ وتکفیر جمیع الصحابۃ (شرح شفا للقاری ص ۵۲۱ ج ۲)

اور ایسے ہی ہم اُس شخص کے کفر کا بھی یقین رکھتے ہیں جو کوئی ایسا قول اختیار کرے جس سے تمام اُمت مرحومہ اور تمام صحابہ کی تکفیر لازم آتی ہو۔

اور علامہ ابن حجر مکی کتاب الزواجر عن اقتراف الکبائر میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

وفی معنی ذلک کل من فعل فعلا اجمع المسلمون علی انہ لا یصدر الا عن کافر (الی قولہ) او یشک فی نبوۃ نبی (الی قولہ) او فی تکفیر کل قائل قولا یتوصل بہ الی تضلیل الامۃ (زواجر ص ۴۲ ج ۱)

اور اسی حکم میں ہے وہ شخص جو کوئی ایسا فعل کرے جس کے متعلق مسلمانوں کا اجماع ہو کہ یہ فعل سوائے کافر کے کسی سے صادر نہیں ہو سکتا۔ یا کسی نبی کی نبوت میں شک کرے یا اس شخص کی تکفیر میں شک کرے جو ایسا قول اختیار کرتا ہے کہ جس سے تمام اُمت کا گمراہ ہونا سمجھا جائے

⁂

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے شخص کے کفر میں جو شخص شک کرے وہ بھی کافر ہے پس جب کسی کافر کو جس کا کفر کھلا ہوا، اور صاف ہو صرف مسلمان کہنا بلکہ اُس کے کفر میں شک کرنا بھی کفر ہے جیسا کہ زواجر کی عبارت مذکورہ سے ثابت ہوا اگرچہ کسی تاویل کے ساتھ ہو تو پھر مرزا کو اس کے عقائد معلوم ہونے کے بعد مہدی اور مسیح وغیرہ کہنے والا ضرور بالضرور کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور ملا علی قاری نے اس کی شرح میں اس پر اجماع نقل کیا ہے ولفظہ ہذا

فالاجماع علی کفر من لم یکفر احدا من النصاری والیہود وکل من فارق دین المسلمین

اُس شخص کے کفر پر اجماع ہے جو نصاری و یہود میں سے کسی کو کافر نہ سمجھے یا اُس شخص کو کافر نہ سمجھے جو مسلمانوں کے دین سے جدا ہو گیا۔

او وقف او شك قال القاضی ابوبکو لان التوقیف والاجماع اتفقا علی کفرهم فمن وقف فی ذلك فقد کذب النص والتوقیف او شك فیه والتکذیب والشك فیه لا یقع الا من کافر۔	(بلا وجہ شرعی) توقف یا شک کرے تو قاضی ابوبکر فرماتے ہیں کہ نقل شرعی اور اجماع دونوں اُن کے کفر پر متفق ہیں پس جو شخص اس میں (بلا وجہ شرعی) توقف یا شک کرے اُس نے نص شرعی کی تکذیب کی اور اُس میں تکذیب یا شک کافر ہی کر سکتا ہے۔

(متن الشفاء از شرح قاری ص۱۵ ج ۲)

اسی طرح درمختار (باب المرتدین) میں اس شخص کے متعلق جس نے کسی نبی کی توہین کی ہو تصریح کرتے ہیں۔

ومن شك فی کفره وعذابه کفر (در) واقره الشامی	اور جو شخص اُس کے کفر اور معذب ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ اگر یہ کہا جاوے کہ یہود و نصاریٰ اور ہنود آریہ وغیرہ کو مسلمان کہنا تو بے شک حسب تصریحات مذکورہ کفر ہے لیکن قادیانی کا کفر اس درجہ میں نہیں اس کے متعلق اگر کوئی شخص بوجہ حُسن ظن کے تاویل کرے تو گنجائش ہے کیونکہ وہ مدعی اسلام ہے اور ظاہر میں قرآن وحدیث کا اقرار کرتا ہے اور نماز روزہ وغیرہ احکام وشرائع اسلامیہ کا پابند ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ ضروریات دین کے خلاف میں تاویل معتبر نہیں۔ اور نہ اس کی گنجائش ہے ورنہ اگر یہی حُسن ظن اور تاویل کی وسعت کی جائے تو دنیا میں کوئی کافر نہیں رہتا۔ کیونکہ عموماً کفار کے طبقات کچھ نہ کچھ تاویل رکھتے ہیں۔ بُت پرست اور مشرکین کی تاویل خود قرآن میں مذکور ہے ما نعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفیٰ۔ اور یہ اُن کی تاویل بلا شبہ مرزا کی تاویلات سے زیادہ بہتر ہے۔

مرزا کے عقائد کفریہ۔ نبوت کا دعویٰ۔ وحی کا دعویٰ۔ ختم نبوت کا انکار، ختم نبوت کے اجماعی معنی، اور اس بارہ میں آیاتِ قرآنیہ کی تحریف۔ عیسیٰ علیہ السلام کی سخت ترین

توہین۔ دوسرے انبیاء کی توہین وغیرہ وغیرہ ان کی تمام تصانیف میں اس قدر واضح اور صاف ہیں کہ ان میں کوئی تاویل کرنا اس سے کم نہیں جو مشرکین کی تاویل بت پرستی کے متعلق آیت مذکورہ میں گذری ہے یا حدیث میں ہے کہ مشرکین بوقت طواف تلبیہ میں کہا کرتے تھے لا شریک لک الا شریکا ھو لک۔ (ترمذی)

اس لئے علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ ضروریات دین کے بارہ میں اجمالی معانی کے سوا آیات و روایات کی کسی دوسرے معنی کی طرف تاویل کرنا عذر مسموع نہیں۔ اور یہ تاویل اُن پر حکم تکفیر کے لئے مانع نہیں ہو سکتی۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ اکفار الملحدین میں اس کے متعلق کافی نقول جمع فرمادی ہیں (من شاء فلیراجع ثمہ) وللہ الحمد اولہ و آخرہ۔

عقائد روافض و شیعہ

روافض و اہل تشیع میں بہت سے مختلف العقائد فرقے ہیں۔ اور ہر فرقہ کے عقائد کو جدا جدا منضبط کرنا بھی دشوار ہے۔ ایک دوسری مشکل یہ ہے کہ بعض فرقہ کی کتابوں میں اُن کے بعض عقائد معلوم ہوتے ہیں مگر جب وہ عقیدہ اُن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ اُس کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً کتب شیعہ میں جا بجا اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ قرآن کو محرف و ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ مگر جب کہا جاتا ہے کہ تم موجودہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ شدت کے ساتھ اس سے تبری کرتے ہیں۔ ایک مشکل یہ ہے کہ ہندوستان میں عوام روافض کے متعلق یہ فیصلہ بھی دشوار ہے کہ وہ کس فرقہ میں درج ہیں۔ اب دریافت طلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں ہم روافض کے ساتھ کیا معاملہ کریں اُن کو مسلمان سمجھیں یا کافر اُن کے فرقوں کے جس قدر عقائد معلوم ہو سکے۔ وہ لکھے جاتے ہیں:-

(۱) بعض شیعہ مسلمانوں سے صرف اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ خلافت کے مستحق اوّل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو قرار دیتے ہیں۔ مگر باقی صحابہ کرام پر بھی تبری

نہیں کرتے؟

(۲) بعض روافض وہ ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ اوّل قرار دیتے ہیں اور باقی حضرات صحابہ پر تبرّا بھی کرتے ہیں؟

(۳) بعض وہ ہیں جو (معاذ اللہ) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خود معبود سمجھتے ہیں

(۴) بعض وہ ہیں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے وحی لانے میں غلطی کی۔ اصل میں وحی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر آئی تھی وہ غلطی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے (نعوذ باللہ منہ) گویا حقیقۃً نبی و رسول حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مانتے ہیں؟

(۵) بعض وہ ہیں جو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت رکھتے ہیں یا تمام حضرات صحابہ کو معاذ اللہ کافر مرتد کہتے ہیں؟

الجواب ۸۶

مختصر اور محقق و جامع کلام روافض کے بارہ میں یہ ہے کہ بلحاظ حکم روافض کی تین صورتیں ہیں۔

اوّل: یہ کہ ان میں سے کسی شخص یا فرقہ کے متعلق یقینی طور سے یہ بات ثابت ہو جاوے کہ وہ ضروریاتِ[1] دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے گرچہ انکار میں تاویل بھی کرتا ہو اور صاف انکار کرنے سے تبرّی بھی کرتا ہو۔ مثلاً قرآن مجید کے محرّف و ناقابل اعتبار ہونے پر اگر کسی شخص کی ایسی صاف عبارت ہے کہ اس سے یقینی طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے پھر باوجود اس کے وہ اپنی عبارت کو غلط مان کر اس سے رجوع ظاہر نہیں کرتا مگر عقیدہ تحریف قرآن سے تبرّی کرتا ہے تو اس تبرّی کا کوئی اعتبار نہیں۔ بلکہ وہ باتفاق و باجماع کافر مرتد ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا اسلامی معاملہ رکھنا جائز نہیں۔ نہ اس سے کسی مسلمان کا نکاح جائز اور اگر نکاح کے بعد اس کا عقیدہ ایسا ہو گیا تو نکاح فسخ ہو جاوے گا نہ اس کے ہاتھ کا ذبیحہ

---

[1] ضروریاتِ دین، اصطلاح میں اُن چیزوں کو کہا جاتا ہے جن کا ثبوت سرور میں قطعی و یقینی اور ایسا بدیہی ہو کہ عام مسلمان اس سے واقف ہوں، اس کی مفصل تعریف اور احکام اسی رسالہ کے شروع میں گذر چکے ہیں۔

حلال، نہ اُس پر نمازِ جنازہ جائز وغیر ذلک من الاحکام۔ اور دیں اس کی وہ تمام عبارات فقہاءؒ میں جو سوالِ اوّل کے جواب میں ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کے منکر کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ نیز علامہ شامیؒ کی عبارت ذیل بھی اس کے لئے کافی ہے۔ نعم لا شك فی تکفیر من قذف السیدة عائشة رضی اللہ عنہا او انکر صحبة الصدیق او اعتقد الالوهیة فی علی او ان جبریل غلط فی الوحی الخ شامی استنبولی ص ۴۰۶ ج ۳۔

دوم: صورت یہ ہے کہ کسی شخص یا فرقے کے متعلق یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر نہیں مگر صرف اس میں اختلاف رکھتا ہے کہ جمہورِ اُمت کے خلاف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو افضل الصحابہ اور خلیفہ اوّل سمجھتا ہے۔ تو وہ شخص فاسق و گمراہ ہے مگر کافر و مرتد نہیں۔ اس کے ساتھ وہ معاملات جائز ہیں جو کسی فاسق و گمراہ کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ذبیحہ اس کا حلال ہے اس کے جنازہ پر نماز جائز ہے۔ نکاح کے معاملہ میں اس سے بھی اجتناب کرنا بہتر ہے کیونکہ فاسق کی معاشرت کے اثرات و نتائج خطرناک ہیں لیکن اگر کسی مسلمان سُنّی لڑکی کا نکاح اس سے کر دیا گیا تو اگرچہ بلا ضرورتِ شدیدہ ایسا کرنا اچھا نہیں۔ لیکن یہ نکاح اس شرط سے جائز و منعقد ہو جائے گا کہ لڑکی بالغہ اور اس کے اولیاء دونوں کو نکاح کے وقت اس کا عقیدہ معلوم ہو اور وہ دونوں اس عقیدہ کے باوجود نکاح کی اجازت دے دیں۔ اور اگر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نکاح کی اجازت دینے سے انکار کیا تو یہ نکاح مذہب مفتی بہ کے مطابق منعقد و صحیح نہیں ہوگا۔ لڑکی کو شرعاً اختیار ہوگا کہ اپنا نکاح دوسری جگہ کسی سُنّی مسلمان سے کرے۔

اور اگر بوقتِ نکاح اس شخص نے دھوکہ دے کر اپنے آپ کو سُنّی مسلمان ظاہر کیا اسی پر لڑکی اور اس کے اولیاء نے نکاح کر دیا۔ بعد نکاح حقیقتِ حال معلوم ہوئی تو لڑکی اور اس کے اولیاء کو حق ہوگا کہ مسلمان حاکم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے نکاح فسخ کرا لیں اور اگر مسلمان حاکم کی عدالت میں مقدمہ لے جانا اختیار میں نہ ہو تو اہلِ محلہ یا اہلِ شہر میں سے دیندار مسلمان

لہ وفی الشامی عن الخیریة اتفق الائمة علی تضلیل اهل البدع اجمع وتخطئتهم وسب احد من الصحابة وبغضه لا یکون کفراً لکن یضلل شامی ص ۴۰۵ ج ۳،

کی ایک جماعت کے سامنے معاملہ پیش کر کے اُن سے فسخ نکاح کرالیا جائے لیکن اس صورت
میں قانونی گرفت سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے موجودہ حکومت میں درخواست دے کر
نکاح فسخ کرائیں خواہ حاکم مسلم ہو یا غیر مسلم۔ پھر اگر حاکم مسلم ہو تو یہی فسخ شرعاً بھی معتبر ہوگا۔ اور اگر
حاکم غیر مسلم تھا تو دوبارہ مسلمانوں کی پنچایت میں معاملہ پیش کر کے نکاح فسخ کرایا جاوے۔
مسلمانوں کی پنچایت جس کا فیصلہ شرعاً معتبر ہو سکتا ہے اُس کے لئے چند شرائط ہیں جو رسالہ
حِیْلَۃِ نَاجِزَہ میں مدلل ومفصل اور رسالہ المرقومات للمظلومات میں مختصر مگر کافی طور
سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اگر ضرورت پیش آوے تو بغیر اُس کے دیکھے ہوئے عمل نہ کیا جاوے
اس قسم دوم کے احکام کے دلائل بھی رسالہ حیلہ ناجزہ کے تتمہ میں خیار کفاءت کے ذیل میں
مفصل مذکور ہیں وہاں دیکھ لینا چاہیئے اور اجمالی طور پر عبارات ذیل بھی ثبوت کے لئے
کافی ہیں۔ فی الدر المختار فی باب الخامس من نکاح۔ العالمگیریہ۔ تعتبر الکفاءۃ
فی الدیانۃ وھذا قول ابی حنیفۃ و ابی یوسف وھو الصحیح کذا فی الھدایۃ فلا
یکون الفاسق کفوًا للصالحۃ کذا فی المجمع سواء کان معلن الفسق او لم یکن کذا
فی المحیط (عالمگیری ص ۳۰۲ ج ۲ مطبوعہ کانپور) نفذ نکاح حرۃ مکلفۃ بلا ولی و
لہ اذا کان عصبۃ ولو غیر محرم (الی قولہ) الاعتراض فی غیر الکفوء ما لم تلد
ویفتی بعدم جوازہ اصلا اھ وفی رد المحتار ھذہ روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃ رح
وایدہ صاحب الدر بقولہ وھو المختار للفتوی والعلامۃ الشامی وغیرہ بقول
شمس الائمۃ وھذا اقرب الی الاحتیاط انتھی۔ وکذلک فی کفاءۃ الدر المختار
لو زوجہا برضاھا ولم یعلموا بعدم الکفاءۃ ثم علموا لا خیار لاحد الا اذا شرطوا
الکفاءۃ او اخبرھم بہا وقت العقد فزوجوہ علی ذلک ثم ظہر انہ غیر
کفوء کان لہم الخیار ولوالجیہ۔

تیسری صورت یہ ہے کہ یقینی طور پر کسی امر کا ثبوت نہ ہو یعنی نہ اس کا یقین ہے
کہ وہ ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے اور نہ اس کا کہ منکر نہیں۔ بلکہ ایک مشتبہ
حالت ہے خواہ اشتباہ اس وجہ سے ہو کہ اس فرقہ کے اقوال وعقائد ہی مشتبہ ہیں یا اس وجہ سے

اگر کسی شخص کے متعلق یہ یقین نہیں کہ اس کا تعلق باعتبار مذہب و عقائد کے کس فرقہ سے ہے ایسے لوگوں کے متعلق شرعی فیصلہ بھی دشوار ہے اس میں سب سے زیادہ احوط و اسلم وہ حکم ہے جو فقیہ العصر امام وقت مجدد الملت حکیم الامت سیدنا و سندنا حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے امداد الفتاوی میں تحریر فرمایا ہے۔ جو رسالہ ہذا کے ص ۲ میں بعینہا مذکور ہے اور اس جگہ مکرر نقل کیا جاتا ہے۔

عبارت امداد الفتاوی جلد سادس

اگر کسی خاص شخص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردد ہو، خواہ تردد کے سبب علماء کا اختلاف ہو خواہ قرائن کا تعارض ہو یا اصول کا غموض تو اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جائے نہ اسلام کا حکم۔ اول میں تو خود اس کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے اور حکم ثانی میں دوسرے مسلمانوں کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے۔ پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا یعنی نہ اس سے عقد مناکحت کی اجازت دیں گے نہ اس کی اقتداء کریں گے۔ اگر تحقیق کی قدرت ہو اس کے عقائد کی تفتیش کریں گے اور اس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے ہی احکام جاری کریں گے اور اگر تحقیق کی قدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں گے۔ اس کی نظیر وہ حکم ہے جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے۔ لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم وقولوا آمنا بالله وما انزل الينا الآية رواه البخاري۔ دوسری فقہی نظیر احکام خنثیٰ کے ہیں۔ يؤخذ فيه بالاحوط والاوثق في امور الدين وان لا يحكم بثبوت حكم وقع الشك في ثبوته واذا وقف خلف الامام قام بين صف الرجال والنساء وتصلي بقناع ويجلس في صلاته جلوس المرأة ويكره له في حياته لبس الحلي والحرير وان يخلو به غير محرم من رجل او امرأة ولا يسافر مع غير محرم من الرجال والاناث ولا يغسله رجل ولا امرأة ويتيمم بالصعيد ويكفن كما تكفن الجارية واشباهه مما نصه الفقهاء از در مختار ۲۲ کامی پر لکھا ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

العبد الضعیف محمد شفیع عفا عنہ
مدرس دار العلوم دیوبند۔ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ ہجری

الحکم الحقانی

فی

الحزب الاغاخانی

مصنفہ حضرت مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین صورت مسئولہ میں کہ ہمارے شہر ...... میں ایک شخص .... اطراف بمبئی کا باشندہ قوم سے خوجہ، سوداگر رہتا ہے وہ اپنے آپ کو آغا خان کا مرید اور پیرو ظاہر کرتا ہے اتفاق سے اُس کے یہاں ایک میت ہوگئی تاجر مذکور نے اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا چاہا۔ اُس پر یہاں کے مسلمانوں میں کچھ کشمکش پیدا ہوگئی ہے۔ ایک فریق کی رائے ہے کہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں ہرگز دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ سر آغا خاں دائرۂ اسلام سے خارج ہیں اور اپنی رائے کی تائید میں امور ذیل پیش کرتا ہے:

(۱) سر آغا خان کی تصویر کی پرستش کرتا ہے۔

(۲) ہندؤں نے مشہور اوتار کرشن جی کی مورت اپنے عبادت خانہ میں رکھ چھوڑی ہے۔

(۳) دیوالی جو ہندوؤں کا مشہور تیوہار ہے۔ اس میں اپنے حساب کی بہی کھاتہ تبدیل کرتا ہے۔ علاوہ اس کے اور بھی بعض مراسم مشرکانہ ادا کرتا ہے مثلاً

(۴) اپنے کھاتہ کی ابتدا میں بجائے بسم اللہ الخ کے لفظ اوم لکھتا ہے۔

(۵) سر آغا خاں کے اندر خدائی حلول کا معتقد ہے۔

— مسلمانوں کا دوسرا فریق کہتا ہے کہ وہ کلمہ گو ہے اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اس کو کسی طرح کافر نہیں کہہ سکتے۔

خود تاجر موصوف سے جو دریافت کیا گیا تو اُس نے بھی بیان کیا کہ میں مسلمان ہوں کلمہ پڑھتا ہوں۔ مسلمانوں کی ضروریات میں چندہ دیتا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں سر آغا خان کو اپنا رہنما اور مرشد سمجھتا ہوں جیسے عام طور پر مسلمان کسی نہ کسی پیر کے مرید ہوا کرتے ہیں۔ ذلبس۔

فریقِ اوّل اس تمام بیان کو تاجر مذکور کے ضرورت اور مصلحتِ وقت پر محمول کرتا ہے۔ اب حضور سے چند امور دریافت طلب ہیں۔

سوال اوّل:۔ سر آغا خانیوں کے متعلق حضور کی کیا تحقیق ہے۔ ان کو شرعاً مسلمان کہیں گے یا کافر؟

سوال دوم:۔ اگر کافر ہیں تو تاجر مذکور کا اپنی صفائی میں یہ پیش کرنا کہ مسلمان ہوں، کلمہ گو ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اس بیان سے اُس کو مسلمان سمجھا جائے گا یا نہیں؟

سوال سوم:۔ اگر نہیں تو ایک مدعی اسلام کی تکفیر کیسے ہو سکتی ہے۔ کافر اور مسلمان ہونے کا آخر کیا معیار ہے۔

سوال چہارم:۔ بعض بہی خواہانِ قوم کا خیال ہے کہ گو تاجر مذکور شرعی نقطۂ نگاہ سے اسلام سے خارج ہو لیکن اس وقت ہم مسلمانوں کو اتحادِ قومی اور ترقی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ایسے جھگڑے بکھیڑوں کو نکالنا مناسب نہیں۔ یہ وقت نازک ہے۔ سب مدعیانِ اسلام کو مسلمان کہنا اور سمجھنا چاہیے۔ ان کو اسلام سے خارج کر کے اپنی تعداد اور مردم شماری کو گھٹانا نہیں چاہیے۔ بہی خواہانِ قوم اور ہمدردانِ اسلام کا یہ خیال شرعاً کس قدر وقعت رکھتا ہے؟

سوال پنجم:۔ سر آغا خانیوں کے معتقدات کا خود اسلام رد اور تجویز نہ ہو بسر دست یہ امر حل طلب ہے کہ خصوصیت کے ساتھ تاجر موصوف کا بیان اور دعوئے اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو کافر کہیں گے یا مسلمان سمجھیں گے اور ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ دی جائے یا کیا معاملہ کرنا چاہیے؟

سوال ششم:۔ جو لوگ مولوی تاجر مذکور کی میت کی نمازِ جنازہ پڑھتے اور اُس کو مسلمان کہتے ہیں اور کہلواتے ہیں اور اس میں کوشش کرتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟

نوٹ: اسی اثناء میں گجراتی زبان میں ایک استفتہ دستیاب ہوگیا جس میں ان کے عقائد وطریقہ نماز کا تذکرہ موجود ہے۔ مزید بصیرت کے لئے منسلک لفافہ بذا ہے۔

محمد طاہر

طریقہ نماز با اصول دعا تعلیم کردہ آغا خان ہز

منقول از ترجمہ رسالہ تقویۃ الایمان بزبان گجراتی

نماز پڑھو۔ نماز پڑھو۔ خدا تم کو برکت دے۔ خدا کا نام لو۔ خداوند شاہ علی تم کو نیک اور اخلاق دے۔ یا شاہ میری شام کی نماز اور دعا قبول کر، جو حق تم کو ملا ہے۔ میں اس کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے ہمارے آقا آغا سلطان محمد شاہ۔ اس کے بعد سجدہ کرو اور اگر رات کی نماز ہو تو اس طرح کہو۔ میری شام اور رات کی دعائیں، دوسری مرتبہ سجدہ کرو اور تسبیح پڑھو اور حسب ذیل طریقہ پر دعا، درود پڑھو۔

تسبیح۔ میں اپنے گناہوں پر پچھتاتا ہوں۔ دو مرتبہ۔ میں سر سے پاؤں تک تیرا تقصیر وار ہوں۔ اے غفور۔ رحیم شاہ میرا گناہ معاف کر۔ پیر تیری ہی عبادت کرتے ہیں بندہ دعا مانگتا ہے۔ اے سچّے شاہ تو منظور رکھنے والا ہے۔ میں شاہ کے اسی فرمان کو سر اور آنکھوں پر رکھتا ہوں جو پیر کے ذریعہ مجھ کو ملا ہے۔ یہ کہہ کر تسبیح زمین پر رکھ دو اور نیچے بتایا ہوا ورد کرو۔

اشہد۔ سبحان اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ اکبر۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ الرحمٰن۔ ذی الجلال والاکرام۔

ان تمام صفتوں سے بنا ہوا قدوس۔ سب پر طاقت ور خدا۔ ایران کے ضلع جالدیا میں انسان کا جسم لے کر ستر باپ کی پیٹھ سے نکلا۔ اُنتہر خدا ہو جانے کے بعد سترھویں (اوتار کے لفظ سے) اڑتالیسواں امام۔ دسواں بے عیب اوتار۔ ہمارا خداوند آغا سلطان محمد شاہ داتا۔

اس کے بعد سجدہ کرو۔ حق شاہ اچھا۔ دنیا اور زمین کا شاہ۔ خلیفہ اور گدی کے جانشینوں کا نام کا وظیفہ کرو۔ دنیا اور زمین کے اچھوں کا نام یہ ہے۔ شاہ کے خلیفہ ابو طالب ولی کا نام حسب ذیل :-

۱۔ ہمارا سچا خداوند شاہ علی۔	۲۶۔ ہمارا سچا خداوند شاہ اسمٰعیل
۲۔ ″ ″ ″ شاہ حسین۔	۲۷۔ ″ ″ ″ شاہ محمد ابن اسمٰعیل
۳۔ ″ ″ ″ شاہ زین العابدین	۲۸۔ ″ ″ ″ شاہ نبیع احمد۔ کبڑا الی تبرز
۴۔ ″ ″ ″ شاہ محمد باقر	۴۷۔ ″ ″ ″ شاہ آغا علی شاہ
۵۔ ″ ″ ″ شاہ محمد جعفر	۴۸۔ ″ ″ ″ شاہ آغا محمد شاہ داتا۔

اور اس وقت کی امامت کا مالک خداوند زمان۔ امام شیخ المشائخ امامت کی طاقت رکھنے والا مانو۔ آغا سلطان محمد شاہ داتا بے شمار کروڑوں آدمیوں کا دستگیر اس وقت کی امامت کا مالک۔ اے شاہ جو حق تم کو ملا ہے بطفیل اس کے اپنے حضور میں میری دعا منظور کر۔ اے ہمارے خداوند آغا سلطان محمد شاہ۔

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اوّل چند مقدمات ممہد کرتا ہوں۔

(الف) قال اللہ تعالیٰ لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ

(ب) قال اللہ تعالیٰ مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنْ بَحِیْرَۃٍ وَّلَا سَآئِبَۃٍ وَّلَا وَصِیْلَۃٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰکِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ۔

(ج) قال اللہ تعالیٰ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔

(د) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم۔ رواہ البخاری۔

(ہ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیۃ المنافق ثلاث رواہ الشیخان۔

زاد مسلم وان صام وصلی وزعم انہ مسلم)

(و) عن حذیفۃ رضؓ قال انما النفاق کان علی عھد رسول صلی اللہ علیہ وسلم فاما الیوم فانما ھو الکفر او الایمان رواہ البخاری۔

(ز) فی اللمعات فی شرح الحدیث ای الحکم بعدم التعرض لاھلہ ولستر علیھم کان علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمصالح کانت مقتصرۃ علی ذالک الزمان اما الیوم فلم تبق تلک المصالح فنحن ان علمنا نہ کافر سرًّا قتلناہ حتی یؤمن اھ

(ح) فی رد المحتار احکام المرتد تحت قول الدر المختار لان التلفظ بھا صار علامۃ علی الاسلام ما نصہ افاد بقولہ صار الی ان ما کان فی زمن الامام محمدؒ تغیر لانہ فی زمنہ ما کانوا یمتنعون عن النطق بھا فلم تکن علامۃ الاسلام فلذا شرطوا معھا التبری واما فی زمان قاری الھدایۃ فقد صارت علامۃ الاسلام لانہ لایاتی بھا الا المسلم الخ

(ط) فی الدر المختار احکام غسل المیت ومحل دفنھم کدفن ذمیۃ حبلی من مسلم الخ

(ی) فی مختصر المعانی بحث الاسناد ما نصہ وقولنا فی التعریف بتأول یخرج نحو ما مر من قول الجاھل انبت الربیع البقل رائیا الانبات من الربیع الخ فیہ بحث وجوب القرینۃ للاسناد المجازی مالفظہ وصدورہ عطف علی استحالۃ ای کصدورہ عن الموحد فی مثل اشاب الصغیر الخ

آیات وروایات وعبارات بالا سے یہ امور مستفاد ہوئے۔

اوّل:۔ حلول کا قائل ہونا کفر ہے (الآیۃ ۱)

ثانی:۔ جو رسوم وعادات کفار کے ساتھ ایسی خصوصیت رکھتی ہوں کہ بمنزلۂ ان کے شعار کے ہو گئے ہوں۔ اگر عرفاً وہ شعار مذہبی سمجھے جاتے ہوں وہ بھی کفر ہیں (آیت ب) اسی اصول پر فقہاء نے شد زنار کو کفر فرمایا ہے ورنہ تشبہ بالکفار ہے جو مستدعی

رکوں کی کفار ہونے کے سبب معصیت و حرام ہے (روایت ج) جس طرح عادات مخصوصہ بالمسلمین دلیل اسلام ہیں (روایت د) بشرطیکہ کوئی یقینی دلیل کفر کی نہ ہو ورنہ کفر ہی کا حکم کیا جائے گا۔ لقولہ تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۔ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ۔

اور اسلام کی وجہ واحد کو کفر کی وجوہ متعددہ پر ترجیح اُس وقت ہے جب وہ وجوہ محتمل ہوں متیقن نہ ہوں۔

ثالث :۔ موجباتِ کفر کے ہوتے ہوئے بعض دعویٰ اسلام وصلوٰۃ وصیام اور استقبال بیت الحرام ترتیب احکام اسلام کے لئے کافی نہیں جب تک اُن موجبات سے تائب نہ ہو جائے (روایت ہ)

رابع) باوجود ثبوت کفر کے اسلام ظاہر کرنے والوں کے ساتھ بنابر مصالح اسلامیہ مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنا گو بعض اوقات اُن کے کفر کا بھی ظہور ہو جاتا تھا کما نقل عنھم قولھم انؤمن کما امن السفہاء ونحوہ۔ مخصوص تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کے ساتھ اب وہ حکم باقی نہیں رہا (روایت عبارات ز) بلکہ بعض احکام کے اعتبار سے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر عہد میں معاملہ کالمسلمین میں تغیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ آیت ولا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ میں مصرح ہے والنھی عن الزیارۃ یستلزم النھی عن الدفن فی مقابر المسلمین لان الدفن یستلزم الزیارۃ عادۃ ۔ البتہ تعرض بالقتل والنھب کی ممانعت باقی رہ گئی تھی۔

خامس :۔ جو کافر اصول اسلامیہ کا بھی مقر ہو اُس کے حکم بالاسلام کے لئے محض تلفظ بکلمتے الشہادہ کافی نہیں جب تک اپنے کفریت سے تبری کا اعلان نہ کرے (عبارت ح)

سادس :۔ کافر کو مقابر مسلمین میں دفن کرنا جائز نہیں (عبارت ط)

سابعہ: جس شخص کا کفر ثابت ہو جائے اُس کے اقوال وافعال محتملہ للکفر والاسلام میں تاویل کرنے سے اُس کا کفر مانع ہوگا (عبارت ی)

اب مقدمات کے بعد سب سوالات کا جواب ظاہر ہے مگر تبرعاً جُدا جُدا بھی عرض کرتا ہوں سوال میں دو قسم کے اُمور مذکور ہیں ایک قسم وہ جو یقیناً موجبِ کفر ہیں جیسے تصویر کی پرستش کرنا یا کرشن کی تصویر عبادت خانہ میں رکھنا جو شعار کفار کا ہے یا بجائے بسم اللہ کے لفظ اوم لکھنا یا حلول کا قائل ہونا جو سوال کی تمہید اور ترکیب نماز کے آغاز میں مذکور ہے اور دوسری قسم وہ جو صرف محتمل کفر ہیں جیسے دیوالی سے بہی کھاتہ کا حساب شروع کرنا یا مقتداؤں کو لفظ خداوند سے خطاب کرنا یا اُن سے دعا مانگنا۔ پس قسم اول پر تو حکم بالکفر ظاہر ہے۔ (للاصل الاول والثانی) اور قسم ثانی کا صدور اگر مسلمان سے ہوتا تو اُس میں تاویل کر کے مباح یا معصیت پر محمول کیا جاتا۔ مگر جب اُس کا صدور کافر سے ہے تو تاویل کی ضرورت نہیں (للاصل السابع) اور ان کفریات کے ہوتے ہوئے نہ ایسے شخص کا دعویٰ اسلام کافی ہے اور نہ اُس کا نماز ی اور روزہ دار ہونا کافی ہے اور نہ اُس پر نماز جنازہ جائز ہے، نہ مقابر مسلمین میں دفن کرنا جائز ہے (للاصل الثالث والسادس) اور نہ مصلحت کے سبب کافر کو مسلمان کہنا یا اُس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرنا جائز ہے۔ (للاصل الرابع والخامس) البتہ بلا ضرورت کسی سے لڑائی جھگڑا بھی نہ چاہیئے۔ اور ایسے مصالح کی بناء پر ایسی رعایت کرنا اُن مصالح سے زیادہ مفاسد کا موجب ہو جاتا ہے کیونکہ وہ مصالح تو محض دنیوی ہیں اور مفاسد دینیہ۔ اُن مفاسد کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اُن کفریات کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلمان کہا جاوے گا تو ناواقف مسلمانوں کی نظر میں ان کفریات کا قبح کم ہو جاوے گا۔ اور وہ آسانی سے ایسے گمراہوں کے شکار ہو سکیں گے تو کافروں کو اسلام میں داخل کرنے کا انجام یہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ کیا کوئی مصلحت اس مفسدہ کی مقاومت کر سکے گی۔ ایسے مصالح و مضار کے اجتماع کا یہ فیصلہ فرمایا گیا قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا وقال تعالیٰ يَدْعُو لَمَن ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِن نَّفْعِهِ۔ فقط واللہ اعلم

اشرف علی

۱۷ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ

تحذیر الانام
عن تغییر رسم الخط من
مصحف الامام

قرآن کریم کا رسم الخط

اور اس کے احکام

مقام تالیف ——————— دیوبند

تاریخ تالیف ——————— محرم سنہ ۱۳۶۳ھ

اشاعتِ اوّل ——————— باہتمام خطیب عبدالکریم صاحب
تاجر چرم محلہ بڑی پیٹ وانمباڑی
از مطبع کریمی مدراس

"قرآن کریم کی بعض تفسیریں ٹامل زبان
میں شائع ہوئیں جنھیں اُلٹی طرف سے شروع
کیا گیا اس کے متعلق ایک سوال کے جواب
میں یہ مقالہ زیر تحریر آیا جس میں رسم عثمانی
کے اتباع سے متعلق تمام ضروری احکام
جمع کر دیئے گئے ہیں"

تحذیر الانام
عن تغییر رسم الخط
من مصحف الامام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفٰی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی

اما بعد

سوال

ماقولکم ایہا العلماء رحمکم اللہ فی ھذا الباب ایک شخص نے قرآن مجید کا ترجمہ علاقہ مدراس کی ٹامل زبان میں کیا ہے اور جب وہ اس کی طباعت کریں گے تو اس کے ساتھ قرآن مجید عربی صفحہ بصفحہ لگانا بھی چاہتے ہیں چونکہ ٹامل زبان کی کتابت بائیں طرف سے شروع ہوتی ہے اس لئے اسی طرح بائیں طرف سے ہی رکھا جاتا ہے اور بائیں طرف سے اوراق الٹے جاتے ہیں۔ اب یہ ترجمہ بھی اسی طرح بائیں طرف سے شروع ہوگا اور عربی قرآن بھی بائیں طرف سے شروع ہوکر بائیں طرف سے اوراق الٹے جائیں گے گو اس کی کتابت سیدھے طرف سے ہوئی ہے!

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضہ نے جو قرآن مجید کو لکھوائے تھے تیرہ سو سال سے قرآن مجید کی کتابت سیدھی شروع ہوکر سیدھی طرف سے ہی اوراق الٹے جاتے ہیں۔ اب اس طرح کا ترجمہ حضرت عثمان رضہ کے قرآنی وضع اور تیرہ سو سال کے مترجمین و مفسرین کے اوضاع و تعامل اور اجماعِ امت علیٰ ہذا العمل کا خلاف ہوتا ہے یا نہیں؟

(۱) کیا یہ صورت جائز ہے کہ ایک صفحہ میں قرآن مجید عربی کو ٹامل رسم خط میں لکھا جاوے اور دوسرے صفحہ میں اس کا ٹامل ترجمہ لکھا جاوے؟

(۲) نیز کیا یہ جائز ہے کہ قرآن مجید عربی کو عربی ہی رسم خط میں ایک صفحہ میں اور اس کا ترجمہ ٹامل زبان کا دوسرے صفحہ میں لکھا جاوے وجہ شبہ یہ ہے کہ قرآن اصل ہے اور ترجمہ اس کا تابع اس اصل کو تابع بنا کر ٹامل کے موافق بائیں طرف سے صفحات شروع کرکے اوراق الٹے جاویں؛

علمائے اُمتِ محمدیہ کے پاس جائز ہے یا نہیں۔ باوجودیکہ تامل زبان کی اگرچہ کہ بائیں طرف
سے شروع ہوتی ہے لیکن اس کے صفحات سیدھے طرف سے رکھے جاسکتے ہیں اور ہر صفحہ کا
ہندسۂ صفحات اس کے سر پر رکھا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ سے قرآن شریف بھی موافق وضع عثمانی
اور تیرہ سو سال کے تعامل اسلامی کے موافق ہو سکتا ہے اور یہ کچھ دشوار امر نہیں ہے اور
یہ خیال کہ اگلوں نے اس قسم کے ترجمے لکھے ہیں اور قرآنی صفحات کو تامل یا انگریزی وغیرہ
کے تابع بنا کر ورقوں کو بائیں طرف سے الٹنے کے لئے کتابیں ترجمہ تفاسیر لکھی ہیں اور شائع
بھی ہو چکی ہیں کسی نے اس کا خلاف نہیں کیا اور ایسا کرنے والے علماء تھے انھوں نے اس کام
کو جائز قرار دے کر عمل کیا۔ بس اس کا خلاف کرنے والا عالم نہیں۔ ایسا کہنا کہاں تک صحیح ہے۔
حضرات علمائے کرام کی اس باب میں کیا رائے ہے؟ اور قرآن مجید کی وضع عثمانی کیسی تھی بیان
فرمائیے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الجواب

اتفاقاً انھیں ایام میں متعدد سوالات اس قسم کے جمع ہو گئے۔ کسی میں قرآن کو ہندی رسم خط
میں اور کسی نے گجراتی رسم خط میں کسی نے انگریزی رسم میں لکھنے کے متعلق سوال کیا ہے اس لئے
اس کا جواب کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے جو سب سوالات کا جواب ہو سکے۔

پہلے ایک بات بطور مقدمہ سمجھ لی جاوے پھر اُس سے سب سوالات کا جواب آسان ہو گا
وہ یہ ہے کہ باجماع صحابہ و تابعین اور باتفاق ائمہ مجتہدین پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ
والسلام کے نزدیک قرآن مجید کی کتابت میں مصحف عثمانی جس کو اصطلاح میں امام کہا جاتا
ہے اُس کا اتباع واجب ہے، اُس کے خلاف کرنا تحریف قرآن اور زندقہ کے حکم میں ہے
اور خصوصاً کلمات قرآنی کی ترتیب بدلنا یا اُس میں کسی حرف کی کمی زیادتی کرنا تو کھلی تحریف
ہے جس کو کوئی ملحد بھی صراحۃً تجویز نہیں کر سکتا (اس اجماع کا ثبوت اور شواہد آخر میں ذکر
کئے جائیں گے)۔

یہی وجہ ہے کہ عہدِ صحابہ میں جب اسلام مشرق و مغرب کے ممالک عجم میں اپنی آسمانی کتاب

قرآن مجید کے ساتھ پھیلا۔ اُس وقت قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے والے گنے چنے حضرات تھے۔ عراق وخراسان اور ہندوستان و ترکستان وغیرہ کے رہنے والے نومسلم نہ عربی رسم خط پڑھ سکتے تھے نہ اُن کے ممالک میں ابتداً کوئی ایسا آدمی میسر تھا جو عربی کو سمجھ کر اُن کی ملکی زبان میں اُس کی ترجمانی بآسانی کر سکے اور قرآن اُن کو پڑھا سکے۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت اس کی کس قدر ضرورت ہو گی کہ ہر مُلک کے رسم خط میں قرآن لکھوا کر اُن کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ آسانی سے پڑھ سکیں لیکن پوری تاریخ اسلام میں ایک واقعہ اس کا قرون مشہود لہا بالخیر میں ثابت نہیں کہ اُن حضرات نے کسی عجمی رسم خط میں قرآن لکھوایا ہو یا اس کی اجازت دی ہو۔ بلکہ تعامل صحابہ کرام کا اُس وقت بھی وہ ہوا جو صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضؓ ملک شام کے جہاد اور آرمینیہ۔ آذربیجان کی فتح میں شریک تھے وہاں اہلِ عراق کو قرآن کی مختلف قراءتوں میں اختلاف کرتے ہوئے دیکھا تو اُس وقت کے خلیفۂ اسلام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سخت تشویش کا اظہار کیا اور یہ الفاظ کہے :۔

ادرک الامۃ قبل ان یختلفوا	اے امیر المؤمنین آپ اُمت کی خبر لیں اس سے
اختلاف الیہود والنصاریٰ	پہلے کہ اُن میں یہود و نصاریٰ جیسا اختلاف واقع ہو جائے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تمام اجلہ صحابہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور زید بن ثابت اور عبد اللہ بن زبیر اور سعید بن العاص اور عبد الرحمٰن بن حارث وغیرہم کے مشورہ سے طے کر لیا کہ قبائل عرب کے سات لغات جن پر قرآن نازل ہوا ہے اگرچہ وہ سب وحی اور حق ہیں لیکن اُن کے لفظی اختلاف سے اب یہ اندیشہ ہے کہ کہیں معنوی اختلاف اور تحریف کا راستہ نہ نکل آوے۔ اس لئے اب صرف قریش کی لغت پر قرآن پڑھا جاوے دوسرے لغات کو موقوف کر دیا جاوے (کیونکہ یہ اختلاف لغات صرف لفظی تھا معنی پر اُس کا کوئی اثر نہیں تھا جو قبائل کی آسانی کے لئے جاری ہوا تھا۔ اس کی مثال اُردو میں ایسی ہے جیسے دہلی لکھنؤ کی اُردو میں باہمی کچھ فرق ہیں مثلاً آپ کو اور آپ کے تئیں وغیرہ کہ جس کا معنی پر کوئی اثر نہیں)۔

باجماع صحابہ لغت قریش پر قرآن کریم کے بہت سے نسخے لکھوائے گئے اور ایک جماعت صحابہ کے سامنے اُن کو پڑھا گیا صحیح کیا گیا۔ اس کے بعد وہ نسخے مختلف ممالک عرب و عجم، مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں بھیج دیے گئے اور باجماعِ اُمت اُن کا اتباع ہر چیز میں لازم و ضروری سمجھا گیا (کذا فی روح المعانی ص ۲۰)

حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جامع دمشق میں اُس کا ایک نسخہ اب تک موجود ہے۔ جو بڑے وزنی اوراق پر لکھا ہوا ہے۔

الغرض قرآنِ کریم عجمی ممالک میں آج نہیں پہنچا بلکہ تقریباً تیرہ سو برس پہلے سے پہنچا ہوا ہے اور عجمیوں کو عربی رسم خط میں قرآن پڑھنے کی مشکلات بھی آج پیدا نہیں ہوئی بلکہ اسی وقت سے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو اُس وقت یہ مشکلات بہت زیادہ ہونا چاہئیں کہ ہر جگہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی پھر ان میں لکھے پڑھے کم تھے۔ خصوصاً قرآن پڑھانے والا تو کوئی عرب ہی ہو سکتا تھا جس کا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر بستی میں پہنچنا ظاہر ہے کہ آسان نہ تھا لیکن ان سب مشکلات مزعومہ کے باوجود صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہیں یہ تجویز نہ کیا کہ قرآن کو ملکی رسم خط میں لکھوا کر ان لوگوں کو دیا جاوے۔ بلکہ ان حضرات نے جس طرح قرآن کے معانی اور الفاظ اور زبان کی حفاظت کو ضروری سمجھا اسی طرح اُس کے رسم خط کی بھی مصحف عثمانی کے موافق حفاظت کرنا ضروری سمجھا۔ اور ان مشکلات کو حفاظتِ مذکورہ کے مقابلہ میں ناقابلِ التفات قرار دیا۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ میں دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ سب مشکلات محض خیالی تھیں۔

خداوند سبحانہ وتعالیٰ نے قراءت قرآن کے آسان کر دینے کا کھلے لفظوں میں جو خود اعلان فرمایا ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ۔ اس کا مشاہدہ سب کی آنکھوں کے سامنے آگیا کہ ہر ملک و ہر زبان والے قرآن کو ایسا پڑھنے لگے کہ پہلی اپنی مادری زبان کی کتابوں کو بھی ایسا نہیں پڑھ سکتے۔ اور انہیں اہل عجم میں سیکڑوں ایسے حضرات ہوئے جو تجوید قرآن اور دیگر علوم قرآنیہ کے امام مانے گئے۔

الغرض اول تو یہ مشکلات محض خیالی ہیں ان کو مشکل تسلیم کرنا ہی غلطی ہے اور بالغرض

تسلیم بھی کیا جاوے تو ہر مشکل کا ازالہ ضروری نہیں۔ یوں تو نماز روزہ وغیرہ ارکانِ اسلام سب ہی کچھ نہ کچھ مشکل اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اسی مضمون کو شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے فتاوی میں خوب واضح فرما دیا ہے جس کی عبارت عنقریب نقل کی جائے گی۔

الغرض صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل سے واضح ہو گیا کہ جس طرح قرآن میں زبان عربی کی حفاظت ضروری و لازم ہے کسی عجمی زبان میں بدون قرآنی عربی عبارات کے قرآن مجید کی کتابت جائز نہیں اسی طرح عربی رسم خط کی حفاظت بھی ضروری ہے کسی دوسرے رسم خط میں لکھنا اُن کا جائز نہیں کہ اُس میں رسم خط عثمانی کی مخالفت اور تحریف قرآن کا راستہ کھولنا ہے جو باجماع اُمت حرام ہے۔

خصوصاً ایسے رسم خط جن میں کلمات کی ترتیب بدل جائے یا کچھ حروف میں کمی بیشی کرنا پڑے جیسے انگریزی رسم خط ہے کہ اُس میں حرکات (زبر زیر پیش) کو بھی بشکلِ حروف لکھا جاتا ہے۔ ایسا لکھنا تو قرآن میں زیادتی کرنا اور قطعاً تحریف قرآن ہے۔

عربی رسم خط میں زیر زبر وغیرہ حرکات اگرچہ کلمات سے بالکل جُدا اور ممتاز ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود علمائے سلف کو اس میں بھی اختلاف کی نوبت پیش آئی کہ قرآن کی عبارت پر یہ حرکات لکھنا بھی جائز ہے یا نہیں۔ بعض حضرات نے اس کو بھی مکروہ سمجھا۔ بعض نے صرف مواضع مشکلہ میں بضرورت اجازت دی علامہ دانی جنہوں نے رسم خط قرآن پر مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ اُس میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اعراب (حرکات زیر زبر وغیرہ) اور نقطے سُرخی سے لکھے جاویں تاکہ قرآن کی اصل عبارت سے ممتاز رہیں۔

علامہ نووی اور جمہور فقہاء نے اس کی مطلقاً اجازت دی کیونکہ عربی رسم خط میں اعراب مستقل جُدا گانہ چیز ہے اُس کا اختلاط کلمات و حروف کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ (کذا ذکرہ السیوطی فی الاتقان مصری ص ۱۷۱ ج ۲)

الغرض عربی رسم خط میں حرکات اور نقطوں کا کلمات سے بالکل جُدا اور ممتاز ہونا ثابت ہونے کے باوجود سلف صالحین کو اُن کی کتابت فی المصاحف میں اختلاف پیش آیا تو جس رسم خط میں

انگریزی) میں یہ حرکات خود کلمات کے درمیان بشکل حروف لکھی جاتی ہوں اُس کی اجازت کیسے متصور ہے۔ ٹامل زبان کا حال معلوم نہیں کہ اس بارہ میں وہ بھی انگریزی کی طرح ہے یا کیا صورت ہے؟

علاوہ ازیں عربی زبان میں چند حروف ایسے ہیں کہ ہر حرف سے لفظ کے معنی بالکل جُدا ہوجاتے ہیں لیکن بہت سی عجمی زبانوں میں ان حروف میں کوئی فرق نہیں سب کو ایک ہی "ز" سے پڑھا جاتا ہے ایک ہی شکل سے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً (س۔ ث۔ ص، اور (ذال۔ ز۔ ظ) وغیرہ تو جب قرآن کو اس رسم خط میں لکھا جائے گا تو ان حروف کا کوئی امتیاز نہ رہیگا جو سخت ترین تحریف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسم خط عثمانی کا اتباع لازم و واجب ہے اُس کے سوا کسی دوسرے رسم خط میں اگرچہ وہ بھی عربی ہی کیوں نہ ہو قرآن کی کتابت جائز نہیں۔ مثلاً اوائل سورت میں بسم اللہ کو مصاحف عثمانیہ میں بحذف الف لکھا ہے اور اقرأ باسم ربك میں بشکل الف ظاہر کیا گیا ہے اگرچہ پڑھنے میں دونوں یکساں بحذف الف پڑھے جاتے ہیں مگر باجماع امت اسی کی نقل و اتباع کرنا ضروری ہے اس کے خلاف کرنا عربی رسم خط میں بھی جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ سرے سے پورا رسم خط غیر عربی میں بدل دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

اور حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے ازالۃ الخفاء میں ایک مہتم بالشان مقدمہ میں بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ قرآن کی جمع و ترتیب اور حفاظت ہمارے ذمہ ہے قال تعالیٰ (اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ) وقال تعالےٰ (اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ) لیکن اس وعدہ الٰہیہ کے ظہور اور حفاظت الٰہیہ کا طریق ظاہر ہے کہ اس طرح منظور نہیں تھا جس طرح انسان اپنے سامان کی حفاظت کرتا ہے اور نہ اس طرح کہ قرآن کسی پتھر کے اندر کندہ ہوجاتا جو مٹانے سے نہ مٹ سکے بلکہ مشاہدہ یہ ہوا کہ حفاظت خداوندی کا ظہور اس طرح ہوا کہ چند بندگانِ صالحین کے قلوب میں ڈالا گیا کہ وہ اس کی جمع اور تدوین کی خدمت انجام دیں اور تمام دنیا کے مسلمان ایک نسخۂ قرآنی پر مجتمع اور متفق

ہو جاویں اور ہمیشہ جماعاتِ عظیمہ اُس کی تلاوت اور تعلیم میں مشغول رہیں۔ تاکہ سلسلہ تواتر نہ ٹوٹ جاوے اور تکمیل اس کی اس طرح ظہور میں آئی کہ عہدِ عثمانی میں بمشورہ و اجماعِ صحابہ تمام مصاحف میں سے ایک مصحف پر اتفاق کیا گیا جس میں قراءات شاذہ نہیں لی گئیں بلکہ قراءت متواترہ لی گئی اور قبائلِ عرب کی سات زبانوں میں سے جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ ایک قریش کی لغت لی گئی اور باقی لغات کے مصاحف متروک کر دیئے گئے جن کا بعد میں کہیں نام و نشان نہیں رہا۔

اس واقعہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو گیا کہ قرآن جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا وہ یہی مصحفِ عثمانی ہے اور یہی قرآن محفوظ من اللہ ہے۔ ورنہ اگر حفاظتِ خداوندی سب مصاحف کے ساتھ متعلق ہوتی تو دوسرے لغات کے مصاحف کا تلف کر دینا کسی مخلوق کی قدرت میں نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن محفوظ صرف وہی ہے جو مصحفِ امام اور مصحفِ عثمانی کہلاتا ہے جو چیز اُس میں نہیں وہ قرآن نہیں اور جو چیز اس میں ہے وہ نہ مٹائی جا سکتی ہے اور نہ اُس میں کوئی ادنیٰ تغیر کرنا جائز ہو سکتا ہے یہی راز ہے اُس اجماع کا جو اوپر نقل کیا گیا کہ مصحفِ عثمانی کے رسم خط کی بھی حفاظت واجب ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے بیان کی چند سطریں یہ ہیں:۔ (ازالۃ الخفاء ص ۲۵ ج ۱)

"لہٰذا محققین علماء بآں رفتہ اند کہ در صلوات و غیر آں خواندہ نشود مگر قراءت متواترہ و قراءت متواترہ آن ست کہ در وے دو شرط بہم آید یکے آں کہ سلسلہ روایت آں ثقۃ عن ثقۃ تا صحابہ کرام متصل شدہ نہ مجرد محتمل خطے دوم آں کہ خط مصاحفِ عثمانیہ محتمل آں باشد زیرا کہ چوں صورت حفظ آں تدوین بین الدفتین و جمع است براں مقرر شد ہر چہ غیر آں ست غیر محفوظ است غیر قرآن ست قال اللہ تعالیٰ قول وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ و قال اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ الآیہ پس قراءت والذکر والانثیٰ شاذ ست در نماز نمی تواں خواند حال آنکہ از حدیث ابن مسعود و ابی درداء صحیح شدہ است و در وقت استنساخ مصاحف عثمانیہ از اہل شیخین ابن عباس با صحابہ دیگر مباحثہ فرمود در تہجی بعض آیات و ختٰی ربک بجائے قضیٰ ربک گفت اولم ییئس بجائے اولم ییئس خواندہ اند و جمعے دیگر التفات نہ تہجی۔ و کردہ قضیٰ ربک اولم ییئس

نوشتند وہماں نسخ در آفاق شائع شد ماہیں قاعدہ دانستیم کہ قول جمع صحیح بود وتحری ابن عباس من باب خطاء المعذور ہم چنیں جمعے از صحابہ تنافس کردند در جمع قرآن ہر یکے مصحفے مرتب نمود وہر یکے ۔ از اہل آں عصر سُوَرِ قرآن را بلغت خود نوشت بر غیر لغتِ قریش حضرت ذی النورین بالہام ربانی محو آں کرد وبریک قرآن ہمہ را جمع نمود در آں وقت باب قیل وقال مفتوح شد ویر دو مات از ہر دو جانب بمیاں آمد چوں تمام عالم بر مصاحفِ عثمانیہ جمع شدند یقین کردیم کہ محفوظ ہماں ست وغیر او مراد الحفظ نبود داگر مراد الحفظ می بر دمخونی شد دیں را ہیچ عاقلے حفظ نشمارد کہ نزدیک امام موہوم الوجود مختفی الحال ادعا کنند کہ نہادہ شدہ است سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

مضمون مذکور کے شواہد اصول تفسیر اور تفسیر کی کتب میں نیز کتب فقہ میں بیشمار ہیں ' ان میں سے چند بقدر ضرورت اس جگہ لکھے جاتے ہیں :۔

علامہ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں رسم خط قرآنی اور کتابتِ قرآنی کے آداب پر مستقل فصل بعنوان (النوع السادس والسبعون) رکھی ہے اس میں نقل کیا ہے۔

وقال اشهب سئل مالك هل يكتب المصحف على ما احدثه الناس من الهجاء فقال لا الا على الكتبة الاولى رواه الدانی فی المقنع ثم قال ولا مخالف له من علماء الأمة

اشہب فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے سوال کیا گیا کہ کیا قرآن مجید کو اس خاص طرز تحریر میں لکھ سکتے ہیں جو آج کل لوگوں نے ایجاد کیا ہے فرمایا نہیں بلکہ اسی پہلی طرز کتابت پر ہونا چاہیئے۔ اس کو علامہ دانی نے مقنع میں نقل کرکے فرمایا ہے کہ علماء میں سے کوئی امام مالک کا اس بارہ میں مخالف نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد لکھا ہے :۔

وقال الامام احمد يحرم مخالفة خط مصحف عثمان فی واو او ياء او الف اوغير ذلك (اتقان ص ۱۶۷ ج ۲)

اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمان کے رسم خط کی مخالفت حرام ہے واو یا ء الف وغیرہ میں (جو کہ تلفظ میں نہیں آتے لیکن لکھنے میں آتے ہیں)۔

پھر لکھا ہے :۔

وقال البیہقی فی شعب الایمان من یکتب مصحفا فینبغی ان یحافظ علی الہجاء الذی کتبوا بہ تلک المصاحف ولا یخالفہم فیہ ولا یغیر مما کتبوہ شیئا فانہم کانوا اکثر علما واصدق قلبا ولسانا واعظم امانۃ منا فلا ینبغی ان نظن بانفسنا استدراکا علیہم۔

اور امام بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں جو شخص قرآن مجید کی کتابت کرے تو ضروری ہے کہ اُس طرز تحریر کی حفاظت کرے جس پر حضرات صحابہؓ نے مصاحف لکھے ہیں اُن کی مخالفت نہ کرے اور جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے کسی چیز میں تغیر نہ کرے کیونکہ وہ زیادہ علم والے اور زیادہ سچے دل اور زبان والے اور زیادہ امانت دار تھے تو ہمارے لئے کسی طرح لائق نہیں کہ ہم اپنے متعلق یہ گمان کریں کہ اُن کی کسی کمی کو ہم پورا کرتے ہیں

اس کے چند صفحہ بعد تحریر فرمایا ہے:۔

وهل تجوز كتابته بقلم غير العربي قال الزركشي لم ار فيه كلاما لاحد من العلماء قال ويحتمل الجواز لانه قد يحسنه من يقرء بالعربية والاقرب المنع كما تحرم قرائته بغير لسان العرب ولقولهم القلم احد اللسانين والعرب لا تعرف قلما غير العربي وقال تعالى بلسان عربي مبين۔

(اتقان ص ۱۷۱ ج ۲)

کیا غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت جائز ہے۔

علامہ زرکشی نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ میں نے اس بارہ میں کسی عالم کی تصریح نہیں دیکھی اور احتمال جواز کا ہے کیونکہ بعض اوقات غیر عربی رسم خط کو وہ عجمی لوگ اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں جو عربی پڑھ تو لیتے ہیں لیکن لکھنے کی قدرت نہیں لیکن اقرب التحقیق یہ ہے کہ غیر عربی رسم خط میں لکھنے کو منع کیا جائے جیسا کہ غیر عربی میں قراءت کو منع کیا جاتا ہے کیونکہ مشہور ہے کہ قلم بھی ایک قسم کی زبان ہے اور عرب بجز عربی رسم خط کے اور کوئی رسم خط نہیں جانتے اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے (بلسان عربی مبین)

اور علامہ حسن شرنبلالی صاحب نور الایضاح جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ مصنف تصانیف کثیرہ اور مذہب حنفی کے معروف مفتی ہیں ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ہے بنام النفحة القدسیة فی احکام قراءة القرآن وکتابتہ بالفارسیة۔ اس میں مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی مستند کتب سے اجماع امت اور ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن کی کتابت میں مصحف امام کے رسم خط کا اتباع واجب ولازم ہے

لاخراج الفاظ القرآن عما كتب عليه واجمع عليه السلف والخلف۔

جائے تو تب بھی قرآن کے الفاظ کا ان کی اجماعی شکل اور قدیم طرزِ کتابت سے نکالنا اس مصلحت کی وجہ سے جائز نہیں ہو سکتا

حافظ الدنیا شیخ الاسلام علامہ ابن حجر رح کی اس تقریر میں اُن تمام شبہات کا بھی پورا جواب ہے جو رسم خط یا زبان بدلنے والے حضرات پیش کرتے ہیں کہ اس میں عجمیوں کے لیے قرآن پڑھنے میں سہولت ہے۔ حافظ نے واضح کر دیا کہ اول تو یہ سہولت کا خیال غلط ہے اور اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سہولت کی خاطر قرآن کی تبدیل و تغییر جائز نہیں ہو سکتی۔

اور حنابلہ کے مشہور فقیہ و امام ابن قدامہ کی کتاب مغنی کے حواشی میں اس کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جب سے قرآن دنیا میں آیا اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی دعوت عجم کے سامنے پیش کی کہیں ایک واقعہ بھی اس کا مذکور نہیں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عجمیوں کی وجہ سے اُس کا ترجمہ کر کے بھیجا ہو یا عجمی رسم خط میں لکھوایا ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب جو ملوکِ عجم کسریٰ و قیصر و مقوقس وغیرہ کی طرف بھیجے جن میں سے بعض کے فوٹو بھی چھپ گئے ہیں اور آج تک محفوظ ہیں اُن کو دیکھا جا سکتا ہے کہ نہ اُن میں عجمی زبان اختیار کی گئی ہے نہ عجمی رسم خط اختیار کیا گیا ہے (حواشی مذکورہ کے چند جملے یہ ہیں)۔

وهو انما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة وانما كان تبليغه والدعوة الى الاسلام والانذار به كما انزل الله تعالى لم يترجم النبي صلى الله عليه وسلم ولا اذن بترجمته ولم يفعل ذالك الصحابة ولا الخلفاء المسلمين وملوكهم ولو كتب النبي صلى الله عليه وسلم كتبه الى قيصر وكسرى ومقوقس بلغاتهم لصح الاستدلال به على ذلك (مغني مع الشرح الكبير ص ۳۰ ج ۱)

اور قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا، جیسا کہ متعدد آیات قرآن میں تصریح ہے، اور اسی عربی زبان میں قرآن کی تبلیغ اور دعوت و انذار عمل میں آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو اس کا ترجمہ کر کے نہیں پہنچایا اور نہ ترجمہ کر کے پہنچانے کی اجازت دی اور نہ حضرات صحابہ نے ایسا کیا اور نہ خلفائے اسلام اور سلاطینِ اسلام نے ایسا کیا اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطوط قیصر و کسریٰ اور مقوقس وغیرہ کو اُن ہی کی زبانوں میں لکھواتے تو یہ دلیل صحیح مانی جا سکتی تھی کہ عجم کو عجمی زبان میں پہنچانا زیادہ مفید ہے۔

اور مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد نے اپنے رسالہ خلاصۃ النصوص الجلیلہ میں رسم خط مصحف عثمانی کے اتباع کو بارہ ہزار صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت کیا ہے اور فرمایا ہے۔ اجمع المسلمون قاطبۃ علی وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفتہ (ثم قال) قال العلامۃ ابن عاشر ووجہ وجوبہ ما تقدم من اجماع الصحابۃ علیہ وھم زھاء اثنی عشر الفا والاجماع حجۃ حسبما تقرر فی اصول الفقہ (نصوص جلیہ ص۲۵)

ایک شبہ کا ازالہ

اگر یہ کہا جائے کہ مصحف عثمانی کا رسم خط تو موجودہ مصاحف عربیہ میں بھی محفوظ نہیں کیونکہ عہد عثمانی میں عام طور پر خط کوفی رائج تھا اُسی خط میں مصاحف عثمانیہ کی کتابت ہوئی تو یہ عربی خط جو آج کل نسخ کے نام سے رائج ہے کوفی رسم خط سے بہت متفاوت ہے تو اس کا جواب ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ کہ کوفی خط اور خطِ نسخ یہ دونوں عربی ہی خط ہیں دونوں میں رسم خط کا کوئی تفاوت نہیں بلکہ ان کے تفاوت کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے اردو خط میں، ایک تو رواں خطوط ہیں جو عام طور پر خط وکتابت اور دفاتر میں مستعمل ہیں ایک اُسی اردو خط کو خوش خط لکھا جاتا ہے جس کو نستعلیق کہتے ہیں ظاہر ہے کہ عام خط وکتابت کے رسم خط اور نستعلیق کے رسم خط میں کوئی فرق نہیں مگر جو حرف نستعلیق میں غلط سمجھا جاتا ہے وہ عام خط وکتابت میں غلط قرار دیا جاتا ہے۔ البتہ حروف کی ہیئت ونشست میں نستعلیق کا فرق ہے جس میں عام خط وکتابت میں بھی ہر شخص کی کتابت دوسرے سے ممتاز نظر آتی ہے ہر شخص کا خط علیحدہ پہچانا جاتا ہے تو جس طرح زید کا خط عمر کے خط سے متفاوت ہے مگر اس تفاوت سے رسم خط نہیں بدلتا یا عام خطوط نویسی اور نستعلیق کی کتابیں متفاوت ہیں مگر دونوں کا رسم خط واحد ہے اسی طرح کوفی خط اور نسخ دونوں کے تفاوت کو سمجھنا چاہیے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں کتابت قرآن کی تاریخ پر کلام کرتے ہوئے اس کو واضح فرما دیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

قلت والذی کان یغلب علیٰ زمان   میں کہتا ہوں کہ سلف کے زمانہ میں عام عادت

...ت مكتوبة بالكوفية ثم هذبها علي بن مقلة الوزير وصار له في ذلك نهج واسلوب ثم قربها علي بن هلال البغدادي المعروف بابن البواب وسلك الناس وراءه وطريقته في ذلك واضحة جيدة۔ (فضائل القرآن ص ۵)

کوفی رسم خط میں لکھے گئے تو پھر علی بن مقلہ نے اس کو کچھ خوبصورت بنا دیا اور تیسری صدی میں ان کا ایک خاص طرز تحریر ہو گیا پھر علی بن ہلال نے اس کو اور زیادہ دلپسند کر دیا اور عام لوگ اسی طرز پر چل پڑے اور ان کا یہ طرز واضح اور عمدہ ہے۔

(فضائل القرآن لابن کثیر ص ۵ طبع مصر)

اور علامہ احمد حسن زیات مصری نے اپنی کتاب تاریخ الادب العربی میں اقسام کتابت کی پوری تاریخ بیان کی ہے جس میں بتلایا ہے کہ دنیا میں خط و کتابت کی اصل فینیقی خط ہے جس سے سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں مختلف قسم کے خط نبطی اور عراق میں خط سریانی پیدا ہوئے اور یہی دونوں خط عربی خط کی اصل ہیں۔ خط نبطی سے شکل نسخی پیدا ہوئی اور خط سریانی سے شکل کوفی پیدا ہوئی جو اسلام سے پہلے خط حیری کے نام سے مشہور ہے۔ عرب شمال نے عموماً خطِ نسخی استعمال کیا کیوں کہ ان کی آمد و رفت شام میں زیادہ رہی اور عرب جنوب نے انبار سے خط کوفی اخذ کیا (تاریخ الادب العربی للزیات ص ۷۶)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ خط کوفی اور نسخی دونوں عربی رسم خط ہی کی دو قسمیں ہیں جیسے۔ دو رسم خط میں نستعلیق اور شکستہ دو قسمیں معروف ہیں جس طرح نستعلیق کو بدل کر شکستہ یا شکستہ سے نستعلیق کر دینا عرف میں رسم خط بدلنا نہیں سمجھا جاتا اسی طرح خط کوفی کے بجائے نسخی یا نسخی کے بجائے کوفی کے استعمال کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ رسم خط کی تغییر نہیں بخلاف انگریزی، ہندی، گجراتی، ٹامل وغیرہ رسم خط کے کہ اس میں بدیہی طور پر رسم خط کی تغییر ہے جس میں حروف کی تقدیم تاخیر یا کمی بیشی وغیرہ بھی نہ ہو جب بھی حسب تحریر مذکور ممنوع و ناجائز ہے اور جبکہ ان میں حروف و کلمات میں بھی کچھ تصرف و تغییر ہو تو وہ کھلی ہوئی تحریف اور باجماع امت حرام ہے۔

اور جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوا ان سب عجمی زبانوں میں بہت سے وہ حروف بالکل نہیں ہیں جو عربی زبان اور قرآن میں موجود ہیں مثلاً (ذ ـ ظ ـ ض) انگریزی، ہندی، ٹامل، گجراتی

زبانوں میں ان حروف کے لئے علیحدہ علیحدہ کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی ہے سب کو ایک ہی شکل سے ادا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بہت بدل جاتے ہیں اس لئے ان زبانوں میں قرآن مجید لکھنا کھلی ہوئی تحریف ہے۔

نیز انگریزی اور ٹامل زبانوں میں تو ایک دوسری تحریف بھی ہے کہ اس میں اعراب حرکات کو بشکل حروف درمیان کلمات لکھا جاتا ہے جس میں حروف کی زیادتی قرآن میں ہوتی ہے جو قطعاً حرام ہے هذا واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اس تفصیل کے بعد اصل سوالات کے جوابات بترتیب نمبرات لکھے جاتے ہیں۔

(۱ و ۲) قرآن مجید اگر اس طرح طبع کیا جاوے کہ ایک صفحہ میں قرآن مجید کا متن عربی مگر رسم خط ٹامل میں لکھا جائے اور دوسرے صفحہ میں ٹامل زبان کا ترجمہ لکھا جاوے تو یہ باجماع اُمت حرام و ناجائز ہے اور تحریفِ قرآن کے حکم میں ہے بوجوہِ ذیل :

(الف) اس لئے کہ ایسا کرنا مصحفِ عثمانی کے رسمِ خط کی تغییر و تبدیل ہے جو باجماع حرام ہے جیسا کہ مفصل مع شواہد کے گذر چکا ہے۔

(ب) ٹامل زبان میں بہت سے ایسے حروف موجود نہیں جو قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں مثلاً (د۔ ذ۔ ض۔ ظ) ان سب حروف کو (جہاں تک احقر کو معلوم ہوا) ٹامل زبان میں ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ ان حروف کے بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں اس لئے ایسا کرنا قرآن مجید کی کھلی ہوئی تحریف ہے۔

(ج) اگر ٹامل رسم خط میں انگریزی کی طرح حرکات زیر و زبر کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے تو یہ ایک دوسری تحریف قرآن ہے کہ حروف کی زیادتی قرآن کے ہر کلمہ میں کی جائے گی۔

(د) اس وجہ سے بھی اس طرح قرآن کی کتابت و اشاعت مکروہ و مذموم ہے کہ اس میں قرآن کو ترجمہ کا تابع بنا دیا گیا ہے جو قلب موضوع اور خلاف ادب ہے۔

(ھ) ایک وجہ اس طرز کے عدم جواز کی یہ بھی ہے کہ اس میں تشبہ ہے کفارِ عجم کے ساتھ جن کا یہ مخصوص رسم خط ہے۔

(و) ایک وجہ یہ بھی کراہت کی ہے کہ بائیں جانب سے شروع کرنا علاوہ تشبہ بالکفار

کہ خود بھی خلافِ سنّت و خلافِ ادب ہے۔

اور اگر قرآن مجید کا صفحہ عربی رسم الخط ہی میں رہے اور اُس کے مقابل صفحہ میں یا دوسرے کالم میں ترجمہ کامل لکھا جاوے تو اس میں اگرچہ تحریف نہیں مگر آخر الذکر تین وجہ عدم جواز کی اس صورت میں بھی موجود ہیں اس لئے یہ بھی ناجائز ہے۔

(۳) بالکل غلط ہے اوّل تو کسی مستند اور معتبر عالم نے ایسا کیا نہیں اور کہیں کیا گیا تو دوسرے علماء نے بھی اُس پر فوراً نکیر کیا ہے۔ حضرت مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ مرقدہ نے ۱۳۲۲ھ میں اس پر بہت مفصل فتویٰ تحریر فرمایا ہے جو امداد الفتاویٰ کے حصہ حوادث الفتاویٰ حصہ دوم ص ۱۹۰ میں شائع بھی ہو چکا ہے نیز حضرت ممدوح کا دوسرا فتویٰ ۱۳۲۵ھ میں شائع ہوا جس میں قرآن مجید ایک کالم میں اور اس کا ترجمہ دوسرے کالم میں لکھنے کی ممانعت مذکور ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سوال

قرآن شریف جس کے ایک ہی صفحہ میں کلام پاک عربی تحریر میں ہو اور اس کے ترجمے انگریزی اُردو یا صرف انگریزی ترجمہ اور انگریزی میں تفسیر ہو رکھنا اور پڑھنا اور چھاپنا درست ہے یا نہیں!

الجواب

اس طرز میں تشبہ ہے غیر اہل اسلام کے ساتھ کیونکہ یہ انھیں کا ایجاد اور انھیں میں شائع ہے اور اہل اسلام میں اس کا ایسا شیوع نہیں ہوا کہ غیر اہل اسلام کے ساتھ اس میں معنی اختصاص کے نہ رہتے ہوں اس لئے منع کیا جاوے گا۔ دوسرے اس ہیئت میں صورت معارضہ و تقابل و موازنہ کی سی ہے چنانچہ جن مضامین میں تقابل و توازن دکھلایا جاتا ہے وہ اسی ہیئت میں لکھے جاتے ہیں اور یہ امر مشاہد ہے اور معارضہ قرآن کا جیسا مذموم ہے اس کی صورت موہومہ بھی مذموم ہے باقی ان اجزاء یعنی ترجمہ و تفسیر کا جمع کرنا اس ہیئت میں بھی ہو سکتا ہے۔

تقابل و توازن اگلے صفحہ میں دیا گیا ہے۔

قرآن شریف
ترجمہ
تفسیر

(منقول از رسالہ دار النوادر ص ۳۲)

نیز ۱۳۵۹ھ میں جب جمعیۃ تبلیغ الاسلام صوبہ متحدہ ناظر باغ کانپور سے قرآن مجید کو ہندی رسم خط میں شائع کرنے کی تجویز ہوئی تو علماء نے مخالفت کی۔ دار العلوم دیوبند میں بھی اس وقت استفتاء اس کے بارہ میں آیا۔ اس وقت احقر دار العلوم کی خدمت فتویٰ انجام دیتا تھا۔ اس سوال کی اہمیت کے خیال سے احقر نے اس کو دار العلوم کی مجلس علمی کے مشورہ میں رکھا مجلس علمی کے صدر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند نے اپنے قلم سے اس پر مضمون ذیل تحریر فرمایا۔

"ہندی رسم الخط میں بہت سے وہ حروف نہیں ہیں جو کہ عربی زبان و قرآن میں پائے جاتے ہیں اور اسی لئے ہندی میں اُن کے لئے کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی ہے مثلاً ذ، ز، ض، کہ ایک ہی شکل سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بدل جاتے ہیں اس لئے قرآن مجید کو رسم الخط ہندی میں لکھنا تحریف ہوگا جو قطعاً حرام و ناجائز ہے۔
۱۴ شعبان ۱۳۵۹ھ"

یہ فتویٰ پوری مجلس علمی کے اتفاق سے لکھا گیا جس میں حضرات ذیل شریک تھے:۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر مدرس دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دار العلوم

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شیخ الحدیث ڈابھیل صدر مہتمم دار العلوم

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مدرس دار العلوم

مذکورالصدر فتویٰ مسئلہ زیر بحث یعنی تامل زبان میں قرآن مجید لکھنے پر بھی حاوی ہے کما لا یخفیٰ۔

تنبیہ:۔ اب تامل زبان کے ترجمہ کی جائز صورت صرف ایک ہے جو مروجہ تراجم

کے لئے معروف [illegible] ہے، قرآن عربی میں [illegible] کر ترجمہ [illegible]
ہر ہر سطر کے نیچے [illegible]۔

دین دار متبع سنت مسلمان کے لئے یہ بیان کافی سے زائد ہے حق تعالیٰ مسلمانوں کو اتباع سلف صالحین کی توفیق اور ہمت عطا فرمائیں اور محدثات امور و فتن سے محفوظ رکھیں آمین۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ الہادی للصواب والیہ المرجع والمآب۔

کتبہ الاحقر محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دیوبند

فی یوم الاثنین خامس شہر المحرم الحرام سنہ ۱۳۶۳ھ

تصدیقات علماء

دار العلوم دیوبند و مدرسہ باقیات صالحات ویلور علمائے مدراس وانمباڑی وغیرہ

اصاب المجیب العلام واجاد فللہ درہ

مسعود احمد عفا اللہ عنہ

دیوبند

ھذا الجواب حق والحق بالاتباع حقیق

سید احمد علی سعید

نائب مفتی دار العلوم

دیوبند

الجواب صواب

محمد ادریس الکاندھلوی

مدرس دار العلوم دیوبند

الجواب صحیح

بشیر احمد عفی لہ

مدرس دار العلوم دیوبند

الجواب

قرآن شریف کی بابت چند امور کی رعایت نہایت ضروری ہے۔

(۱) خلاف تعظیم کلام اللہ کوئی کام نہ کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنا منع ہے ویستحب تطییب المصحف وجعلہ علی کرسی ویحرم توسدہ لان فیہ اذلالا وامتہانا۔ اتقان ج ۲ ص ۱۷۲۔

(۲) رسم مصحف عثمانی کے خلاف تحریر نہ ہو۔ خلاف کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ قال اشہب سئل مالک ہل یکتب المصحف علی ما احدثہ الناس من الہجاء فقال لا الا علی الکتبۃ الاولی رواہ الدانی فی المقنع۔ ثم قال۔ ولا مخالف لہ من علماء الامۃ وقال فی موضع آخر۔ سئل مالک عن الحروف فی القرآن مثل الواو والالف اترٰی ان یغیر من المصحف اذا وجد فیہ کذلک قال لا قال ابو عمر یعنی الواو والالف المزیدتین فی الرسم المعدومتین فی اللفظ نحو اولوا وقال الامام احمد یحرم مخالفۃ خط مصحف عثمان فی الخ وقال البیہقی فی شعب الایمان من یکتب مصحفا ینبغی ان یحافظ علی الہجاء الذی کتبوا بہ تلک المصاحف ولا یخالفہم فیہ ولا یغیر مما کتبوہ شیئا فانہم کانوا اکثر علما واصدق

قلباً ولساناً واعظم امانۃ منا فلا ینبغی ان نظن بانفسنا استدراکا علیھم. قلت وینحصر امر الرسم فی ستۃ قواعد الخ اتقان ص ۱۶۷۔

(۳) بلا ضرورت۔ متعارف امر میں کسی قسم کا تغیر نہ کرنا چاہیئے البتہ بضرورت جائز ہے متقدمین سے قرآن شریف باریک قلم سے لکھنے کی ممانعت ثابت ہے مگر اس زمانہ میں بلا نکیر جائز ہے اسی طرح بعض صحابہ وتابعین سے قرآن شریف میں نقطے فواتح خواتم اعشار اسماء سور وغیرہ لکھنے کی کراہت وممانعت ثابت ہے لیکن بوجہ ضرورت متاخرین کے نزدیک جائز ہے بلکہ بعض کے نزدیک مستحب کذا فی الاتقان۔ بچوں کی ضرورت کی وجہ سے پارۂ عم خلاف مصحف عثمانی بلا نکیر طبع ہو رہا ہے۔ مصحف عثمانی میں ابتدا سورۂ نبا سے ہے اور بچوں کے واسطے سورۂ الحمد والناس سے ابتدا ہے لہٰذا بضرورت ترجمہ مع کلام اللہ کسی زبان میں طبع کرنا اور قرآن شریف کو رسم خط عربی میں لکھنا جائز ہے۔

(۴) جب کہ قرآن شریف کی رعایت رکھ کر ترجمہ بائیں جانب سے ہو سکتا ہے اور اس کے صفحات سیدھے رکھے جا سکتے ہیں بلا ضرورت اس طریقہ سے لکھنا کہ صفحات بائیں جانب سے الٹے جائیں حوالجات بالا سے ممانعت معلوم ہوتی ہے اس لئے اس طریقہ کو ترک کیا جائے۔

(۵) کتابیں وتفسیر کا حکم تحریف قرآن شریف سے علیحدہ ہے اس پر ان کا قیاس کرنا جائز نہیں باوجود رعایت ہو سکنے مصحف عثمانی کے اس کا خلاف جن لوگوں نے کیا ہے گو وہ متقی عالم تھے ان سے اجتہادی غلطی ہو گئی ہے جو شخص اس کا التزام کرتا ہے اور منع کرتا ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ عالم نہیں محض جہالت ہے۔ قرآن مجید کی وضع عثمانی یہی تھی جو کہ اب ہے قال فی الاتقان ص ۶۳ ج ۱۔ وقال ایضاً الذی نذہب الیہ ان جمیع القرآن الذی انزلہ اللہ وامر باثبات رسمہ ولم ینسخہ ولا رفع تلاوتہ بعد نزولہ ہو الذی بین الدفتین الذی حواہ مصحف عثمان۔

البتہ مصحف عثمانی میں ابتدا میں اسماء سور۔ نقاط زیر وزبر پیش اور تینوں کے موجودہ طریق پر نشانات نہ تھے بضرورت بعد میں لکھے گئے اور بلا نکیر جائز سمجھے گئے۔

ما رآہ المسلمون حسناً فہو عند اللہ حسن۔

فاروق احمد مفتی دار العلوم

دیوبند

۲۷ / ۲ / ۶۲ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان شفاء العی السؤال

دار الافتاء بالجامعة الاسلامية

۱۳۴۸ھ

فی دیوبند الھند

الجواب

حامداً اللہ ومصلیاً ومسلماً علی رسولہ وآلہ وصحبہ۔ در صدق صورت

مستفتی قرآن شریف میں مصحف عثمانیہ کے موافق جو ترتیب

ہے اسی ترتیب سے سیدھی جانب سے لکھنا چاہیئے اسی پر آج تک تعامل واجماعِ اُمت ہے اس کے برعکس یعنی بائیں جانب سے لکھنا ناجائز ہے لیکن اطفال کی تعلیم کے لئے صرف ایک جزو اخیر سے جو پڑھایا جاتا ہے جائز ہے (ریاض القراء وغیرہ) علامہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اتقان میں لکھا ہے وان ترتیبہ ونظمہ ثابت علی ما نظمہ اللہ تعالیٰ ورتبہ علیہ رسولہ من آی السور لم یقدم من ذلک مؤخر ولا اُخر منہ مقدم انتہیٰ اھ ، جدی مولانا العلامۃ والحبر الفہامۃ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ نے نثر المرجان فی رسم نظم القرآن میں لکھا ہے لا یجوز مخالفۃ المصاحف العثمانیہ فی الکتابۃ۔ واللہ اعلم۔

مرقوم ۲۷ ماہ محرم ۱۳۶۳ھ

کتبہٗ

محمد حبیب اللہ کان اللہ لہٗ

(سر قاضی مدراس)

المجیب مصیب

فان الکتابۃ بخلاف المصاحف العثمانیۃ

بدعۃ مذمومۃ وفعل شنیع باتفاق الامۃ

محمد غنی عفا عنہ الغنی (مدنی)

اصاب من اجاب

خادم الطلبہ محمد تقی عفا اللہ عنہ العاصم مدرس مدرسہ باقیات الصالحات

اصاب فیما اجاب واللہ اعلم

حافظ محمد اسمٰعیل عفی عنہ

الجواب صحیح — خادم العلم محمد علی سعدی

صح الجواب — عبد العزیز شریف عفی عنہ

الجواب صحیح — عزیز الدین احمد عفی عنہ

المجیب مصیب — عبد الرزاق - باقوی

الجواب صحیح — محمد حسن عفا عنہ المحسن باقوی

الجواب

ھو المصوّب چونکہ قرآن شریف اہل اسلام کے لئے خصوصاً اور ہر ذی علم کے لئے عموماً ادلی الطریق المستقیم ہونا مسلم و متیقن الامر ہونے کے باوجود اس کی زبان عربی ہونے سے عجمی مسلمانان ہند کے مطالب و احکام کے سمجھنے میں قاصر رہے اس لئے اردو فارسی زبانوں میں جن کی تحریر و کتابت مثل عربی کے سیدھے جانب سے ہی ہوتی ہے قرآن شریف کے ترجمہ کو علماء کرام جائز بلکہ مستحسن سمجھ کر ترجمے کئے۔ اسی عذر سے بجز تامل کے اردو فارسی نہیں جاننے والے مسلمانوں کی تفہیم کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ ٹامل زبان میں گو اس کی کتابت بائیں سے ہوتی ہے جائز ہوگا لیکن جب اصل اور مقصود بالذات فہم کلام الٰہی ہی ہے اور ترجمہ مقصود بالغیر اور تابع ہے اس لئے ترجمہ حامل متن رہے اور ترتیب آیات و اجزاء و سورتیں اور کتابت کے رسم الخط میں حسب امام و مولف و جامع القرآن حضرت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مروج ہی نہ رہے بدستور ترجمہ کی طباعت بلحاظ متبوع یمین سے ہی شروع کرکر یسار میں ختم کرنا چاہیئے تا مراتب اصل و فرع و متبوع و تابع بحال رہے اور اہمیت و عظمت شان قرآن مجید میں کمی کا وہم و گمان تک نہ پیدا ہوا۔ فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ کتبہ

شیخ آدم عفی عنہ

مدرس۔ مدرسہ باقیات صالحات ویلور

الجواب صحیح — عبد الرحیم کان اللہ تعالیٰ لہٗ مدرس المدرسۃ

الجواب صواب — محمد عبد الصمد علی عفی عنہ

الجواب صحیح والمجیب نجیح وللہ درہ — محمد ابراہیم عفا اللہ عنہ

مدرسہ معدن العلوم وانمباڑی

اصاب من اجاب — محمد اسماعیل الباقوی

صیانۃ القرآن
عن
تغییر الرسم واللسان

کیا قرآن مجید کا صرف ترجمہ

شائع کیا جا سکتا ہے؟

مقامِ تالیف ________ دیوبند
تاریخِ تالیف ________ محرم ۱۳۶۳ھ
اشاعتِ اوّل ________ حافظ حسن الدین لال دین
خزانہ گیٹ - امرتسر

"کچھ لوگوں نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بغیر متن کے چھاپنا چاہا تھا اس کے متعلق ایک سوال کے جواب میں یہ مقالہ تحریر کیا گیا جس میں مسئلہ کی حقیقت ائمہ اربعہ کے مذاہب کے مطابق بیان کی گئی ہے۔"

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ قرآن شریف کا فقط ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے شائع کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیا صرف ترجمہ چھاپنے والا ہی مجرم ہے یا دوسرے خرید و فروخت کرنے والے بھی۔ ان دنوں پنجاب میں ایک ترجمہ ایسا چھپا ہے جیسے انجیل وغیرہ کا صرف ترجمہ چھپا ہوا ہے۔

الجواب

قرآن مجید کا صرف ترجمہ بغیر عربی الفاظ کے لکھنا اور لکھوانا اور شائع کرنا باجماع امت حرام اور باتفاق ائمہ اربعہ ممنوع ہے جیسا کہ روایات ذیل میں اس کا ناجائز و حرام ہونا مذاہب اربعہ سے ثابت ہے اور جب کہ اس کا لکھنا اور شائع کرنا ناجائز ہوا تو اس کی خرید و فروخت بھی بوجہ اعانت معصیت کے ناجائز ہوگی۔ اس لئے اس کا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا بھی گناہگار ہوگا۔ اور چھاپنے اور شائع کرنے والے کو بھی اپنے عمل کا گناہ ہوگا۔ اور جتنے مسلمان اس کی خرید و فروخت کی وجہ سے گناہگار ہوں گے وہ اس کے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جاوے گا۔ لقولہ تعالےٰ:

ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منہا

روایات جن سے حکم مذکور ثابت ہے حسب ذیل ہیں۔

علامہ حسن شرنبلالی صاحب نور الایضاح جو دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ اور مفتی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کا ایک مستقل رسالہ اسی موضوع پر ہے جس کا نام النفحۃ القدسیہ فی احکام قراءۃ القرآن وکتابتہ بالفارسیۃ ہے اس

میں مذاہب اربعہ سے اس کی حرمت اور سخت ممانعت ثابت کی ہے کہ قرآن مجید کو کسی عجمی زبان میں محض ترجمہ بلا نظم قرآنی عربی کے لکھا جاوے جس کی عبارت یہ ہے۔

واما كتابة القرآن بالفارسية فقد نص عليها في غير ما كتاب من كتب أئمتنا الحنفية المعتمدة منها ما قاله مؤلف الهداية الامام الاجل شيخ مشائخ الاسلام حجة الله تعالى على الانام برهان الدين ابو الحسن علي بن ابي بكر المرغيناني الكبير رحمه الله تعالى في كتابه التجنيس والمزيد ما نصه ويمنع من كتابة القرآن بالفارسية بالاجماع لانه يؤدي للاخلال بحفظ القرآن لانا امرنا بحفظ النظم والمعنى فانه دلالة على النبوة ولانه ربما يؤدي الى التهاون بامر القرآن - انتهى -

ومنها ما في معراج الدراية انه يمنع من كتابة المصحف بالفارسية اشد المنع وانه يكون متعمده زنديقا وسنذكره تمامه۔

ومنها ما في الكافي انه لو اراد ان يكتب مصحفا بالفارسية يمنع

اور رہا قرآن شریف کو فارسی میں لکھنا ہمارے حنفی اماموں کی بہت سی معتبر کتابوں میں اس کے متعلق تصریح ہے۔

(۱) ہدایہ کے مصنف امام اجل اسلام کے شیخ المشائخ حجۃ اللہ علی المخلوق برہان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب التجنیس والمزید میں یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کو فارسی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے کیونکہ یہ قرآن شریف کے حفظ کرنے میں خلل انداز ہے اور ہم لوگ قرآن شریف کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت کے مامور ہیں کیونکہ یہ نبوت کا معجزہ ہے۔ دوسرے یہ بات تلاوت کے باب میں لوگوں کو سست کرتی ہے۔

(۲) معراج الدرایہ میں ہے کہ فارسی میں قرآن شریف لکھنا سخت ترین ممنوع ہے اور قصداً ایسا کرنے والا زندیق ہے اور باقی مضمون ہم آگے لکھیں گے۔

∴ ∴ ∴

∴ ∴

(۳) کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں قرآن شریف لکھنے کا ارادہ کرے تو روک دیا جائے گا

ومنها ما قال فی شرح الهدایة فتح القدیر للمحقق الکمال ابن همام رحمه الله وفی الکافی ان اعتاد القرأة بالفارسیة اواراد ان یکتب مصحفا بها یمنع فان فعل أیة او ایتین لا فان کتب القرآن وتفسیر کل حرف وترجمته جاز۔اھ

(۴) ہدایہ کی شرح کمال بن ہمام کی تصنیف فتح القدیر اور کافی میں ہے کہ اگر کوئی فارسی میں تلاوت کی عادت کرے یا فارسی میں لکھنے کا قصد کرے تو اس کو روک دیا جائے، ہاں اگر ایک دو آیت کرے تو نہ روکا جائے۔ یونہی اگر الفاظ قرآن شریف بھی لکھے اور ہر ہر حرف کا ترجمہ و تفسیر لکھے تو جائز ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭

علامہ محقق ابن ہمام کی عبارت سے اس تفصیل کی بھی تصریح ہو گئی کہ فارسی (یا کسی اور عجمی) زبان میں قرآن کا محض ترجمہ لکھنا جو ممنوع ہے ایک دو آیت کا ترجمہ لکھنا اس میں داخل نہیں بلکہ پورا قرآن یا اس کا کوئی معتدبہ حصہ اس طرح لکھنا حرام ہے۔ نیز یہ کہ اگر اصل عبارت عربی کے نیچے یا حاشیہ وغیرہ پر ترجمہ اور تفسیر لکھی جاوے تو وہ بھی ممنوع نہیں۔

پھر عبارات مذکورہ میں چونکہ بطور مثال فارسی زبان کا ذکر تھا جس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ ممانعت ممکن ہے کہ کسی وجہ سے فارسی زبان کے ساتھ مخصوص ہو اس لئے علامہ شرنبلالی نے روایات مذکورہ بالا نقل کرنے کے بعد فرمایا :۔

قد منا حکایة الاجماع علی منع کتابة القرآن العظیم بالفارسیة و انه انما نص علی الفارسیة لافادة المنع بغیرها بالطریق الاولی لان غیرها لیس مثلها فی الفصاحة و لذا کانت فی الجنة مما یتکلم به کالعربیة کما تقدم (النفحة القدسیة ص ۴)

قرآن شریف کو فارسی میں لکھنے کی ممانعت پر اجماع کو تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اب یہ ہے کہ فارسی کی تصریح اس لئے کی گئی ہے تاکہ دوسری زبانوں میں ممنوع ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جائے کیونکہ کوئی دوسری زبان فارسی سے فصیح نہیں ہے یعنی عربی کی طرح جنت میں فارسی بھی بولا کریں گے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور در مختار میں ہے:۔

وتجوز كتابة اية او ايتين بالفارسية لا اكثر (قال الشامي) والظاهر ان الفارسية غير قيد۔

(شامی ص ۳۵۴ ج ۱)

قرآن مجید کی ایک دو آیت کی کتابت فارسی زبان میں جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں علامہ شامی اس پر لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس میں فارسی زبان کی کوئی قید نہیں (بلکہ مطلق عجمی زبان مراد ہے فارسی ہو ہندی، اردو وغیرہ)

اور کفایہ شرح ہدایہ میں ہے۔

قال الامام المحبوبي اما لو اعتاد قراءة القرآن او كتابة المصحف بالفارسية يمنع منه اشد المنع حتى ان واحداً من اهل الاهواء في زمان الشيخ الامام الجليل ابي بكر محمد بن الفضل كتب فتوى و بعث اليه ان الصبيان في زماننا يشق عليهم التعلم باللغة العربية هل يجوز لنا ان نعلمهم بالفارسية فقال للمستفتي ارجع حتى نتامل ثم استحب ف من حاله فاذا هو كان معروفا بفساد مذهبه فاعطى لواحد من خدمه سكينا فقال اقتله بهذا ومن اخذك به فقل ان فلانا امرني به ففعل فجاء الشرطي اليه وقال

امام محبوبی نے بیان کیا ہے کہ اگر فارسی میں قرآن شریف کی تلاوت یا کتابت کی عادت کر لیں تو اس کو شدت سے منع کیا جائے گا یہاں تک کہ اہل بدعت میں سے ایک شخص نے شیخ امام محمد بن فضل رح کے زمانہ میں ایک فتویٰ لکھا اور اس کو شیخ کے پاس بھیجا کہ ہمارے زمانہ میں بچوں کو عربی میں قرآن پڑھنا شاق ہے تو کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم ان کو فارسی میں پڑھا دیا کریں آپ نے سائل کو فرمایا پھر آنا ذرا غور کر لیں، اور اس شخص کے حال کی تحقیق فرمائی تو وہ فساد مذہب میں مشہور تھا۔ آپ نے اپنے ایک خادم کو چھرا دیا اور فرمایا کہ اس شخص کو اس سے قتل کر دو اور اگر تجھ کو کوئی پکڑے تو کہہ دینا کہ فلاں شخص نے مجھے اس کا حکم کیا تھا اس نے ایسا کر لیا تو سپاہی ان کے

ف هكذا في الاصل و لعل الصواب ثم استخبر - محمد شفيع

ان الامیر یدعوک فذهب الشیخ	پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنین نے بلایا ہے
الیه فقص القصة وقال ان هذا	شیخ گئے اور سارا قصہ بیان کیا اور فرمایا
کان یرید ان یبطل کتاب الله	کہ یہ شخص اللہ کی کتاب کو گم کر دینا چاہتا تھا۔
فخلع له الامیر وجازاه بالخیر	امیر نے آپ کو خلعت اداکیا اور نیک صلہ دیا۔
(ثم قال) وکان الشیخ ابوبکر محمد	شیخ محمد بن فضل فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص عمداً
ابو الفضل یقول امامن تعمد	ایسا کرتا ہے وہ زندیق ہے یا مجنون۔ اگر مجنون
ذلک یکون زندیقا او مجنونا فالمجنون	ہے تو اس کا علاج کیا جائے اور زندیق
یداوی والزندیق یقتل۔	ہے تو قتل کر دیا جائے۔

(حاشیہ فتح القدیر ص ۲۴۹ ج ۱)

یہاں تک یہ سب روایات ائمہ حنفیہ اور معتبر کتب حنفیہ کی تھیں اس کے بعد امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے مذاہب کی روایات حسب ذیل ہیں۔

اما عند الائمة الشافعیة	اور ائمہ شافعیہ کے نزدیک کیا حکم ہے تو ہم
فقد قدمنا عن الامام الزرکشی	نے پہلے امام زرکشی سے جواز کا احتمال اور یہ
رحمه الله احتمال الجواز وان	نقل کر ہی دیا ہے کہ حق کے قریب یہی ہے کہ
الاقرب المنع من کتابة القرآن	فارسی میں قرآن شریف لکھنے کی ایسی ممانعت ہے
بالفارسیة کما تحرم قراءته	جیسے کہ غیر عربی زبان میں تلاوت حرام ہے۔
بغیر لسان العرب اھ	

⁘ ⁘ ⁘

وقد افاد شیخ الاسلام	شیخ الاسلام علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی رح
العلامة بن حجر العسقلانی الشافعی	نے اپنے فتوی میں ایسے لکھنے کے حرام ہونے کو
فی فتاواه تحریم الکتابة وقد	بیان فرمایا ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا
سئل هل تحرم کتابة القرآن الکریم	تلاوت کی طرح غیر عربی زبان میں قرآن شریف
بالعجمیة کقراءته فاجاب بقوله	کا لکھنا بھی حرام ہے تو جواب دیا کہ اس
قضیة ما فی المجموع الاجماع علی	کل کا فیصلہ یہ ہے کہ حرام ہونے پر اجماع ہے

التحریم وذکر التوجیه له وقال
فی محل اٰخر قبل هذا مانصه قال
الزرکشی ویسن تطییبه وجعله
علی کرسی وتقبیله ویحرم مدّ
الرجل الی شئ من القرآن او کتب
العلم ویحرم ایضا کتابته بقلم
غیر العربی انتهی وفیه کلام بینته
فی شرح العباب وقال من جملة
جوابه الاول ما نصه وفی کتابة
القرآن العظیم بالعجمی تصرف
فی اللفظ المعجز الذی حصل التحدی
به بما لم یرو بل ربما یوهم عدم
الاعجاز بل الرکاکة لان الالفاظ
العجمیة فیها تقدیم المضاف الیه
علی المضاف ونحو ذلك مما یخل
بالنظم ویشوش الفهم وقد
صرحوا بان الترتیب من مناط الاعجاز
وهو ظاهر فی حرمة تقدیم اٰیة
علی اٰیة یعنی او کلمة علی کلمة
کتقدیم المضاف الیه علی المضاف
ونحوه مما یحرم ذالك
قراءة فقد صرحوا بان الکتابة
بعکس السور مکروهة وبعکس اٰیات

اور پھر اس کے دلائل بیان فرمائے ہیں اور اس
سے پہلے ایک مقام پر لکھا ہے کہ زرکشی نے
نے فرمایا ہے کہ قرآن شریف کو خوشبو لگانا،
اور رحل وغیرہ پر رکھنا اور بوسہ دینا تو سنت
ہے اور قرآن شریف کے کسی جزو اور علم دین
کی کتابوں کی طرف پاؤں پھیلانا حرام ہے
نیز غیر عربی قلم میں لکھنا بھی حرام ہے مگر اس
میں کچھ کلام ہے جس کو میں نے شرح عباب میں
بیان کیا ہے۔ اور جواب میں یہ بھی کہا ہے کہ
قرآن شریف کو عجمی زبان میں لکھنا ان الفاظ
کو جو خود معجزہ ہیں اور اُن سے مقابلہ کا چیلنج
ہے ایسے لفظوں سے متغیر کرنا ہے جو وارد
نہیں ہوئے بلکہ بسا اوقات اُن سے معجزہ نہ
ہونے کا وہم ہونے لگتا ہے کیونکہ غیر عربی لفظوں
میں مضاف الیہ مضاف پر مقدم ہوتا ہے۔ اور
ایسی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو کلام کی ترتیب
کو مختل اور ذہن میں تشویش پیدا کرتی ہیں
اور علماء نے اس کی تصریح کی ہے کہ ترتیب مدار
اعجاز ہے اور ان کی یہ تصریح ایک آیت کے
دوسری آیت پر یا ایک کلمہ کے دوسرے کلمہ پر
جیسے مضاف الیہ کو مضاف پر یا اسی طرح اور کے
مقدم کرنے کے حرام ہونے میں بالکل ایسے
ہی ظاہر ہے جیسے یہ سب باتیں تلاوت میں بھی

محرمة وفرقوا بان ترتیب السور علی النظم المصحفی مظنون وترتیب الآیات قطعی وزعم ان کتابته بالعجمیة فیها سهولة للتعلیم کذب مخالف للواقع والمشاهدة فلا یلتفت لذلك علی انه لو سلم صدقه لم یکن مبیحا لاخراج الفاظ القرآن عما کتب علیه واجمع علیه السلف والخلف۔

ثم کتب علیه شیخ الائمة الشافعیة بعصرنا ومصرنا هو العلامة شمس الدین محمد الشوبری الشافعی حفظه الله تعالیٰ ما صورته انه اذا کتب بغیر العربیة هل یحرم مسه وحمله اولا الاظهر فی الجواب نعم اذ لا یخرج بذلك عن کونه قرآنا والا لم تحرم کتابته فلیراجع انتهی

حرام ہیں کیونکہ اس کی بھی تصریح ہے کہ ان کی ترتیب سے سورتوں کا لکھنا مکروہ ہے اور آیتوں کو انکی ترتیب سے لکھنا حرام ہے اور وجہ فرق یہ بیان کی کہ قرآن کی ترتیب پر سورتوں کی ترتیب ظنی اور آیات کی ترتیب قطعی ہے اور یہ کہنا کہ غیر عربی میں لکھنے میں تعلیم کی سہولت ہے کذب محض ہے۔ واقع اور مشاہدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قابل التفات نہیں، علاوہ اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ الفاظ قرآن کو اس نہج سے جس پر کتابت ہوئی ہے اور اس پر سلف و خلف کا اجماع ہے نکالنے کو جائز نہیں کر سکتے۔ پھر اس پر ہمارے عصر و شہر کے شیخ الائمۃ الشافعیہ علامہ شمس الدین شوبری شافعی حفظہ اللہ تعالیٰ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ باقی رہی یہ بات کہ اگر غیر عربی میں لکھ لیا جائے تو اس کے چھونے اور اٹھانے کو حرام کیا نہیں تو جواب میں زیادہ ظاہر یہی ہے کہ ہاں کیونکہ اس فعل سے وہ قرآن ہونے سے خارج نہ ہوگا ورنہ پھر اس کا لکھنا بھی حرام نہ ہوتا۔

* * *

* *

وما عند الائمة المالکیة فنعم نقل العلامة ابن حجر فی فتاواه ان الامام مالکا سئل هل یکتب المصحف علی ما احدثه الناس

اور ائمہ مالکیہ کے نزدیک اس لئے کہ علامہ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ لوگوں نے جو یہ نیا طریقہ نکالا ہے الگ الگ توڑ کر کے لکھنے کا کیا اس

من الهجاء فقال لا الا على الكتبة الاولى اى كتب الامام وهو المصحف العثمانى قال بعض ائمة القراء ونسبته الى الامام مالك لانه المسئول عن المسئلة والا فهو مذهب الائمة الاربعة وبمثله قال ابو عمرو۔

طرح لکھا جا سکتا ہے فرمایا نہیں سوائے اس پہلے طریقہ یعنی طریقہ امام کے جو مصحف عثمانی کا ہے اور کوئی طرز جائز نہیں۔ قراءت کے بعض ائمہ نے بیان کیا ہے کہ اس مسئلہ کی نسبت امام مالک کی طرف اس بنا پر ہے کہ ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تھا ورنہ یہ تو ائمہ اربعہ کا مذہب ہے اور ایسا ہی ابو عمرو رح نے بھی فرمایا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

واما عند الائمة الحنابلة فقد قدمنا عن الدراية ما نصه و عند الشافعى رح تفسد الصلوٰة بالقرأة بالفارسية وبه قال مالك واحمد عند العجز وعدمه انتهى (النفحة القدسية ص ۳۵)

اور ائمہ حنابلہ کے نزدیک تو ہم پہلے درایہ سے نقل کر چکے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں اور امام شافعی رح کے نزدیک فارسی میں قراءۃ کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اور یہی امام مالک رح اور امام احمد رح نے عجز و عدم عجز کے وقت کے لئے فرمایا ہے۔

وفى حاشية المغنى لابن قدامة الحنبلى ما نصه استمر الاجماع على قراءة جميع المسلمين القرآن فى الصلوٰة وغيرها بالعربية كاذكارها و سائر الاذكار والادعية الماثورة على كثرة الاعاجم حتى قام بعض المرتدين من اعاجم هذا العصر يدعون الى ترجمة القرآن وغيره من الاذكار بطريق التعبد وانما مرادهم التوسل بذلك الى تسهيل

ابن قدامہ حنبلی کی کتاب مغنی کے حاشیہ میں ہے کہ اس پر اجماع قرار پایا ہے کہ تمام مسلمان نماز میں بھی اور نماز کے علاوہ بھی قرآن شریف کی تلاوت عربی ہی میں کریں جیسے نماز کی اور دعائیں اور ذکر اور سب ادعیہ ماثورہ بھی عربی میں پڑھی جاتی ہیں اور یہ اجماع عجمیوں کی کثرت کے باوجود ہے لیکن اس زمانہ کے عجمیوں میں سے بعض مرتد لوگ اٹھے ہیں اور لوگوں کو ترجمۂ قرآن اور ترجمۂ اذکار کی اور تراجم کو بطور عبادت تلاوت کرنے کی دعوت دینے لگے ہیں اور اس سے ان لوگوں

الردة على قومهم ونبذ القرآن المنزل من عند الله وراء ظهورهم وهو انما نزل باللسان العربي كما هو مصرح في الآيات المتعددة و انما كان تبليغه والدعوة الى الاسلام به والانذار به كما انزل الله تعالى لم يترجم النبي صلى الله عليه وسلم ولا اذن بترجمته و لم يفعل ذلك الصحابة ولا خلفاء المسلمين وملوكهم ولو كتب النبي صلى الله عليه وسلم كتبه الى قيصر وكسرى والمقوقس بلغاتهم لصح التعليل الذي علل به رشيد قال: وقد بين الامام الشافعي في رسالته الشهيرة في الاصول ان الله تعالى فرض على جميع الامم تعلم اللسان العربي بالتبع لمخاطبتهم بالقرآن والتعبد به ولم ينكر ذلك عليه احد من علماء الاسلام لانه امر مجمع عليه وان اهمله الاعاجم بعد ضعف الدين والعلم۔

(مفتی مع الشرح الکبیر صفحہ ۵۳ جلد ۱)

کی غرض اپنی قوم پر مرتد ہونے کو سہل کر دینا ہے اور اس قرآن کو جو اللہ تعالیٰ کے پاس سے نازل ہوا ہے پس پشت ڈال دینا ہے۔ حالانکہ وہ عربی میں نازل ہوا ہے جیسا کہ بہت آیتوں میں ہے۔ اور تبلیغ اس کی، اور اسلام کی طرف دعوت اور انذار اسی سے ہے جیسے اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی ترجمہ خود کر کے بھیجا نہ ترجمہ بھیجنے کی اجازت دی نہ صحابہ اور خلفائے مسلمین اور شاہان اسلام نے ایسا کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر، کسریٰ اور مقوقس کو جو خطوط لکھوائے ہیں اگر وہ ان کی زبانوں میں لکھواتے تو اس فعل کی اس کو علت بنانا صحیح بھی ہوتا۔ اور امام شافعی رح نے اپنے اس رسالہ میں جو اصول فقہ میں ان کا مشہور ہے، بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں پر عربی زبان کا سیکھنا فرض کیا ہے کیونکہ ان کو قرآن مجید کا مخاطب بنایا ہے۔ اور اس کی عبادات کا حکم کیا ہے، وہ عربی ہے لہٰذا عربی لازم ہے، اور امام صاحب پر اس قول کا علمائے اسلام میں سے کسی نے انکار نہیں کیا، کیونکہ یہ ایک اجماعی بات ہے گو بعض عجمیوں نے ضعفِ دین و علم کی وجہ سے اسے چھوڑ رکھا ہے اور مصر کے شیخ القراء شیخ محمد بن علی حداد نے اپنے رسالہ خلاصۃ النصوص

(نقله لي اخي في الله المولى جميل احمد التهانوي)۔

اجمع المسلمون قاطبة على وجوب اتباع رسم مصاحف عثمان ومنع مخالفته (ثم قال) قال العلامة ابن عاشر ووجه وجوبه ما تقدم من اجماع الصحابة رض عليه وهم زهاء اثني عشر الفاً والاجماع حجة حسبما تقرر في اصول الفقه ثم ذكر معزيا لمحكم بسنده الى عبد الله بن عبد الحكم قال قال اشهب سئل مالك فقيل له ارأيت من استكتب مصحفا اليوم اترى ان يكتب على ما احدثه الناس من الهجاء اليوم فقال لا ارى ذلك ولكن يكتب على الكتبة الاولى۔ قال العلامة السخاوي والذي ذهب اليه مالك هو الحق وقال الجعبري وهذا مذهب الائمة الاربعة رض وخص مالكا لانه صاحب فتياه ومستندهم ومستند الخلفاء الاربعة رضوان الله تعالى عليهم۔

نجیہ میں مصحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع پر مستقل ایک باب رکھا ہے جس کی بعض عبارات یہ ہیں۔ مصاحف عثمانی کے رسم الخط کے اتباع کے واجب ہونے اور اس کے خلاف کے ممنوع ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے علامہ ابن عاشر کا بیان ہے کہ واجب ہونے کی وجہ وہی ہے جو گزر چکی ہے یعنی حضرات صحابہ کا اجماع اور یہ حضرات تقریباً بارہ ہزار تھے اور جیسے اصول فقہ میں ثابت ہو چکا ہے۔ اجماع حجت قطعیہ ہے پھر محکم کی طرف منسوب کر کے عبد اللہ بن عبد الحکم تک اپنی سند سے بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ اشہب کا بیان ہے کہ امام مالک سے استفسار کیا گیا جو لوگ آج قرآن شریف کی کتابت کر رہے ہیں ان کے متعلق فرمائیے آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ کو پسند ہے کہ جو نو ایجاد املا ہے ان حرفوں سے لکھنے کے طریق پر قرآن شریف کی کتابت کی جایا کرے فرمایا میں اسے جائز نہیں سمجھتا ان قدیم طرز پر لکھا جائے علامہ سخاوی کہتے ہیں کہ امام مالک کی جو رائے ہے حق یہی ہے اور جعبری کہتے ہیں کہ یہ تو ائمہ اربعہ کا مذہب ہے لیکن امام مالک کی خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ مسائل کے فتویٰ اور تمام لوگوں اور خلفائے اربعہ کے مستند تھے رضوان اللہ تعالیٰ علیہم۔

وقال ابوعمرو الدانی لامخالف لمالك من علماء الامة فی ذلك وقال ایضاً فی موضع اخری سئل مالك عن الحروف فی القرآن مثل الواو والالف اتری ان تغیر من المصحف اذا وجد فیه کذلك قال لا۔ قال ابوعمرو یعنی الواو والالف المزیدتین فی الرسم المعدومتین فی اللفظ نحو اولوا وقال الامام احمد رضی الله عنه تحرم مخالفة خط مصحف عثمانی فی واو والف او یاء اوغیر ذلك

÷ ÷ ÷

وقال البیهقی من کتب مصحفاً فینبغی ان یحافظ علی الهجاء الذی کتبوا به تلك المصاحف ولا یخالفهم فیه ولا یغیر مما کتبوه شیئاً فانهم کانوا (ای الصحابة) اکثر علماً واصدق قلباً ولساناً واعظم امانة منا فلا ینبغی ان نظن بانفسنا استدراکاً علیهم کما فی الاتقان لشیخ مشائخنا الجلال السیوطی رح ثم قال العلامة الحداد فثبت بما ذکر من النقول الصحیحة والنصوص الصریحة انه

ابو عمرو دانی کہتے ہیں علمائے امت میں سے اس باب میں امام مالک سے کوئی اختلاف نہیں رکھتا اور ایک دوسرے مقام پر کہا ہے کہ امام مالک سے قرآن مجید کے حروف کے متعلق جیسے واو اور الف سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن شریف میں بدل دئے جائیں جب کہ مصحف میں ایسے پائے جاتے ہیں - فرمایا نہیں - ابو عمرو دانی کہتے ہیں یعنی وہ واو اور الف جو لکھنے میں زائد آتے ہیں اور پڑھنے میں نہیں آتے جیسے اولوا امام احمد فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کی مخالفت واو، الف یا ء وغیرہ میں بھی حرام ہے -

امام بیہقی رح کہتے ہیں کہ جو شخص قرآن شریف کی کتابت کرنا چاہے تو اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ حرفوں کے اس جوڑ توڑ کی حفاظت کرے جس پر وہ مصاحف لکھے گئے ہیں اور ان کے خلاف نہ کرے اور جیسے جیسے انھوں نے لکھا ہے سر مو نہ بدلے کیونکہ حضرات صحابہ رضا علم میں سب سے زیادہ کامل، صدق قلبی و لسانی میں سب سے بڑھے ہوئے دیانت و امانت میں مرتبۂ اعلیٰ تھے پھر کو روا نہیں ہے کہ اپنے دلوں میں ان کی طرف سے کوئی شبہ قائم کریں یہ اتقان میں ہے جو ہمارے شیخ المشائخ جلال الدین سیوطی رح کی ہے پھر علامہ حداد نے

قد انعقد اجماع سائر الامة من الصحابة وغيرهم على تلك الرسوم وانه لا يجوز بحال من الاحوال العدول عن كتابة القرآن الكريم ولا نشره بصورة تخالف رسم المصاحف العثمانية۔ والله الموفق والمعين انتهى۔	لکھا ہے کہ جو جو نقول صحیحہ اور نصوص صریحہ ذکر کی گئی ہیں ان سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس رسم خط کے وجوب پر اور اس پر کہ قرآن شریف کی کتابت میں کسی حال میں بھی اس رسم الخط سے عدول جائز نہیں اور نہ کسی ایسی صورت سے جو مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط کے خلاف ہو قرآن شریف کا شائع کرنا جائز ہے۔ صحابہ رضہ و غیر صحابہؓ ساری امت کا اجماع ہو چکا ہے واللہ الموفق والمعین
(رسالہ النصوص الجلیة ص ۲۵)	

اور حافظ حدیث امام ابن کثیر رح نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں کتابت قرآن اور اس کی تاریخ پر کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

قلت والذي كان يغلب على زمان السلف الكتابة المكوفة[1] ثم هذّبها على ابن مقلة الوزير وصار له في ذلك نهج واسلوب في الكتابة ثم قربها على بن هلال البغدادي المعروف بابن البواب وسلك الناس وراءه وطريقته في ذالك واضحة جيدة والغرض ان الكتابة لما كانت في ذلك الزمان لم تحكم جيداً وقع في كتابة المصاحف اختلاف في وضع الكلمات من حيث صناعة الكتابة لا من حيث	میں کہتا ہوں کہ زمانہ سلف میں کوفی طرز کتابت غالب تھا پھر علی بن مقلہ وزیر نے اس طرز کو پاکیزہ بنایا، اور کتابت میں اس کا ایک خاص طرز ممتاز ہو گیا، پھر علی بن ہلال بغدادی معروف بابن البواب نے اس کو اور قریب الفہم کر دیا اور دوسرے لوگوں نے اس کا اتباع شروع کر دیا اور اس کا طرز اس باب میں سب سے عمدہ ہے۔ الغرض چونکہ اس زمانہ میں کتابت کا عمدہ طرز نہ ہوا تھا۔ اس لیے مصاحف کے لکھنے میں کتابت کلمات کی صورت میں نہ کہ معانی میں اختلاف رہا اس باب میں لوگوں نے تصنیفات بھی کی ہیں اور امام کبیر ابو عبید قاسم بن

[1] کوفی رسم الخط ۱۲

المعنی وصنف الناس فی ذلك واعتنی
بذلك الامام الکبیر ابو عبید
القاسم بن سلام فی کتابه فضائل
القرآن والحافظ ابو بکر بن داود رح
نبوا علی ذلك ذکرا قطعة صالحة
من صناعة القرآن لیس مقصدنا
ههنا و لهذا نص الامام مالك رح
علی انه لا توضع المصاحف الاعلی
وضع کتابة الامام (فضائل القرآن
ص ۵۱) وقال قبل ذلك و اما
مصاحف العثمانیة والائمة فاشهرها
الیوم الذی فی الشام بجامع
دمشق عند الرکن شرقی المقصورة
المعمورة بذکر الله وقد کان قدیما
بمدینة طبریة ثم نقل منها الی
دمشق فی حدود ثمان عشرة وخمس
مائة وقد رایته کتابا عزیزا
جلیلا عظیما ضخما بخط حسن مبین
قوی بحبر فی ورق اظنه من
جلود الابل والله اعلم زاده الله
تشریفا وتعظیما وتکریما۔ فاما
عثمان رض فما یعرف انه کتب
بخطه هذه المصاحف وانما کتبها

سلام نے اپنی کتاب فضائل القرآن میں اور حافظ
ابوبکر بن داؤد رح نے بہت اہتمام کیا اور اس
بیان کے لئے ابواب مقرر کئے اور قرآن مجید کی
کتابت پر نفیس بحثیں لکھی ہیں جو اس وقت ہمارے
مقصد سے الگ ہیں، اور اسی لئے امام مالک رح نے
تصریح کی ہے کہ قرآن شریف صرف مصحف امام
کی کتابت کے طرز پر ہی لکھا جایا کرے اور اس
کے قبل یہ ہے کہ باقی مصاحف عثمانیہ یا مصاحف
امام توان میں مشہور وہ ہے جو آج دمشق کی
جامع میں رکن کے قریب حجرہ مبارکہ کی مشرقی جانب
میں ہے اور یہاں سے پہلے یہ شہر طبریہ میں تھا،
پھر وہاں سے ۵۱۸ھ کے قریب میں دمشق لایا گیا
میں نے خود اسی کو دیکھا ہے، بڑا بھاری،
عمدہ نفیس جلی اور صاف خط میں دیرپا
روشنائی سے ایسے اوراق میں لکھا ہے
کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ اونٹ کی کھال
کے ہیں۔ واللہ اعلم

لیکن یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت
عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے
قلم سے یہ سب مصاحف لکھے ہوں گے
بلکہ آپ کے عہد میں حضرت زید بن ثابت رض
اور دوسرے لوگوں نے لکھے اور آپ کی
طرف اس لئے منسوب ہوئے کہ آپ کے

زید بن ثابت فی ایامہ وغیرہٖ منسوبۃ الی عثمان لانہا بامرہٖ واشارتہٖ ثم قرئت علی الصحابۃ بین یدی عثمان ثم نفذ الی الآفاق۔

حکم اور اشارہ سے لکھے گئے پھر آپ کے سامنے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پر تلاوت کئے گئے اور پھر چاروں طرف بھیج دیے گئے تھے رضی اللہ عنہم۔

تنبیہ

رسالہ نصوص جلیہ اور فضائل القرآن ابن کثیرؒ اور امام زرکشی سے جو عبارات و نصوص نقل کی گئی ہیں ان سے جس طرح عربی کے سوا کسی اور زبان میں قرآن کریم کی کتابت کو حرام ہونا باجماع امت ثابت ہوا، اسی طرح اس کی حرمت و مخالفت بھی ثابت ہو گئی کہ زبان تو عربی ہی رہے لیکن رسم خط انگریزی یا گجراتی یا بنگلہ یا ہندی وغیرہ کر دیا جائے جیسا کہ اس فتنہ زا زمانہ میں اس کا بھی شیوع ہے کہیں انگریزی رسم خط میں قرآن کریم کی طباعت کی تجویز ہے کہیں ہندی اور گجراتی میں، جو باجماع امت ناجائز ہے بخصوصاً انگریزی اور ہندی رسم خط میں تو کھلی ہوئی تحریف ہو گی کہ ان میں حرکات کو بشکل حروف لکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ ہے کہ اس کو خدمت اسلام سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے لئے بہت سی مصالح دینیہ بیان کی جاتی ہیں جن کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے، نہ ضرورت کیونکہ اول تو وہ مصالح بدون رسم خط بدلنے کے بھی حاصل ہو سکتی ہیں اور ساڑھے تیرہ سو برس سے برابر اسی طرح حاصل ہوتی آئی ہیں کہ ہر ملک و قوم کے لوگوں کو قرآن پڑھایا گیا اور انھوں نے بدون رسم خط تبدیل کرنے کے پڑھا اور اتنا پڑھا کہ شاید اب سارے مسلمان مل کر بھی نہ پڑھ سکیں اور ایسا پڑھا کہ انھیں اہل عجم میں سے بہت سے لوگ قرآن کی قرأت و تجوید اور رسم خط کے امام مانے گئے اور بالفرض اگر وہ مصالح تسلیم بھی کئے جائیں تو ان مصالح مزعومہ کی وجہ سے اجماع امت کا فیصلہ نہیں بدلا جا سکتا اور حفاظت قرآن کی مصلحت پر کسی مصلحت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی یہی وجہ ہے کہ خود حضرت عثمان اور دوسرے صحابہ کرامؓ نے ان مصالح کی طرف

نظر نہیں فرمائی۔ حالانکہ یہ مصالح اس وقت آج سے زیادہ قابل اہتمام نظر آتی تھیں کیونکہ وہ زمانہ تعلیم السنہ کے شیوع کا نہ تھا اب تو ایک ایک آدمی جو معمولی خواندہ کہلاتا مختلف زبانیں سیکھتا اور جانتا ہے اور یہ نہیں کہ اس وقت ان زبانوں میں کتابت کرانا ممکن نہ تھا کیوں کہ خود کاتب قرآن زید بن ثابت رضؓ مختلف زبانیں جانتے تھے مگر اس کے باوجود کتابت قرآن میں خواص عامی مصالح کو نظرانداز کرکے صرف عربی زبان اور عربی رسم خط میں قرآن مجید کے نسخے لکھے اور تمام ممالک میں بھیجے۔

والی اللہ المشتکی مما عمت فیہ البلوی من ایدی اصحاب الھوی و ایاہ نسئل الھدی والتقی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تنبیہ دوم

یہ سوال کوئی آج پیدا نہیں ہوا ہندوستان میں مدت سے یہ رسم بد چل گئی ہے۔ ۱۳۳۲ھ میں قطب عالم مجدد الملۃ سیدی وسندی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے سامنے ایک ایسے ہی اردو ترجمہ بلا عربی عبارت کی اشاعت کے متعلق لکھا گیا تو حضرت ممدوح نے اس کی ممانعت و حرمت پر ایک نہایت مفصل و مدلل فتویٰ تحریر فرمایا تھا جو حوادث الفتاویٰ حصہ دوم ص ۵۶ پر شائع بھی ہو چکا ہے۔ مزید بصیرت کے لئے اس کو بھی بعینہٖ اس کے ساتھ ذیل میں ملحق کیا جاتا ہے۔

واللہ الموفق والمعین

بندہ محمد شفیع دارالعلوم دیوبند

نقل فتویٰ حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ وقدس سرہٗ

سوال ایک مولوی صاحب نے ایک کتاب دکھلائی جس میں محض ترجمہ تھا۔ کلام مجید مینی عربی عبارت کہیں بھی نہ تھی بلکہ انجیل کے ترجمہ وغیرہ کی مانند ایک گورکھپور کے وکیل نے مختلف تراجم قرآن سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ اس پر مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں جناب والا کو لکھوں کہ اس مترجم پر جناب والا کفر کا فتویٰ لگا دیں۔ میں نے عرض کیا کہ تکفیر کا فتویٰ لگانا تو کسی مسلمان پر تاوقتیکہ کوئی امر صریح مکفرہ پایا جائے مناسب نہیں ہاں امر مذموم سے روکنا ضرور ہے سو جناب والا سے گذارش ہے کہ اس امر کے متعلق کچھ ارشاد اور تحریر فرما دیں۔

الجواب

نصوص صحیحہ صریحہ سے تشبہ باہل اباطل خصوص غیر مسلم پھر خصوص اہل کتاب کی مذمت اور اس کا محل وعید ہونا ثابت ہے من تشبہ بقوم فھو منھم میں وعید کا شدید ہونا ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ تشبہ کرنے کو ان ہی میں شمار ہونے کا موجب فرمایا گیا۔ دوسری حدیث لترکبن سنن من کان قبلکم الحدیث میں اس مماثلت کو موقع تشنیع میں ارشاد فرمایا گیا اور یہ بالکل یقینی ہے کہ اس وقت کتاب الٰہی کا ترجمہ غیر حامل المتن جداگانہ شائع کرنا اہل کتاب کے ساتھ تشبہ ہے ایسے امر میں جو عرفاً وعادتاً ان کے خصائل میں سے ہے سو اول تو ان کے ساتھ تشبہ ہی مذموم ہے پھر خصوص جب وہ تشبہ امر متعلق بالدین میں ہو کہ تشبہ فی امر الدنیا وی سے تشبہ فی الامر الدینی اشد ہے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے گوشت شتر چھوڑنے پر آیت یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن نازل ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید

کہ جبتل اور ترہیب کا انکار فرمانا اس کی کافی دلیل ہے، مشکوٰۃ کتاب النکاح و کتاب الاعتصام
نز تتند دواعلی انفسھم الحدیث۔ اور اس میں بھی خاص کر جب کہ ان کو دیکھ کر ان کی تقلید
کی جاوے کہ اتفاقی تشبہ سے یہ اور بھی زیادہ مذموم ہے اور اس وقت اکثر لوگ ایسے کام
انہی لوگوں سے اخذ کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات الانواط کی درخواست
پر کیسا زجر فرمایا تھا یہ تشبہ مذکور خصوص قیدین مذکورین کے ساتھ تو اس میں مفسدہ حالیہ ہے
اور یہ بھی اس کے منع کے لئے کافی ہو جائیگا کہ اس میں مفاسد مآلیہ شدیدہ بھی متحقق ہیں مثلاً
خدانخواستہ اگر یہ طریق مروج ہو گیا تو مثل تورات و انجیل احتمال قوی اصل قرآن مجید کے
ضائع ہونے کا ہے اور حفاظت اصل قرآن مجید کی فرض ہے اور اس کا اخلال حرام ہے
اور فرض کا مقدمہ فرض، اور حرام کا مقدمہ حرام، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ احتمال بعید ہے
محققان دین و مبصران اسلام سے ایسے احتمالات کا اعتبار ثابت ہے، پھر خواہ بعید ہو یا
قریب ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کا لحاظ کریں۔ حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے
بعض قراء کی شہادت کے وقت بعد سرسری مناظرہ کے محض ضیاع قرآن کے احتمال کا
اعتبار کر کے قرآن مجید کے جمع کا اہتمام ضروری قرار دیا تھا حالانکہ قرآن مجید اس وقت بھی
متواتر تھا اور اس کے ناقل اس کثرت سے موجود تھے کہ اس کے تواتر کا انقطاع احتمال
بعید تھا لیکن پھر بھی اس کا لحاظ کیا گیا پس جیسا اس وقت عدم کتابت میں احتمال ضیاع کا تھا
اسی طرح صرف ترجمہ کی کتابت میں اس کا احتمال ہے، اس احتمال کے وقوع کا وہی نتیجہ ہوگا
جیسا حدیث میں ہے۔ امتھوکون انتم کما تھوکت الیہود والنصاریٰ (مشکوٰۃ ص ۳۰) وہ تو یہ مفسدہ ہوگا۔
کتب فقہ میں تصریح فقہاء اس ترجمہ کو بلا وضو مس کرنا جائز نہ ہوگا کما فی العالمگیریہ
ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیۃ یکرہ لھم مسہ عند ابی حنیفۃ رح وکذا
عندھما علی الصحیح ھکذا فی الخلاصۃ (ص ۳۹) وفیہ ایضا اذا قرأ آیۃ السجدۃ
بالفارسیۃ فعلیہ وعلی من سمعہا السجدۃ فھم السامع، مرثہ اذا اخبرانہ
قرأ آیۃ السجدۃ ص ۱۳۳ وھذہ جزئیۃ الثانیۃ تؤید الاولی حیث
وجب سجدۃ التلاوۃ بقرأۃ القرآن بالفارسیۃ فعلم منہ ان الترجمۃ بالفارسیۃ

لاتخرج القرآن عن کونہ قرآناً حکماً فلا یجوز مسہ للمحدث اور یہ یقینی بات ہے کہ عامہ ناس اس ترجمہ کو ایک کتاب خالی از قرآن سمجھ کر ہرگز اس کے مس کے لئے وضو کا انتظام نہ کریں گے تو ایسا ترجمہ شائع کرنا سبب ہوگا ایک امر غیر مشروع کا، اور غیر مشروع کا سبب غیر مشروع ہے۔ اور مثلاً اس کا احترام بھی زیادہ نہ کریں گے اور غیر قابل انتفاع ہونے کے وقت مثل دیگر معمولی کتب کے اوراق کے اس کے اوراق کا استعمال بھی کریں گے تو اس سے یہ بھی ایک محذور لازم آوے گا، اور محذور کا سبب لامحالہ محذور و ممنوع ہے اور مثلاً آج تک امت میں کسی نے ایسا نہیں کیا اور جو کسی نے ایسا کیا تو اس پر انکار کیا گیا چنانچہ میں نے محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم مالک مطبع نظامی سے یہ سنا ہے کہ کسی نے لکھنؤ میں ایسا ہی ایک پارہ چھاپا تھا مگر علماء نے اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دی تو اس شخص نے اس کے اوراق کو قرآن مجید کی دفتیوں میں چسپاں کرا کر پوشیدہ کر دیا اور چنانچہ اس وقت بھی ایسے ترجمہ غیر حامل متن پر علماء کو انکار ہے چنانچہ اس جواب لکھنے کے قبل ایک مجمع علماء سے میں نے ذکر کیا تو ایک نے بھی اس میں نرمی نہیں فرمائی مگر سب نے شدید انکار کیا ہے باوجودیکہ دوسری زبان والے مسلمانوں کو اس قسم کی حاجت بھی واقع ہوئی جس حاجت کی بناء پر ایسا کیا گیا ہے تو باوجود داعی کے تمام علماء امت کا انکار کرنا دلیل ہے اجماع کی اس امر کے مذموم و منکر ہونے پر جس میں یہ احادیث وارد ہیں ان اللّٰہ لا یجمع امتی علی الضلالۃ، وید اللّٰہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار، اتبعوا السواد الاعظم (مشکوٰۃ) اور اب تو قرآن مجید سے کچھ علاقہ بھی ہے اگر ترجمہ سے بھی مدد لیتے ہیں تو اصل بھی ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس بہانہ سے کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں اور پھر تو قرآن سے بالکل بے تعلق اور اجنبی ہو جائیں گے، اور بے ساختہ ان پر یہ آیت صادق آنے لگے گی نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ کِتَابَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ اور مثلاً اب اگر ترجموں میں کچھ اختلاف ہے تو اصل بھی سامنے ہے اس کو سب نسخوں میں متحد پاتے ہیں تو اختلاف کا خیال اصل تک نہیں پہنچتا اور جب ترجمے ہی ترجمے رہ جائیں گے اور اصل نظروں سے غائب ہوگی تو اس وقت یہ اختلاف

کلام اللہ کی طرف منسوب ہوگا۔ بعد چندے یہ گمان ہونے لگے گا کہ اصل حکم ہی مختلف ہے یہ تو اعتقاد پر اس کا اثر ہوگا، اور عمل پر یہ اثر ہوگا کہ ترجموں کو لے لے کر آپس میں لڑیں گے، اور مراجعت الی الاصل کی توفیق ہوگی نہیں جو مدار ہو سکتا ہے فیصلہ کا بس اس آیت کا مضمون ظاہر ہو جاوے گا وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ اور مثلاً اب تو ترجمہ کو مستقل کتاب نہیں سمجھتے قرآن کا تابع سمجھتے ہیں اگر کہیں مطلب نہیں سمجھتے ہیں یا غلط سمجھتے ہیں یا فصاحت و بلاغت سے گرا ہوا پاتے ہیں تو فہم کا یا مترجم کا قصور سمجھتے ہیں، اور مترجم کو مالک دین کا نہیں جانتے نیز کسی مترجم کو ہمت تحریف معنوی کی بھی نہیں ہو سکتی کہ اصل کے سامنے ہونے سے ہر طالب علم اس پر گرفت کر سکے گا اور ایسا ترجمہ اگر ہوا تو اس کو مستقل کتاب سمجھیں گے کسی کا تابع نہ سمجھیں گے اور تمام آثار مذکورہ کی انسداد واقع ہوں گی خصوص مترجمین ہی کا متبوع مستقل ہو جانا یہ سب سے بڑھ کر آفت ہوگی۔ اور اہل زیغ کو بہت آسانی سے موقع غلط ترجمہ اور تفسیر کا ملے گا کیونکہ ہر دیکھنے والے حافظ نہیں ہوتے اور مراجعت اصل کی طرف ہر وقت آسان نہیں ہوتی۔ کما قال۔ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ اور پھر اسی طرح کے اور بھی بہت سے مفاسد ہیں جن کو انشاء اللہ علماء ظاہر کریں گے اسی لئے جابجا لفظ مثلاً بڑھا دیا گیا ہے۔ اس وقت دس ہی وجوہ پر جس کو عشرہ کاملہ کہا جا سکتا ہے اکتفا کیا جاتا ہے مگر کامل تمام ہونا لازم نہیں، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ اور فقہاء نے اس قاعدہ پر یہاں تک تفریع فرمائی ہے کہ جس شخص کو بھیک مانگنا حرام ہے اس کو بھیک دینا بھی حرام ہے کیونکہ اگر دینے والے دیں نہیں تو مانگنے والا مانگنا چھوڑ دے اسی طرح اس ترجمہ کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ ایسے ترجمہ کو اگر کوئی شخص نہ بقیمت لے اور نہ بلا قیمت تو ایسے تراجم کا سلسلہ بند ہو جاوے اور لینے کی صورت میں سلسلہ جاری رہے گا۔ پس ایسے ترجمہ کا خریدنا یا ہدیۃً قبول کرنا، اعانت ہوگی ایک امر ناجائز کی اس لئے یہ بھی ناجائز ہے۔

۲۷ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ۔

ثم بعد منتصف ربیع الاوّل کتب الی مجیبی المولوی ظفر احمد روایة فقهیة جزئیة فی تائید الجواب نصها هکذا ولو قرء بقراءة شاذة لاتفسد صلاته ذکره فی الکافی وفیه ان اعتاد القراءة بالفارسیة واراد ان یکتب مصحفا بها یمنع وان فعل فی آیة وآیتین لا ۔ فان کتب القرآن وتفسیر کل حرف وترجمته جاز ۱۲ فتح القدیر ص ۲۰۱ جلد اول مصریة باب کیفیة الصلوٰة فقط ۔ ثم فتوی سیدی حکیم الامة والله سبحانه و تعالیٰ هو الموفق للسداد ۔ لقد احسن واجاد۔

بندہ محمد شفیع
دیوبند۔ محرم ۱۳۶۳ھ ہجری

(۱) فاروق احمد مفتی دارالعلوم دیوبند

(۲) اصاب المجیب العلام واجاد فیما افاض فلله درہٗ
احقر مسعود احمد عفا اللہ عنہ
دارالعلوم دیوبند
۵ ۲/۱ ھ

(۳) هذا هو الحق الصریح وماذا بعد الحق الا الضلال
محمد ادریس کاندھلوی کان اللہ لہ
وکان هو لله
مدرس دارالعلوم دیوبند

(۴) بلا متن کے قرآن شریف کا مختص ترجمہ چھاپنا ناجائز ہے۔ اس کا پڑھنا اور خریدنا بھی ناجائز ہے اس کے چھاپنے والے کے خلاف مسلمانوں کو ہر ممکن کارروائی کرنی چاہئے اور ایسے شخص کو اس بات پر مجبور کرنا چاہئیے کہ

وہ اس ترجمہ کی اشاعت بند کر دے۔

فقط والسلام

سعید احمد غفرلہ مفتی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

۲۸ محرم سنہ ۶۳ھ

(۵) جواب صحیح ہے

عبدالرحمٰن غفرلہٗ (صدر مدرس)

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

۴ ۲/۶۳ھ

(۶) ظہورالحسن غفرلہٗ

(۷) جواب صحیح ہے

اسعد اللہ۔ مدرس مظاہر علوم سہارنپور

(۸) الجواب صحیح

جمیل احمد

خادم الافتاء خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھونؔ

(ضلع مظفر نگر)

(۹) الجواب صحیح

مولانا عبداللطیف مہتمم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

۳ صفر سنہ ۶۳ ہجری

(۱۰) الجواب صحیح

محمود حسن گنگوہی غفرلہ نائب مفتی مظاہر علوم سہارن پور

۴ ۲/۶۳ھ

(۱۱) للہ در المجیب ما احسن ما اجاب

محمد خلیل عفا اللہ عنہ مفتی مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ

مسئلہ تقلیدِ شخصی

مقام تالیف ——— دیوبند

زمانۂ تالیف ——— ۱۳۲۵ھ

اضافات ——— ۱۳۲۵ھ و ۱۳۵۸ھ

اشاعتِ اوّل ——— ماہنامہ المفتی دیوبند
جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ و
ذی قعدہ ۱۳۶۰ھ

"یہ تقلید کے مسئلہ پر متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ المفتی دیوبند میں شائع ہوتے رہے۔"

مسئلہ تقلید

پر

چند سوالات وجوابات!

یہ سوالات میرے استاذ محترم مفتی اعظم ہند اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مستقل مفتی حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کا عطیہ ہیں جو برماز طالب علمی ۱۳۳۵ھ میں جب کہ احقر دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا ایک طالب علم تھا۔ حضرت ممدوح نے احقر کو جواب لکھنے کے لئے عطا فرمائے تھے اور جواب چونکہ کچھ مفصل ہو گیا تو اس کو دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہ نامہ میں شائع کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے نقل کیا جاتا ہے۔

واللہ الموفق والمعین

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

استفتاء

کیا حکم ہے کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسائل ذیل کے بارہ میں اے علماء کرام تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ بینوا توجروا

(۱) کسی امام مجتہد کی تقلید عام مسلمانوں کے لئے فرض ہے یا واجب یا مباح؟

الجواب

مطلق تقلید فرض ہے بنص قرآن۔

فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ | اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کرلو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ | اللہ تعالےٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اطاعت کرو اور اولو الامر کی اطاعت کرو۔

اَولی الامر کی تفسیر حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور عطاء و مجاہد اور ضحاک و ابو العالیہ اور حسن بصری وغیرھم صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے خلفاء اور علماء و فقہاء سے کی ہے۔ اور خود مولانا صدیق حسن خاں صاحب مرحوم رئیس اہل حدیث اس معنی کو اپنی تفسیر میں قبول کرتے ہیں اور حدیث میں ہے:۔

انما شفاء العی السوال } نہ جاننے والے کی شفاء اس میں ہے کہ جاننے والوں سے دریافت کرے۔

لیکن اب کلام اس میں ہے کہ آیا ہر وہ شخص جس کو لغۃً عرف میں عالم کہا جاتا ہے اس کام کو انجام دے سکتا ہے یا کوئی خاص عالم و فقیہ مُراد ہے۔

علمائے سلف نے ایسے عالم کے لئے جس کی تقلید کرنی چاہئے ایک معیار مقرر کیا ہے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ محدث دہلوی اپنی کتاب عقد الجید میں فرماتے ہیں:۔

الاجتهاد علی ما یفهم من کلام العلماء استفراغ الجهد فی ادراک الاحکام الشرعیة الفرعیة عن ادلتها التفصیلیة الراجعة کلیاتها الی اربعة اقسام الکتاب والسنة والاجماع والقیاس

اجتہاد کی تعریف جو کلام علماء سے سمجھی جاتی ہے یہ ہے کہ خوب محنت کرنا دریافت کرنے میں شریعت کے احکام فرعی کو اُن کی تفصیل دلیلوں سے جن کی کلیات کا آل چار قسم پر ہے۔ یعنی کتاب اور سنت اور اجماع اور قیاس پر۔

(الى ان قال) وشرطه انه لابد ان
يعرف من الكتاب والسنة ما يتعلق
بالاحكام ومواقع الاجماع وشرائط
القياس وكيفية النظر وعلم العربية
والناسخ والمنسوخ وحال الرواة و
لاحاجة الى الكلام والفقه

(ثم قال) ولا باس ان يورد كلام
البغوي في هذا الموضع قال البغوي و
المجتهد من جمع خمسة انواع من
العلم علم كتاب الله عز وجل
و۲علم سنة رسول الله صلى الله عليه
واله وسلم و۳علم اقاويل علماء السلف
من اجماعهم واختلافهم و۴علم اللغة
و۵علم القياس وهو طريق استنباط الحكم
عن الكتاب والسنة اذا لم يجده صريحا
في نص كتاب او سنة او اجماع فيجب
ان يعلم من علم الكتاب الناسخ
والمنسوخ والمجمل والمفسر والخاص
والعام والمحكم والمتشابه و
الكراهة والتحريم والاباحة والندب
والوجوب ويعرف من السنة هذه
الاشياء ويعرف منها الصحيح والضعيف
والمسند والمرسل ويعرف ترتيب

اور اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد والے کو ضرور ہے
کہ قرآن و حدیث اس قدر جانتا ہو کہ جو احکام سے
متعلق ہے اور اجماع کے موقعوں اور قیاس صحیح کی
شرطوں اور نظر کی کیفیت اور علم عربیت اور ناسخ
و منسوخ اور راویوں کے حال سے واقف ہو۔ اور
اجتہاد میں علم کلام اور اصطلاحی علم فقہ کی کچھ حاجت
نہیں اور یہ جو ہم نے اجتہاد کی شرط ذکر کی ہے اصول
کی کتابوں میں مشروح موجود ہے اور کچھ مضائقہ نہیں
کہ بغوی کا قول اس مقام میں یعنی بیان شرط اجتہاد
میں ذکر کیا جاوے۔ بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے
کہ پانچ طرح کے علم کا حاوی ہو۔ اوّل علم کتاب اللہ یعنی
قرآن مجید کا دوّم علم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سوّم علم علماء سلف کے اقوال کا کہ اُن کا اتفاق کس
قول پر ہے اور اختلاف کس قول میں چہارم علم لغت
عربی کا پنجم علم قیاس کا اور قیاس طریقہ حکم کے نکالنے کا قرآن
اور حدیث سے ہے جس صورت میں کہ حکم مذکور صریح
قرآن یا حدیث یا اجماع کے نصوص میں مجتہد نہ پاوے
اب ان پانچوں علموں کی مقدار مفصل معلوم کرنی
چاہیے کہ مجتہد کو ہر ایک علم کتنا سیکھنا چاہیے تو قرآن
کے علم میں سے ان پہلی باتوں کا جاننا واجب ہے
ناسخ و منسوخ مجمل و مفسر خاص اور عام محکم و متشابہ
کراہت اور تحریم اباحت اور استحباب اور وجوب
کو جاننا اور حدیثوں سے ان اشیاء مذکورہ کا

السنة على الكتاب و ترتيب الكتاب
على السنة حتى لو وجد حديثا
لا يوافق ظاهره الكتاب يهتدى
الى وجه محمله فان السنة بيان
الكتاب و لا تخالفه و انما يجب
معرفة ما ورد منها فى احكام الشرع
دون ما عداها من القصص والاخبار
والمواعظ وكذلك يجب ان يعرف
من علم اللغة ما اتى فى كتاب او سنة
فى امور الاحكام دون الاحاطة بجميع
لغات العرب و ينبغى ان يتخرج
فيها بحيث يقف على مرام كلام العرب
فيما يدل على المراد من اختلاف
المحال والاحوال لان الخطاب ورد
بلسان العرب فمن لم يعرف لا يقف
على مراد الشارع ويعرف اقاويل
الصحابة والتابعين فى الاحكام و
عظم فتاوى فقهاء الامة حتى لا
تقع حكمه مخالفا لاقوالهم فيكون
فيه خرق الاجماع واذا عرف من
كل من هذه الانواع معظمه فهو
حينئذ مجتهد ولا يشترط معرفة
جميعها بحيث لا يشذ عنه شئ منها

جاننا اور نیز صحیح حدیث اور ضعیف اور مسند اور مرسل
کا جاننا اور حدیث کا مرتب کرنا قرآن پر اور قرآن کا
حدیث پر جاننا حتیٰ کہ اگر کوئی ایسی حدیث پاوے
جس کا ظاہر موافق قرآن کے نہ ہو تو اُس کی مطابقت
کی صورت کا سُراغ لگا سکے کیونکہ حدیث بیان قرآن مجید
کا ہے مخالف قرآن نہیں کہ مطابقت نہ ہو سکے اور
احادیث میں سے صرف اُن حدیثوں کا جاننا واجب
ہے جو شرعی احکام کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں نہ
ان کے سوا اور حدیثوں کا جاننا جن میں حکایات اور اخبار
اور نصائح مذکور ہیں اسی طرح زبان عربی کے اُن الفاظ
کا جاننا واجب ہے جو قرآن خواہ حدیث کے احکامی امور میں
واقع ہوئے ہیں نہ یہ کہ سب لغت عربی کو جانے اور بہتر
یہ ہے کہ لغت دانی میں اتنی محنت کرے کہ عرب کے کلام سے
مقصود سے واقف ہو جاوے اس طرح کہ اختلاف مواقع
اور حالات کی وجہ سے کلام مذکور سے یہ مُراد ہوتی ہے
اس لئے کہ خطاب شریعت عربی زبان میں وارد ہوا ہے تو
جو شخص عربی نہ جانے گا وہ شارع علیہ السلام کا مقصود
نہ پہچانے گا اور اقوالِ صحابہ اور تابعین سے اس قدر
جانے جو در باب احکام منقول ہیں اور بڑا حصہ ان فتوؤں
کا جانے جو اُمت کے فقہا نے دیئے ہیں تاکہ کسی کا
حکم مخالف سلف کے اقوال کے نہ پڑے ورنہ اس صورت
میں اجماع کی مخالفت ہوگی اور جب ان پانچوں
اقسام کے علموں میں سے بڑا حصہ جانتا ہوگا تو وہ

وَاذا لم يعرف نوعا من هذه الانواع فسبيله التقليد. وان كان متبحرا في مذهب واحد من آحاد ائمة السلف فلا يجوز له تقلد القضاء ولا الترصُّد للفتيا واذا جمع هذه العلوم وكان مجانبا للهوى والبدع متدرعا بالورع محترزا عن الكبائر غير مُصِرّ على الصغائر جاز له ان يتقلد القضاء ويتصرف في الشرع بالاجتهاد والفتوى ويجب على من لم يجمع هذه الشرائط ان يقلده فيما يعنّ له من الحوادث۔

انتهى كلام البغوى

شخص اس وقت مجتہد ہوگا اور یہ شرط نہیں کہ سب علموں کو بالکل جانتا ہو حتی کہ کوئی چیز اُن علوم کی اُس سے باقی نہ رہے۔ اور اگر ان علوم پنجگانہ میں سے ایک قسم سے بھی ناواقف ہو تو اس کی سبیل دوسرے کی تقلید کرنا ہے اگرچہ وہ شخص ایک مذہب میں کسی کے ائمہ سلف میں سے ماہر کامل ہو تو ایسے شخص کو عہدہ قضا اختیار کرنا اور فتویٰ دینے کا امیدوار ہونا درست نہیں۔ اور جس صورت میں کہ ان پانچوں علوم کا جامع اور خواہشات نفسانی اور بدعتوں سے علٰحدہ ہو اور ورع اور تقوی کو شعار بنایا ہو اور کبیرہ گناہوں سے محترز ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ رکھتا ہو تو اُس کو قاضی ہونا اور اپنے اجتہاد سے شرع میں تصرف کرنا جائز ہے اور اس شخص پر جو ان شرطوں کا جامع نہیں تقلید کرنی شخص جامع کی واجب ہے اُن حادثوں میں کہ اس کو پیش آویں۔ تمام ہوا کلام بغوی کا۔

الغرض نصوص متواترہ سے یہ امر تو بالکل محقق ہو گیا کہ جو مسئلہ معلوم نہ ہو اُس میں علماء کی تقلید کرنی چاہیئے اس لئے مطلق تقلید کو تمام محققین اہلِ حدیث بھی واجب تسلیم کرتے ہیں۔ اکثر اہل حدیث مطلق تقلید کی فرضیت کے قائل بھی ہیں۔

اب خوف تقلید شخصی میں رہا (یعنی کسی امام معین کی تقلید ہر مسئلہ اور ہر حکم میں کرنا) یہ علماء اہل سنۃ و الجماعۃ کے نزدیک واجب ہے کیونکہ مطلق تقلید جس کی فرضیت عند الفریقین مسلم ہے اُس کے دو فرد ہیں۔ شخصی اور غیر شخصی اس لئے جائز ہوا کہ اس مطلق فرض کو اُس کے جس فرد میں چاہیں ادا کر دیں۔ تقلید غیر شخصی کر کے بھی اس فریضہ سے ایسے ہی بری ہو سکیں جیسے تقلید شخصی کر کے بری ہوتے ہیں۔

کیونکہ مامور بہ جب مطلق ہوتا ہے تو لا علی التعیین کسی فرد کو ادا کر دینے سے مامور بری الذمہ ہو جاتا ہے دیکھو اگر کوئی شخص اپنے خادم کو حکم کرے کہ کسی آدمی کو بلا لو تو وہ مختار ہے چاہے زید کو بلالے یا عمر کو یا بکر وغیرہ کو وہ جس کو بلالے گا اپنے فرض منصبی سے بری الذمہ ہو جائے گا۔

اسی لئے چونکہ مامور بنص قرآن مطلق تقلید ہے اور اس کے دو فرد ہیں صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں دونوں فرد پر عمل ہوتا رہا کوئی تقلید شخصی کرتا تھا اور کوئی غیر شخصی تقلید شخصی کرنے والے غیر شخصی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرتے اور علیٰ ہذا تقلید غیر شخصی کرنے والے شخصی کرنے والوں کو باطل پر نہ سمجھتے تھے جس کو ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب روایات سے مشاہد کر کے دکھلایا جائے گا۔

الغرض دونوں قسم کی تقلید زمانہ صحابہ و تابعین میں ہوتی رہی لیکن جب دوسری صدی کے اخیر میں دیکھا گیا کہ مذاہب مجتہدین کے بکثرت پیدا ہو گئے۔ بہت کم احکام ایسے باقی رہے جن کے حرمت و جواز میں یا کراہت و استحباب وغیرہ میں خلاف نہ ہو۔ ادھر ابتلائے زمانہ میں ہوا و ہوس کا غلبہ دیکھا گیا وہ رخصتوں کو تلاش کرتے تھے ہر امام مجتہد کا جو مسئلہ اپنی غرض کے موافق ملا اس کو اختیار کر لیا اور باقی کو پس پشت ڈال۔ یہاں تک کہ اندیشہ ہو گیا کہ یہ دین متین ایک خواہشات کا مجموعہ بن جائے اور بجائے اس کے کہ مسلمان اپنے دین کا اتباع کریں۔ اب یہ دین کو اپنی خواہش کے تابع بنا لیں گے اس لئے اس زمانہ کے بزرگ اور دور اندیش علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اب تقلید غیر شخصی میں کتنے بڑے بڑے مفاسد پیدا ہو گئے اور آئندہ اس سے بڑے مفاسد کا اندیشہ ہے اس لئے اس وقت مصلحت شرعی کا تقاضا یہ ہے کہ تقلید غیر شخصی سے لوگوں کو روکا جائے اور سب کو تقلید شخصی پر جمع کر دیا جائے۔

اس پر اجماع منعقد ہو گیا۔ چنانچہ محدث الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ جن کی جلالت قدر اور علم حدیث کا اعتراف محققین اہل حدیث مثل نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کو بھی ہے اپنے رسالہ انصاف میں فرماتے ہیں۔

وبعد المأتين ظهر فيهم التمذهب للمجتهدين بأعيانهم وكان هذا هو الواجب في ذلك الزمان۔

دوسری صدی کے بعد لوگوں میں خاص خاص ائمہ کے مذہب کی پابندی یعنی تقلید شخصی شروع ہوئی اور اس زمانہ میں یہی واجب تھی۔

چونکہ مطلق تقلید کے دو فردوں میں سے تقلید غیر شخصی مضر ثابت ہوئی اس لئے اب فرض تقلید کا ادا کرنا صرف تقلید شخصی میں منحصر ہو گیا اور بوجہ ذریعہ ادا فرض (بثبوت ظنی) ہونے کے واجب ہو گئی۔

تقلید شخصی کے وجوب کی ایک واضح مثال

خلافت راشدہ کے عہد میں

اہل علم پر مخفی نہیں کہ عرب کے قبائل کی زبانیں عربی ہونے میں مشترک ہونے کے باوجود مختلف تھیں۔ جیسے ہندوستان میں پورب پچھم اور دلی لکھنؤ کی زبانیں مختلف سمجھی جاتی ہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ قرآن مجید کو ان ساتوں لغت پر نازل کیا جاوے تاکہ کسی قبیلہ کو شکایت یا پڑھنے میں کلفت نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعاؤ تمنا سے قرآن کریم سات لغت پر نازل ہوا جس کو حدیث کے الفاظ میں سبعة احرف سے تعبیر کیا گیا ہے (مؤطا امام مالک) اور عہد نبوت میں ان ساتوں لغت کے موافق قرآن مجید پڑھا جاتا رہا۔

مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں جب عجم کی فتوحات ہوئیں اور قرآن کریم عجم میں شائع ہوا۔ اس وقت لغات سبعہ کے تفرق کی وجہ سے اہل عجم حیران ہوئے۔ اور اندیشہ ہوا کہ یہ لغت سبعہ جو آسانی کے لئے طلب کئے گئے تھے اب کہیں مشکلات بلکہ تحریف کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ اس لئے جامع القرآن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حکم فرمایا کہ اب قرآن مجید کو صرف ایک ہی لغت میں پڑھا جاوے بقیہ لغت میں پڑھنے و لکھنے کی ممانعت فرمادی اور صحابہ کرام کے پورے مجمع نے اس کو بچشم صواب دیکھا اور نہایت ضروری خیال

کیا کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں کی غرض باجماع صحابہ سبعۃ احرف میں سے حرف واحد پر اقتصار کرنا ضروری اور واجب سمجھا گیا۔

بعینہٖ یہی مثال تقلید شخصی اور غیر شخصی کی ہے کہ قرونِ خیر میں چونکہ اتباع ہوی کا غلبہ نہ تھا وہاں تقلید کی دونوں قسموں میں اختیار تھا جس پر چاہے عمل کرے۔ مگر قرون ما بعد یعنی تیسری صدی کے اوائل میں جب غلبہ ہوا و ہوس مشاہد ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق ہوائے نفسانی لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی تو علمائے وقت نے باجماع یہ ضروری سمجھا کہ تقلید غیر شخصی سے لوگوں کو منع کیا جاوے اور صرف تقلید شخصی ہی واجب سمجھی جاوے ورنہ تقلید غیر شخصی کی آڑ میں لوگ محض اپنے نفس کے مقلد بن جائیں گے جو کہ باجماع امت حرام ہے۔

حافظ ابن تیمیہ جن کو حضرات غیر مقلدین بھی امام مانتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے فتاوٰی میں اس پر اجماع امت کا دعوٰی کیا ہے کہ اپنی نفسانی خواہش کے مطابق سمجھ کر بغرض اتباع ہوا کسی حدیث یا کسی امام کے مذہب کو اختیار کرنا حرام ہے۔

حیث قال فیمن نکح عند شهود فسقة ثم طلقها ثلاثا فاراد التخلص من الحرمة المغلظة بان النكاح كان فاسدا فى الاصل على مذهب الشافعى فلم يقع الطلاق ما نصه وهذا القول يخالف اجماع المسلمين فانهم متفقون على ان من اعتقد حل الشئ كان عليه ان يعتقد ذلك سوء وافق غرضه او خالفه ومن اعتقد تحريمه كان عليه ان يعتقد ذلك فى الحالين وهؤلاء المطلقون لا يقولون بفساد النكاح بفسق الولى الا عند الطلاق الثلاث لا عند الاستمتاع والتوارث يكونون فى وقت يقلدون من يفسده وفى وقت يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوى ومثل هذا لا يجوز باتفاق الامة ثم قال بعد ثلاثة اسطر ونظير هذا ان يعتقد الرجل ثبوت شفعة الجوار اذا كان طالبا لها وعدم ثبوتها اذا كان مشتريا فان هذا لا يجوز بالاجماع وكذا من بنى على صحة ولاية

الفاسق فی حال نکاحہ وبنی علی فساد ولایتہ حال طلاقہ لم یجز ذلک باجماع المسلمین ولو قال المستفتی المعین انا لم اکن اعرف ذلک وانا الیوم التزم ذلک لم یمکن من ذلک لہ لان ذلک یفتح باب التلاعب بالدین ویفتح الذریعۃ الی ان یکون التحلیل والتحریم بحسب الھوا آہ (فتاوی ابن تیمیہ جلد ثانی ص ۲۴۰ و ۲۴۱)

مقلدین پر اعتراض کرنے والے حضرات سوچیں کہ ان حضرات صحابہؓ کو وہ کیا کہیں گے جنھوں نے عوام کی غلطی میں پڑجانے کے خوف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کئے ہوئے سات لغات میں سے صرف ایک کو بتعیین واجب کرکے باقی کو ناجائز قرار دے دیا اور اگر وہ ان حضرات کی طرف سے کوئی توجیہ کرتے ہیں تو کیا مقلدین اُن سے اس کی توقع رکھیں کہ ان کی طرف سے بھی وہی توجیہ قبول کرلی جاوے۔

ایک مسئلہ فقہیہ اسی کی نظیر ایک مسئلہ فقہیہ بھی ہے کہ سبع قرأت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بتواتر منقول ہیں۔ ساتوں قرأتوں میں قرآن کا پڑھنا ہمیشہ معمول رہا ہے لیکن شارح منیہ علامہ حلبی رحہ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ زمانہ جہل و نادانی کا ہے اس لئے بہتر یہ ہے بجز اُس قرأت کے جو اپنے ملک میں رائج ہو دوسری قرأت نہ پڑھی جاوے۔ تاکہ عوام اس مغالطہ میں نہ پڑجائیں کہ قرآن کے الفاظ میں اختلافات ہیں۔

(سوال دوم) تقلید شخصی کب سے شروع ہوئی اور کیوں ہوئی؟ قرون مشہود لہا بالخیر یعنی زمانہ صحابہؓ و تابعین میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ جو شخص کسی مسئلہ سے واقف نہ ہوتا تھا وہ کسی عالم سے مسئلہ پوچھ کر اُس کی تقلید کرکے عمل کرتا تھا اور اس میں تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں کے نظائر اُس عہد مبارک میں ملتے ہیں۔ تقلید غیر شخصی کا چونکہ حضرات اہل حدیث بھی اقرار کرتے ہیں اس لئے اُس کے نظائر جمع کرنے کی ضرورت نہیں صرف وہ چند واقعات لکھے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صحابہ و تابعین میں بھی بعض لوگ تقلید شخصی

کے پابند تھے۔ اور کسی ایک ہی عالم کو اپنا مقتدا بنایا ہوا تھا۔ تمام مواضع خلاف میں اُن کے مذہب کو راجح سمجھ کر اُسی پر عمل کرتے ہیں۔

محدث الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں

اختلف فی کثیر من الاحکام واتبعہ فی ذلک اصحابہ من اھل مکۃ

یعنی حضرت ابن عباس نے جب مکہ میں اقامت فرمائی تو بہت سے مسائل میں دوسرے صحابہ کے خلاف کیا اور بہت سے اہل مکہ نے حضرت ابن عباس رض کے قول کو مرجح بنا کر انھیں کے فتوای پر عمل کیا۔

محل خلاف میں ابن عباس رض کے قول کو ترجیح دینا اور اُن کے فتوی پر عمل کرنا ہی تقلید شخصی ہے۔

نیز حجۃ اللہ ہی میں فرماتے ہیں۔ وکان ابراھیم واصحابہ یرون ابن مسعود رض واصحابہ اثبت الناس فی الفقہ۔

یعنی حضرت ابراہیم نخعی اور اُن کے تلامذہ حضرت عبداللہ ابن مسعود اور اُن کے تلامذہ کو فقہ میں اثبت الناس سمجھتے۔ محل خلاف میں اُنھیں کے قول کو ترجیح دیتے تھے اور تقلید شخصی کا کوئی اس سے زائد مفہوم نہیں۔

اور ابوداود مجتبائی ص ۶۸ عن عمرو بن میمون قال قدم علینا معاذ بالیمن رسول رسول اللہ الی قولہ فالقیت محبتی علیہ فما فارقتہ حتی دفنتہ بالشام میتاً ثم نظرت الی افقہ الناس بعدہ فاتیت ابن مسعود رض فلزمتہ حتی مات الحدیث۔

یعنی عمرو ابن میمون کہتے ہیں کہ جب معاذ ابن جبل رض یمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہو کر تشریف لائے تو میں نے اُن سے محبت کی اور اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک کہ اُن کو شام میں دفن کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اب افقہ الناس کون ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رض کے پاس آیا اور اُن کی خدمت میں رہا یہاں تک کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

الحاصل تقلید زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئی۔ آپ کے حکم سے ہوئی اور پھر صحابہ میں ہمیشہ رہی۔ بعض حضرات نے مطلق تقلید سے کام لیا بعض نے تقلید شخصی سے۔

باقی رہا آپ کا یہ سوال تقلید کیوں ہوئی؟ تو اول تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا امر فرمایا جمہور صحابہ نے اس پر عمل کیا تو پھر ایک مسلمان کے لئے اس سوال کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ "کیوں ہوئی"؟ علاوہ بریں اس کی حکمت کچھ مخفی بھی نہیں کیوں کہ تقلید کا حال علوم دینیہ میں بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ علوم دنیویہ طب و ریاضی و ہیئت کا اور دست کاریوں مثل بخاری و معماری وغیرہ کا کہ ناواقف کو ان سب میں بدون تقلید کسی واقف کے چارہ نہیں۔ ایسے ہی علوم دینیہ میں ناواقف کو بدون تقلید واقف کے چارہ نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

(۳) تقلید صرف ائمہ اربعہ ہی کی کیوں کی جاتی ہے۔ کیا کوئی دوسرا امام اس درجہ کا نہیں ہوا جس کی تقلید کی جائے۔ اور کیا ائمہ اربعہ کی تقلید کا حکم کسی نص میں وارد ہوا ہے؟

ائمہ اربعہ پر سلسلہ تقلید ختم ہونا کوئی امر عقلی یا شرعی نہیں بلکہ محض تفاق ہے کہ مشیت خداوندی سے اُن چار مذاہب کے سوا اور جتنے مذاہب تھے مندرس ہو گئے اور مٹ کر کالعدم ہو گئے۔ دو چار دس بیس یا پچاس سو اقوال و احکام اگر آج اُن کے منقول موجود بھی ہوں تو وہ کوئی مستقل مذہب نہیں بن سکتا۔ کہ لوگ اس کی تقلید کیا کریں کیونکہ اگر ان سو پچاس احکام میں اُن کی تقلید کر بھی لی تو باقی ہزاروں مسائل میں کیا کریں گے۔

اب جب کہ دیکھ لیا گیا کہ کل مذاہب سوائے ان چار مذہبوں کے مندرس ہو گئے تو ناچار سلسلہ تقلید انھیں میں منحصر ہو گیا۔

چنانچہ ابن خلدون اپنے مقدمۂ تاریخ میں ظاہریہ کے مذہب پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ثم درس مذهب اهل الظاهر اليوم بدروس ائمته وانكار الجمهور على منتحليه ولم يبق الا في الكتب المجلدة۔

اور اسی تاریخ ابن خلدون میں یہ بھی مصرح ہے کہ ووقف التقليد في الامصار:

عند هؤلاء الاربعة ودرس المقلدون لمن سواهم وسد الناس باب
الخلاف وطرقه ولما كثر تشعب الاصطلاحات فى العلوم ولما عاق
عن الوصول الى رتبة الاجتهاد ولما خشى من اسناد ذلك فى غيرهم
ومن لا يوثق برأيه ولا بدينه فصرحوا بالعجز والاعواز وردوا الناس الى
تقليد هؤلاء كل من اختص به من المقلدين وحظروا ان يتداول
تقليدهم لما فيه من التلاعب ولم يبق الا نقل مذاهبهم وعمل كل
مقلد بمذهب من قلده منهم بعد تصحيح الاصول واتصال سندها
بالرواية . ولا محصول اليوم للفقه غير هذا ومدعى الاجتهاد لهذا العهد
مردود على عقبيه مهجور تقليده وقد صار اهل الاسلام اليوم على تقليد
هؤلاء الائمة الاربعة انتهى كلامه۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ عقد الجید ص ۳۱ میں فرماتے ہیں: ولما اندرست
المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج
عنها خروجاً عن السواد الاعظم۔

اور شیخ ابن ہمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں انعقد الاجماع على عدم العمل
بالمذاهب المخالفة للائمة الاربعة۔

اور علامہ ابن حجر مکی فتح المبین شرح الاربعین میں فرماتے ہیں اما فی زماننا فقال
ائمتنا لا يجوز تقليد غير الائمة الاربعة الشافعى ومالك وابى حنيفة واحمد
ابن حنبل۔

اور طحطاوی حاشیہ در مختار میں فرماتے ہیں من كان خارجاً عن هذه الاربعة
فهو من اهل البدعة والنار۔

اب کسی کا اس پر یہ دلیل طلب کرنا کہ تقلید چار میں کیوں منحصر ہو گئی محض بے محل ہے
اور بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص کے اولاد کثیر ہو لیکن وہ مرتے رہیں یہاں تک کہ جب باپ
کا انتقال ہو تو چار بیٹوں کے سوا اور کوئی باقی نہ رہے اب ظاہر ہے کہ تقسیم میراث انھیں

چاروں میں منحصر ہوگی۔ حالانکہ اولاد ان کے سوا اور بھی تھی۔ لیکن آپ نے کسی کو یہ کہتے نہ سنا ہوگا کہ میراث انہیں چار میں کیوں منحصر ہوگئی۔ اور جو کوئی کہے تو اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ بھائی مشیت ایزدی یہی تھی۔

ملا جیون صاحبؒ نے تفسیر احمدی میں لکھا ہے والانصاف ان انحصار المذاہب فی الاربع فضل الٰہی وقبولیۃ من عند اللہ لامجال فیہ للتوجیہات و لادلۃ۔ انتہیٰ۔

باقی رہا آپ کا یہ فرمانا کہ کونسی آیت قرآن وحدیث نبوی ان کے نام وارد ہوئی سو یہ ایک عجیب سوال ہے۔ احکام شرع نام بنام وارد نہیں ہوا کرتے ورنہ پھر یہ بتلائیے کہ کونسی آیت قرآنی وحدیث نبوی آپ کے نام سے وارد ہوئی ہے کہ آپ کو روٹی کھانا اور کپڑا پہننا جائز ہے۔ کونسی آیت میں آپ کا نام لے کر یہ بتلایا ہے کہ آپ کو سونا اور اٹھنا بیٹھنا جائز ہے۔ اگر ثبوت احکام میں نام بنام آیت کی ضرورت ہوا کرے تو انشاء اللہ دنیا میں آج نہ کسی پر کوئی چیز فرض واجب رہے گی اور نہ حرام ومکروہ۔ کونسی آیت یا حدیث آپ دکھلائیں گے جس میں آپ کا نام لے کر آپ پر نماز واجب کی گئی ہو۔

اسی طرح مثال مذکور میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ چار بیٹوں کو جو میراث دی گئی ہے کونسی آیت یا حدیث ان کے نام بنام وارد ہوئی ہے۔ ہرگز نہیں۔ البتہ حکم عام سب کے لیے موجود ہے سو وہ دربارۂ تقلید ائمہ بھی موجود ہے جیسا کہ اوپر گذرا مثل قول باری تعالےٰ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ کیونکہ ائمہ اربعہ بلا شک اہل ذکر میں سے ہیں۔

سوال نمبر۴

جو شخص ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مقلد نہ ہو اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

ایسے شخص کی امامت فی نفسہٖ تو جائز ہے مگر چونکہ اس زمانہ میں جو لوگ ائمہ مجتہدین کی

تقلید نہیں کرتے اور بزعم خود حدیث پر عمل کرنے کے مدعی ہیں اُن کے بعض افعال ایسے ہیں جو مفسد صلوٰۃ ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ لوگ ڈھیلے سے استنجا نہیں کرتے اور اس زمانہ میں قطرہ کا آنا عموماً یقینی ہو گیا ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کے پاجامے اکثر ناپاک ہوتے ہیں بایں وجہ اُن کی امامت سے احتراز چاہیئے فقط

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ العبد الضعیف

محمد شفیع عفا اللہ عنہ

مدرس دار العلوم دیوبند ۱۳۳۵ھ ہجری

مسئلہ تقلید

پر

حضرت قاسم العلوم والخیرات نور اللہ مرقدہٗ کا محققانہ تبصرہ

تقلید کی بات سنئے۔ لاریب دین اسلام ایک ہے اور چاروں مذہب حق مگر جیسے فن طبابت یونانی یا ڈاکٹری انگریزی ایک ہے اور سارے طبیب کامل قابل علاج اور ہر ایک ڈاکٹر قابل معالجہ ہے اور پھر وقت اختلاف تشخیص اطباء یا مخالفت رائے ڈاکٹران جس طبیب کا علاج یا جس ڈاکٹر کا معالجہ کیا جاتا ہے ہر بات میں اُسی کا کہنا کیا جاتا ہے دوسرے طبیب کی یا دوسرے ڈاکٹر کی رائے نہیں سُنی جاتی ایسی ہی وقت اختلاف ائمہ جس مجتہد کا اتباع کیا جائے ہر بات میں اُسی کی تابعداری ضروری ہے۔ ہاں جیسی کبھی ایک طبیب یا ڈاکٹر کا علاج چھوڑ کر دوسرے کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور پھر بعد رجوع ہر بات میں دوسرے کا تابع مثل اول کیا جاتا ہے ایسے ہی کبھی کبھی بعض بزرگوں نے زمانہ سابق میں کسی وجہ سے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیا تھا اور

بعد تبدیل مذہب ہر بات میں دوسرے ہی کا اتباع کیا یہ نہیں کیا کہ ایک بات ان کی لی
اور ایک بات اُن کی لی اور تدبیر سے ایک لامذہبی کا پانچواں مذہب گھڑ لیا۔ امام طحاوی
جو بڑے محدث اور فقیہ ہیں پہلے شافعی تھے پھر حنفی ہو گئے تھے بالجملہ بے تقلید کام
نہیں چلتا۔ یہی وجہ ہوئی کہ کروڑوں عالم اور محدث گذر گئے پر مقلد ہی رہے۔ امام ترمذی
کو دیکھیے کتنے بڑے عالم اور فقیہ اور محدث تھے۔ ترمذی شریف اُنہیں کی تصنیف
ہے باوجود اس کمال کے مقلد ہی تھے اعتبار نہ ہو تو ترمذی شریف کو دیکھ لیجئے جب
ایسے ایسے عالم اس کمال پر مقلد ہی رہے امام شافعیؒ کی تقلید امام ترمذی نے کی اور
امام طحاوی اور امام محمد اور امام ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ کی تقلید کی ہو پھر آج ایسا
کونسا عالم ہوگا جس کے ذمہ تقلید ضروری نہ ہو۔ اگر کسی بڑے عالم نے اماموں کی تقلید
نہ کی بھی تو کیا ہوا۔ اور اول تو کروڑوں کے مقابلہ میں ایک دو کی کون سنتا ہے جس
عاقل سے پوچھو گے یہی کہے گا کہ جس طرف ایک جہان کا جہان ہو وہی بات ٹھیک
ہوگی۔

بایں ہمہ یہ کونسی عقل کی بات ہے کہ اس بات میں عالموں کی چال ہم اختیار کریں
یہ ایسی بات ہے کہ کوئی مریض جاہل کسی طبیب کو مرض کے وقت دیکھے کہ اپنا علاج
آپ کرتا ہے اور دوسرے طبیب سے نہیں پوچھتا یہ دیکھ کر یہ بھی یہی انداز اختیار کرے
کہ اپنا علاج اپنے آپ کرنے لگے اور طبیبوں سے کام نہ رکھے تو تم ہی کہو ایسے آدمی کو عقلمند
کہیں گے یا بے وقوف۔ سو ایسے ہی کسی عالم کو غیر مقلد دیکھ کر جاہل اگر تقلید چھوڑ
دیں تو یوں کہو علم تو تھا یا نہ تھا عقل دیتے بھی دشمنوں ہی کو نصیب ہوئی۔ اور جاہلوں
کو جانے دیجئے آج کل کے عالم یقین جانئے کل نہیں تو کئی جاہل ہی ہیں بلکہ بعض عالم تو
جاہلوں سے بھی زیادہ جاہل ہیں دو کتابیں اردو کی بغل میں دبا کر وعظ کہتے پھرتے ہیں اور
علم کے نام خاک بھی نہیں جانتے کیسے کہ علم تھا تو ہو کہ ہر علم کی ہر ایک کتاب [illegible] کر
پڑھا سکے۔

باقی رہی تراویح اس میں جو آج کل عالموں نے تحقیق نکالی ہے یعنی بیس کی [illegible]

ہیں تو ہر ایک کو بوجہ آسانی یہ بات پسند آتی ہے پر یہ بات کوئی نہیں سمجھتا کہ آٹھ رکعتیں جو حدیث میں آئی ہیں تو وہ تہجد کی رکعتیں ہیں تہجد اور چیز ہے اور تراویح اور چیز۔ تراویح کی بیس ہی رکعتیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہزارہا صحابہ تھے اُس زمانے سے لے کر آج تک کسی نے بیس رکعت میں حجت نہ کی تھی مگر آج کل ایسے ان پڑھ امی عالم پیدا ہوئے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کی بھی غلطی نکالی سبحان اللہ یہ منہ اور مسور کی دال۔

باقی یہ کہنا کہ حضرت عمرؓ سے پہلے بیس رکعتیں نہیں پڑھتے تھے یہ خیال خام ہے۔ یہ بات اتنی بات سے کیونکر نکل آئی کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیس کا اہتمام شروع ہوا۔ دیکھئے پہلے زمانہ میں نکاح ثانی کا اس لئے چنداں اہتمام نہ تھا کہ اس نکاح کو اتنا بُرا نہ سمجھتے تھے جب شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ دیکھا کہ اس امر خیر کو آج کل معیوب سمجھنے لگے انھوں نے اس کا ذکر اپنی تصانیف میں کیا آخرکار اُن کی اولاد اور اُن کے شاگردوں نے اس کو جاری کرنے میں کمر باندھی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نکاح ثانی شاہ ولی اللہ صاحب اور اُن کے خاندان کا ایجاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بات نہیں۔ ایسی ہی بیس رکعت کو حضرت عمرؓ اور اُن کے زمانہ کے صحابیوں کا ایجاد نہ سمجھئے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سمجھئے ورنہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضرت عمرؓ سُنّی نہ تھے اُن کے زمانہ کے صحابی سنّی نہ تھے سب کے سب نعوذ باللہ بدعتی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مٹا دیا اپنی سنت جاری کر دی اب تھی بتاؤ حضرت عمرؓ اور اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بُرا سمجھنے والا کون ہوتا ہے۔

میاں جیو صاحب حضرت عمرؓ اور اصحاب رضی اللہ عنہم کی پیروی کا حکم صحیح صحیح حدیثوں میں موجود ہے۔ ایک دو حدیث لکھے دیتا ہوں انھیں مولوی صاحب سے ان کا ترجمہ کرا لینا جو آٹھ رکعت گاتے پھرتے ہیں۔ ایک حدیث تو یہ لیجئے۔ علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین من بعدی دوسری لیجئے اقتدوا بالذین من بعدی تیسری لیجئے اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم فقط۔

امام الائمہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

کے متعلق

حفاظ حدیث اور ائمہ اسلام کے چند اقوال

از

امام حدیث ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ

امام اعظم ابو حنیفہؒ کی جلالت قدر اور فضائل و مناقب سے شاید کوئی شخص جس نے کسی مسلمان گھرانے میں پرورش پائی ہو بے خبر نہیں ہو گا۔ ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ تفقہ فی الدین اور شان امامت سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کر سکتے جو امام صاحب پر طعن و تشنیع ہی کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن بہت سے لکھے پڑھے مگر کم علم و کم فہم لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ حضرت امام صاحبؒ کو حدیث میں وہ پایہ اور مرتبہ حاصل نہ تھا جو دوسرے ائمہ کا امتیازی وصف سمجھا گیا ہے۔ بہت سے علم حدیث اور عمل بالحدیث کے مدعی جو امام ہمام پر طعن و جرح کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم صرف اسی راستہ سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ علم حدیث اور فن روایت میں امام اعظم رحؒ کا مرتبہ گھٹایا جائے لیکن انھیں یاد رکھنا چاہئے :-

چراغے را کہ ایزد برفروزد — کسے کو تف زند ریشش بسوزد

اس مختصر مضمون میں نہ امام موصوف کی سوانح بیان کی جا سکتی ہے نہ وہ تمام اقوال و شہادات جو ائمہ حدیث اور علماء سلف و خلف سے حضرت امامؒ کی شان میں منقول ہیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ ہماری غرض اس وقت اس مقالہ کا پیش کرنا ہے جو اس باب میں امام حدیث ابو عمرو بن عبد البرؒ شارح موطا مالکی المذہب نے اپنی کتاب جامع العلم میں تحریر فرمایا ہے۔ امام ابن عبد البر رحؒ تیسری صدی ہجری کے اُن علماء میں سے ہیں جن پر اندلس و قرطبہ کے علم کا مدار سمجھا گیا ہے۔ آپ ۳۶۸ھ میں قرطبہ میں پیدا ہوئے وہیں علم دین حاصل کیا پھر

اندلس کے مختلف شہروں میں قاضی رہے آپ کی بے شمار تصانیف حدیث، وفقہ اور تاریخ میں اپنے اپنے فن کی روح سمجھی گئی ہیں۔ آپ فقہ میں امام مالکؒ کے مقلد ہیں حنفی مذہب نہیں۔ اس لئے آپ کا کلام امام اعظم ابو حنیفہ رحؒ کے بارہ میں اور بھی زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اسی لئے بہتر یہ معلوم ہوا کہ ان کے اصل عربی کلمات بھی درج مضمون کئے جائیں اور ترجمہ دوسرے کالم میں رہے۔ واللہ المستعان

(قال ابو عمرؒ) افرط اصحاب الحدیث فی ذم ابی حنیفۃ وتجاوزوا الحد فی ذلک والسبب الموجب لذلک عندھم ادخالہ الرأی والقیاس علی آثار واعتبارھما واکثر اھل العلم یقولون اذا صح الاثر بطل القیاس والنظر وکان ردہ لما رد من اخبار الآحاد بتاویل محتمل وکثیر منہ قد تقدمہ الیہ غیرہ وتابعہ علیہ مثلہ ممن قال بالرأی وجل ما یوجد لہ من ذلک ما کان منہ اتباعا لاھل بلدہ کابراھیم النخعی واصحاب ابن مسعود الا انہ اغرق وافرط فی تنزیل النوازل ھو واصحابہ والجواب فیھا برأیھم واستحسانھم فاتی منھم فی ذلک خلاف کثیر للسلف وشنع ھی عند مخالفیھم بدع وما	امام ابو عمرو بن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ بعض اصحاب حدیث نے امام ابو حنیفہ رحؒ کی مذمت میں سخت زیادتی کی ہے اور حد سے تجاوز کر گئے اور سبب اس کا ان کے نزدیک یہ ہے کہ امام موصوف نے حدیث و آثار میں رائے و قیاس کو دخل دیا ہے، اور اکثر اصحاب حدیث یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو قیاس باطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ امام موصوف نے جن اخبار آحاد کو ترک کیا ہے وہ کسی ایسی تاویل کی وجہ سے کیا ہے جس کی ان اخبار میں گنجائش تھی، پھر امام موصوف اس عمل میں منفرد بھی نہیں بلکہ ان سے پہلے دوسرے ائمہ نے بھی [illegible] اور ان کے بعد بھی [illegible] جو کچھ حدیث میں قیاس کو دخل [illegible] ابراہیم نخعی اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے شاگرد [illegible] کے مسائل میں [illegible] کثرت ہے [illegible] نے بہت سے مسائل کی صورتیں [illegible] ان سے جو بات [illegible] حدیث [illegible] اپنے قیاس سے [illegible]

اعلم احدا من اهل العلم
الادلة تاويل فى اية اومذاهب
فى سنة رد من اجل ذلك
المذهب سنة اخرى بتاويل
سائغ او ادعاء نسخ الا ان لابى
حنيفة من ذلك كثيرا وهو
يوجد لغيره قليل - وعن الليث
بن سعد انه قال احصيت على
مالك بن انس سبعين مسئلة
كلها مخالفة سنة النبى صلى الله
عليه وسلم مما قال مالك فيها
برايه قال ولقد كتبت اليه اعظه
فى ذلك (قال ابو عمر) ليس لاحد
من علماء الامة يثبت حديثا عن
النبى صلى الله عليه وسلم ثم يرده
دون ادعاء نسخ عليه باثر مثله
او باجماع او بعمل يجب على اصله
الانقياد اليه او طعن فى سنده و
لو فعل ذلك احد سقطت عدالته
فضلا ان يتخذ اماما ولزمه اثم
الفسق ولقد عافاهم الله عز و
جل من ذلك (ونقموا ايضا على ابى
حنيفة الارجاء ومن اهل العلم

پر عمل نہیں کیا تھا اس لئے امام صاحب کے مخالفین
نے اس فعل کو بدعت قرار دیا۔ وہ عظیم الشان خدمت گم
ہو گیا۔ بہرحال امام صاحب نے جو قیاس اور رائے سے جتنی
جزئیات فقہیہ میں کام لیا اس میں وہ متفرد و تنہا نہیں بلکہ
ہر کسی اہل علم کو بھی ایسا نہیں پاتا جس نے آیات میں کسی
آیت کو اور احادیث میں سے کسی حدیث کو بنا مذہب و
مختار قرار دے کر دوسری آیت اور حدیث میں تاویل نہ
کی ہو یا نسخ کا دعویٰ نہ کیا ہو البتہ اس قسم کی چیزیں
امام صاحبؒ کے مذہب میں زیادہ اور دوسروںؒ کے
مذہب میں کم ہیں۔ حضرت لیث بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے
امام مالکؒ کے ستر مسائل ایسے شمار کر رکھے ہیں جو بالکل
حدیث کے خلاف ہیں امام مالکؒ نے محض اپنی رائے
سے وہ ارشاد فرمائے ہیں اور میں نے وہ مسائل بتاتے
ہوئے خود ہی نصیحت خود امام مالکؒ کی خدمت میں بھیج دیے
تھے۔ امام ابو عمر ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ علماء امت
میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
کسی حدیث کا سند درست ہونا ثابت مانے اور پھر اس کو رد کر دے
جب تک کہ ایسی ہی کسی دوسری حدیث یا اجماع و تعامل
سے اس کا منسوخ ہونے کا دعویٰ نہ کرے یا اس کی
سند میں کوئی جرح نہ کرے اور اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ بلا عذر
مذکور کسی حدیث کو رد کر دے تو اس کی عدالت ساقط ہو جائے گی
اور فسق کا گناہ ہوگا ایسا آدمی امت کا امام کیسے بن سکتا ہے
مگر حق تعالیٰ نے تمام ائمہ دین کو اس آفت سے محفوظ رکھا ہے

من ينسب الى الارجاء كثير لم
يعن احد بنقل قبيح ما قيل فيه
كما عنوا بذالك فى ابى حنيفة لامامته
وكان ايضا مع هذا يحسد وينسب
اليه ما ليس فيه ويختلق عليه
مالا يليق به وقد اثنى عليه
جماعة من العلماء وفضلوه ولعلنا
ان وجدنا نشطة ان نجمع من
فضائله وفضائل مالك ايضا والشافعى
والثورى والاوزاعى كتابا املنا
جمعه قديما فى اخبار ائمة
الامصار ان شاء الله - وعن
ابن عباس بن محمد الدورى
قال سمعت يحيى بن معين يقول
اصحابنا يفرطون فى ابى حنيفة
واصحابه فقيل له اكان
ابو حنيفة يكذب فقال كان
انبل من ذلك - وعن مسلمة
بن شبيب قال سمعت احمد
بن حنبل يقول راى الاوزاعى

ابوحنیفہ کی مذمت کرنے والوں نے ان کو مرجیہ کی طرف بھی منسوب
کیا ہے اور نہ صرف امام موصوف کو بلکہ ائمہ دین میں سے بہت سے
دوسرے حضرات پر بھی یہی الزام لگایا گیا ہے۔ مگر اس الزام
کی وجہ سے جس قدر زبان درازی امام موصوف کے بارہ میں
کی گئی ہے وہ دوسرے لوگوں کے متعلق نہیں کی گئی اور اس
کا سبب یہ ہے کہ وہ مدت کے مشہور امام ہیں (دوسرے
اتنے مشہور نہیں) اور باوجود ان باتوں کے بعض لوگ
ان کی مذمت کرتے ہیں اُن کی خداداد مقبولیت عامہ کی وجہ
سے لوگ ان سے حسد بھی رکھتے ہیں اور بہت سی ایسی چیزیں
ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جو ان کے اندر نہیں ہیں اور
ان کی شان کے خلاف اُن پر تہمتیں باندھی جاتی ہیں اور علماء
اہل حق کی بڑی جماعت نے ان کی مدح کی ہے اور اُن کو
اوروں پر فضیلت دی ہے اور اگر ہمیں فرصت ملی
تو انشاء اللہ تعالیٰ امام موصوف اور امام مالک و شافعی اور
ثوری اور اوزاعی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم کے فضائل کو ایک مستقل
کتاب میں جمع کریں گے۔ اور عباس بن محمد دوری رح فرماتے ہیں
کہ میں نے حضرت یحییٰ بن معین رح سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے
کہ ہمارے اصحاب امام ابوحنیفہ رح اور اُن کے شاگردوں
کے بارہ میں بہت زیادتی کرتے ہیں کسی نے ان سے سوال کیا
کہ کیا امام ابوحنیفہ رح روایت میں سچے تھے یحییٰ بن معین رح نے

عـ۵ ابتداء کتاب میں جو مقدمہ مصنف رح کے حالات کے متعلق ناشر کتاب کی جانب سے لکھا ہوا ہے اس سے
معلوم ہوا کہ امام ابن عبد البر رح نے یہ کتاب تصنیف فرمائی جس کی ضخامت آٹھ جلدوں میں ہے مگر افسوس ہے کہ اس امام
حدیث کی عرق ریزی کا یہ عظیم الشان نتیجہ اب اس قدر مفقود و نایاب ہے کہ کسی کتب خانہ میں اس کا موجود ہونا معلوم نہیں ۱۲ منہ

ورای مالک ورای ابی حنیفة کله رای وهو عندی سواء و انما الحجة فی الآثار۔ وعن الدراوردی اذا قال مالک و علیه ادرکت اهل بلدنا والمجتمع علیه عندنا فانه یرید ربیعة بن ابی عبد الرحمٰن و ابن هرمز وذکر محمد بن الحسین الازدی الحافظ الموصلی فی الاخبار التی فی اٰخر کتابه فی الضعفاء قال یحیی بن معین ما رایت احدا اقدمه علی وکیع وکان یفتی برای ابی حنیفة وکان یحفظ حدیثه کله وکان قد سمع من ابی حنیفة حدیثًا کثیرًا۔ قال الازدی هذا من یحییٰ بن معین تحامل ولیس وکیع کیحییٰ بن سعید وعبد الرحمٰن بن مهدی وقد رای یحیی ابن معین هؤلاء وصحبهم قال وقیل لیحیی بن معین یا ابا زکریا ابو حنیفة کان یصدق فی

فرمایا کہ وہ اس سے باہر ہیں اور مسلم بن شبیبؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ قیاس امام اوزاعی کا اور قیاس امام مالکؒ کا اور قیاس امام ابو حنیفہؒ کا سب قیاس ہی ہے اور وہ سب میرے نزدیک برابر ہیں اور حجت آثار ہی میں ہے اور امام دراوردی کہتے ہیں جب امام مالک کسی مسئلہ کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کے علماء کو اس کے موافق پایا ہے تو اُن کی مراد ان علماء اور مجمع سے ربیعہ ابن ابی عبد الرحمٰن اور ابن ہرمز وغیرہ ہوتے ہیں اور محمد بن حسین ازدی موصلی جو حفاظ حدیث سے ہیں اپنی کتاب الضعفاء کے آخر میں فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن معینؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا جس کو امام وکیع پر مقدم اور افضل سمجھوں اور اس کے باوجود وہ فتویٰ امام ابو حنیفہ کے قول پر دیا کرتے تھے اور ان کی تمام حدیثیں انھیں یاد تھیں اور انھوں نے امام ابو حنیفہؒ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں۔ حافظ ازدی کہتے ہیں کہ وکیعؒ کے بارہ میں جو کچھ یحییٰ بن معینؒ نے فرمایا ہے یہ اُن کا تسامح ہے ورنہ یحییٰ بن سعید اور عبد الرحمٰن بن مہدی وکیع سے افضل تھے اور یحییٰ بن معین ان سب حضراتؒ کی خدمت میں رہے ہیں۔ یحییٰ بن معین سے دریافت کیا گیا کہ کیا امام ابو حنیفہؒ حدیث کے بارہ میں صدوق (سچے) و صحیح بیان کرنے والے تھے؟ فرمایا ہاں!

الحديث قال نعم صدوق وقيل له فالشافعي كان يكذب قال ما احب حديثه ولا ذكره (قال ابو عمرؒ) لم يتابع يحيى بن معين احد في قوله في الشافعي وقال الحسن بن علي الحلواني قال لي شبابة بن سوار كان شعبة حسن الرأي في ابي حنيفة وكان يستنشد في ابيات مساور الوراق۔

اذا ما الناس يوماً قايسونا
بآبدة من الفتيا لطيفه

وقال علي بن المديني ابو حنيفة روى عنه الثوري وابن المبارك وحماد بن زيد وهشيم ووكيع بن الجراح وعباد بن العوام وجعفر ابن عون وهو ثقة لا باس به وقال يحيى بن سعيد ربما استحسنا الشئ من قول ابي حنيفة فناخذ به قال يحيى وقد سمعت من ابي يوسف الجامع الصغير ذكره الازدي (قال ابو عمرؒ) الذين

وہ صدوق ہیں۔ پھر ان سے پوچھا گیا امام شافعیؒ روایتِ حدیث میں سچے نہ تھے تو فرمایا کہ مجھے ان کی حدیث پسند نہیں اور نہ ان کا ذکر پسند کرتا ہوں (ابو عمرؒ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں) کہ امام شافعی رحؒ کی حدیث کو ساقط کرنے کے بارہ میں کسی نے یحییٰ بن معین کی موافقت نہیں کی اور حسن بن علی حلوانیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت شبابہ ابن سوارؒ نے فرمایا کہ امام حدیث شعبہؒ امام ابو حنیفہ رحؒ کے بارہ میں اچھی رائے رکھتے تھے اور مجھ سے مساور ورق کے اشعار جو امام موصوف کی مدح میں ہیں سنا کرتے تھے۔ امام حدیث علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحؒ سے سفیان ثوری۔ عبد اللہ بن مبارک۔ حماد بن زید۔ ہشیم اور وکیع بن جراح اور عباد بن عوام۔ جعفر بن عون جیسے ائمہ حدیث نے حدیث حاصل کی ہے وہ (بلا شبہ) ثقہ ہیں ان میں کوئی کمی نہیں۔ امام حدیث یحییٰ بن سعید رحؒ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ہمیں امام ابو حنیفہؒ کے اقوال پسند آتے ہیں تو ہم انھیں کو اختیار کرتے ہیں اور بیان کیا کہ امام ابو یوسف رحؒ تلمیذ امام ابو حنیفہ رحؒ سے میں نے جامع صغیر پڑھی ہے۔

یہ تمام روایات حافظ ازدی نے بیان کی ہیں۔ امام ابو عبد البر رحؒ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں

رووا عن ابی حنیفة ووثقوه و
اثنوا علیه اکثر من الذین
تکلموا فیه والذین تکلموا فیه
من اهل الحدیث اکثر ما عابوا
علیه الاغراق فی الرای والقیاس
والارجاء وکان یقال یستدل
علی نباهة الرجل من الماضین
بتباین الناس فیه قالوا الا تری
الی علی بن ابی طالب انه هلك
فیه فئتان محب افرط ومبغض
افرط وقد جاء فی الحدیث
انه یهلك فیه رجلان محب
مفرط ومبغض. وهذه صفة
اهل النباهة ومن بلغ فی الدین
والفضل الغایة والله اعلم
(مختصر جامع العلم لابن عبد البر
رحمة الله علیه ص ١٩٢)

نے امام ابو حنیفہ رح سے روایت کی اور ان کی توثیق
فرمائی اور ان کی مدح وثنا کی وہ اُن لوگوں
سے زائد ہیں جنھوں نے ان کے بارہ میں کچھ کلام
کیا ہے (وہ بھی کسی واقعی عیب کی وجہ سے نہیں)
بلکہ صرف اس لئے کہ انھوں نے (ایسے مسائل میں
جن میں کوئی نص قرآن وحدیث میں وارد نہیں)
قیاس سے کام لیا اور ان کی طرف ارجاء کی نسبت
کی گئی ہے اور یہ بات ہمیشہ سے کہی جاتی ہے کہ،
متقدمین میں کسی شخص کے بارہ میں لوگوں کا مختلف
رائیں رکھنا اُس شخص کی جلالت قدر اور عظمت
شان کی دلیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ
وجہہ کا واقعہ خود اس کی دلیل ہے کہ ان کے بارہ
میں دو قسم کے لوگ تباہی میں پڑ گئے۔ ایک ان سے
محبت رکھنے والے جنھوں نے افراط محبت کی
وجہ سے حدود شرعیہ سے تجاوز کیا۔ دوسرے وہ جو بغض
رکھنے والے جو حدود شرعیہ سے تجاوز کر گئے یہی مضمون
حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ
کے بارہ میں محبت سے حد سے بڑھنے والے اور عداوت رکھنے والے ہلاک ہوں گے اور جن لوگوں
کو حق تعالے دین میں عظمت وجلالت اور بزرگی نصیب فرماتا ہے ان کی یہی شان ہوتی
ہے۔ (مختصر جامع العلم ص ١٩٤)

تقلید شخصی

کے متعلق قطب عالم فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد قدس سرہٗ گنگوہی

کا

ایک مکتوب گرامی مشتمل بر تحقیق انیق

"ذیل کا مکتوب قطبِ عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے کاغذات سے برآمد ہوا تھا اور صاحب زادہ حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم سے احقر نے حاصل کر لیا تھا کیونکہ وہ بہت سے علمی جواہرات پر مشتمل ہے یہ مکتوب اس زمانہ کے ایک صاحب تصنیف بڑے عالم کے شبہات کے جواب میں ہے۔ افسوس کہ اصل خط جس کے جواب میں یہ والانامہ تحریر فرمایا گیا ہے دستیاب نہیں ہوا جس سے جواب کا مضمون پوری طرح واضح ہوتا لیکن اہل علم کے لئے اب بھی مطلب سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں ہو سکتی افادہ اہلِ علم کے لئے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق والمعین"

از بندہ رشید احمد

مولوی صاحب سلمہٗ۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔

آپ کا خط دیکھ کر بے ساختہ یہ شعر یاد آیا؎

مرا خواندی وخود بدام آمدی نظر پختہ تر کن کہ خام آمدی

آپ نے خوب مباحثہ کیا ہے کہ خود ہی فریفتہ ہو گئے۔ بندہ آج کل نہایت عدیم الفرصت ہے لکھنا دشوار ہے۔ کاش تم حاضر ہوتے تو اچھی طرح تقریر ہو جاتی۔

قولہ تقلید شخصی کو واجب سمجھنا بدعت سیئہ ہے۔

اقول آپ کے نزدیک تقلید شخصی مباح ہے چنانچہ آپ اوپر مقر ہوئے ہو۔ مگر مباح ہونے کے آپ معنی نہیں سمجھے کہ کیا ہیں۔ سنو تو سہی تم نے تو منقول اور معقول دونوں کو دھو دیا ہے۔ نفس تقلید اعنی تقلید مطلق تو فرض بقولہ تعالیٰ فَسْئَلُوا الخ

اور حدیث انما شفاء العی السوال ۔ اور خود بدیہی بھی کہ دین بدون سیکھے نہیں آتا عقل وحس کو اس میں دخل ہی نہیں پس مطلق تقلید تو فرض ہے یقیناً جب کہ آپ بھی قبول کریں گے ۔ ورنہ اثبات اس کا کر دیا جاوے گا ۔ اور اس کے دو فرد ہو دیں گے تقلید شخصی اور تقلید غیر شخصی کیونکہ دونوں حصے ایک جنس کے ہیں ۔ خواہ اس کو جنس اور دو نوع کہو یا مطلق اور دو فرد مقید کہو ۔ خواہ کلی اور دو جزئی کہو ۔ جس طرح چاہو مقرر کرو ۔ بہر حال ہر دو نوع تقلید تحت تقلید مطلق کے ہو دیں گی جو فرض ہے ۔ بھلا آپ سے پوچھتا ہوں کہ فرض کے نوع یا فرد مباح کس طرح ہوئے ۔ مرد خدا فرض اور مباح تو مباین دو نوع ہیں کہ تحت جنس حکم کے ہیں پھر ایک نوع مباین دوسری نوع کی فرد کس طرح ہو گئی ذرا تو سوچو تقلید مطلق تو فرض اور شخصی مباح اور حالانکہ یہ فرد ہے تقلید فرض کی ۔ پس تمام آپ کا خدشہ اس ہی خطاء فہم پر مبنی ہے ۔ پس ہوش کرو کہ تقلید ہر دو قسم فرض ہے کوئی مباح نہیں ۔ مگر چونکہ امتثال امر تقلید میں تخییر ہے کہ جس فرد کو چاہو ادا کرو دوسرے کی ضرورت نہیں اور جو دونوں نہ کرو گے تو عاصی ہو گے ۔ اس تخییر کو مباح کہہ دیا ہے مجازاً نہ یہ کہ خود شخصی بذاتہ مباح ہے اُس کی ایسی مثال ہے کہ کفارہ میں حنث کے مثلاً نفس کفارہ فرض ہے اور اطعام اور کسوۃ اور رقبہ میں تخییر جس کو ادا کر دیا مطلق کفارہ سے برائت ہو گئی ۔ اور جو کسی کو نہ کیا عاصی رہا ۔ علی ہذا مطلق اُضحیہ واجب اور بکرا اور سُبع بقر و ابل اور پھر نر یا مادہ وغیرہا جزئیات میں خیار جس فرد کا آتی ہوا ۔ آتی فرض ہی کا ہوا مباح کوئی بھی نہیں سب فرض ہیں مگر ایک کے اتیان سے سب سے بری ہو جاتا ہے ۔ یہی حال جملہ کلیات کا ہے کہ مطلق شرعی فرض ہوتا ہے اور مباح کہنا اس کا باعتبار اباحت اختیار کسی فرد کے ہے نہ مباح مقابل فرض کہ آپ نے شبہ فرض ہو جانے مباح کا بے موقعہ کیا ۔ ورنہ اگر یہی شبہ ہے تو شخصی والے اس ہی آپ کی تقریر سے غیر شخصی کو بدعت سیئہ کہہ دیویں گے کیونکہ غیر شخصی جس طرح فرض ہوتی ہے وہ بھی تو مباح بہمیں معنی ہے جو مذکور ہوا ۔ اور شاہ ولی اللہ رحمہ نے کہاں کہا ہے کہ غیر شخصی کے وجوب پر اجماع منعقد ہوا تا کہ مقابل نوع اُس کے حرام ہو کیونکہ وجوب کا مقابلہ حرمت

سے ہوتا ہے۔ اگر فرضاً یہ کہا ہے تو شخصی مباح کس طرح ہو گی بلکہ حرام ہوئی۔ اور یہی کوشش غیر مقلدین کی ہوئی ہے۔ بلکہ (شاہ صاحب نے) یہ فرمایا ہے کہ قرون ثلثہ میں باجماع جائز رہی ہے پس جواز سے دوسری نوع مقابل کی کراہت کس طرح ثابت ہو گئی۔ امکان ذہن نوپہنچا ہی ہو گا اور شرع میں ایک فرد کلی کے جواز سے دوسرے فرد کی کراہت کہاں ثابت ہے۔ جواز انجیہ شاۃ سے جو صحابہ میں شائع رہا۔ شبع بقر حرام کیونکر ہوا۔ بلکہ کلی کے حکم سے سب فرد جائز ہیں اور تعامل فرد واحد سے دیگر افراد مرتفع نہیں ہوتے۔ مساوی الاقدام رہتے ہیں پس اگر یہ قاعدہ ذہن نشین ہو گیا ہے تو سوچو کہ جیسے آپ کے نزدیک شخصی مباح ہے ایسے ہی غیر شخصی بھی مباح ہی ہے۔ اور جیسا کہ غیر معین کہ غیر شخصی مرادف اس کی ہے آپ کے نزدیک واجب ہے ویسے ہی معین کہ شخصی اس کی مرادف ہے واجب ہی ہے اور حق یہی ہے کہ دونوں واجب ہیں اور اباحت دونوں میں بمعنی تخییر ارتکاب جدا ہے اور بس۔ اپنی ذات میں دونوں فرض ہیں تو آپ کا شبہ ترکاؤ خورد ہوا۔ ب دوسرے جملہ کو بیان کرنا بھی بطور اعتراض کے نذر رہے۔

قولہ۔ اور جو آمین بالجہر و رفع یدین الخ لاریب اگر موافق مسلک عمار کے یہ امور بوجہ عمل بالحدیث کے کرے گا اس سے لڑنا حرام ہے مگر جو بوجہ تلہی و ہوائے نفسانی کرے گا اور فتنہ اندازی کی وجہ سے تو اس سے لڑنا عین دین ہے کہ رفع فساد واجب ہے۔ یہ بھی بدیہی ہے اگر اس میں شبہ ہو از پس واضح کیا جائے گا۔ اب حاجت نہیں سمجھی گئی۔

قولہ۔ پھر تفرد عوام کے خوف سے تقلید شخصی کو الخ عزیزا بدعت سیئہ جب ہوتا کہ شخصی بذاتہ مباح ہوتی وہ بذاتہ حق تعالیٰ اور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرض بنائی ہوئی ہے مثل غیر معین کے اگر بوجہ سہولت کے یا عدم تحریر مذاہب کے شیوع غیر معین کا رہا تو معدد زمد قرون ثلثہ سے منصوص فرض مباح کس طرح بن گیا اور کس طرح اس کا التزام بدعت ہو گیا۔ اور کیوں خود التزام قرون ثلثہ کا خلاف تخییر نص کے ایک فرد کو بدعت نہ ہوا اگر غیر معین کا التزام بدعت نہیں تو معین کا کیسے بدعت ہوا۔ اور جو معین کا بدعت ہے تو غیر معین کو کیا وجہ

کہ بدعت نہ ہو۔ نفس میں دونوں برابر۔ فرضیت میں دونوں مساوی۔ عمل میں بہر دو یکساں
عجب العجاب ہے۔ اگر وجوب عمل غیر معین پر اجماع ہوا ہے تو کہیں ہم کو بھی مطلع کر دو۔
ہم نے آج تک دیکھا نہ سنا نہ عقل قبول کرے کہ اللہ تعالیٰ کسی کلی حکم کے ایک فرد کو
التزاماً عمل امت بفرد دیگر حرام کر دیوے اور عوام جو اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کلی کے ایک فرد
کا التزام کریں کہ ملتزم قرون سابقہ کے وہ نہ تھے بلکہ دوسرے فرد کے ملتزم تھے تو عوام
بیچارے مبتدع ہو گئے کہ کیوں خلاف عمل قرون سابقہ کے خدا نے تعالیٰ کے حکم پر چلے۔ لا
حول ولا قوۃ الا باللہ۔ بھائی اس کو اگر کوئی تم سے پوچھے کہ قرون ثلثہ کا عمل خدا تعالیٰ کے
حکم قرآنی کا ناسخ ہے اور یہ شرک ہے یا نہیں تو کیا جواب دو گے۔ ایسی حماقت سے مقلدین
کو غیر مقلدین مشرک بنا کر خود مشرک ہوئے اور خبر نہیں ہوئی کہ الٹ وہ طوق شرک اپنی ہی
گردن میں آن پڑا ذرا سنبھل کر دیکھنا۔

قولکم۔ پس اس صورت میں عوام کو تنبیہ الخ

اقول:۔ بے شک تنبیہ چاہئے کہ ایسا عقیدہ فاسد نہ کریں بلکہ دونوں کو شق
مساوی الاقدام جان کر جس کو چاہیں عمل کریں بشرط عدم تعدی و عدم فتنہ و فساد۔ اگر ممکن ہو مگر
بے شک ظاہر ہے کہ فساد سے خالی نہ ہوگا۔ خوشی تو کر سکتے ہیں مگر عدم فساد سے ہرگز
خالی نہ رہیں گے۔ اپنے مزے کو آج جو روحلال اور کل حرام۔ ایک روز منصب حلال اور
دوسرے روز ناپاک خبیث۔ خوب قہقہے ہوں گے کہ ہمارا دین مذہب دہریوں کا مذہب۔
اب بھی نصاریٰ ہندو اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہب کا ٹھکانا نہیں۔ پھر خود اہل
اسلام عوام بھی ایسا کریں گے ذرا جزئیات کو سوچ کر دیکھیں۔ اگر شبہ رہے تو چند لکھ دیں۔
صورت لکھ دوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قولکم۔ جیسے اور رسوم شادی غمی کی الخ

اقول:۔ مثال غلط ہے رسوم فی ذاتہ مباح تھی نہ فرض نہ تحتم اس کو دوسرے کیا
مناسبت ہے۔ یہ آپ کی بنا رفع الفساد علی الفساد ہے مباح کو واجب بنا کر حرام اور حرام
سے منع کرنا واجب۔ واجب میں فساد کا خوف درست نہیں۔ ورنہ کار خود ہا اول ہو بیٹھی

یا ثالث عند التوقان واجب اور بخدشۂ زنا فرض اُس کا ترک حرام باوجود قدرت کے تو نکاح
ثانی کا اجرا بھی واجب ہے اور واجب کا ترک بخدشۂ عوام درست نہیں اور تاکید نکاح
ثانی رفع فساد کے واسطے ہے کہ زنا ہے اور وہ مشہود ہے پس آپ کی نظر نے بالکل بے محل
نفس عزوبت کو دیکھ لیا اُس کے ثمرۂ لازم کو نہ دیکھا اگر نکاح میں بھی کوئی دوسرا امر قائم مقام
نکاح ثانی کے ہو کر دافع زنا ہو جاتا تو اُس کی بھی وہ ہی صورت ہوتی مگر یہاں تو سوائے نکاح
کے کوئی چارہ ہی نہیں۔ لہٰذا نکاح کی ہر فرد واجب ہوئی تقلید میں غیر معین کو چھوڑ کر دوسری
فردِ خود فرض کے عمل کو موجود ہے کہ فرض بھی ادا ہوا اور فرض رفع فساد کا بھی ادا ہو۔ ہم یخ د
ہم کباب سالم و بجا رہی نکاح کے مقابل قائم مقام بتاؤ سوائے قطع اعضاء تناسل کے کہ
وہ حرام ہی ہے۔ فافہم۔

قولہ۔ البتہ کوئی مثال ایسی ہو قرون خیر میں الخ

اقول :- یہ کلام آپ کی تو بس عجیب در عجیب ہے۔ سنو خاتم بائیں ہاتھ میں صحابہ کے
قران میں مباح تھی۔ پیچھے بوجہ مشابہت روافض کے کہ یہ بھی فتنہ ہے لقولہ من تشبہ
بقوم فھو منھم مکروہ تحریمی ہوئی۔ ہدایہ دیکھ لو۔ پس یسار کا تختم اور یمین کا تختم دونوں جائز
اور قرون ثلاثہ میں یمین کا مباح رہا۔ اور پھر یسار کا مکروہ ہوا تو ترک تختم یسار واجب ہوا کہ ترک
مکروہ واجب ہے تحق فلاں کہنا اول مباح تھا۔ فقہاء نے ترک کو اس کے واجب کیا بسبب
فتنہ خوام اور شیوع مذہب معتزلہ کے کہ اُن کے نزدیک حق علی اللہ ہے ثواب مطیع و عذاب
عاصی دو مثال ہے اگر تسلی نہ ہو تو پھر دیکھی جائے گی ورنہ تو خود ہی بول رہے ہو کہ سوم مباح اور
اب بسبب فتنہ کے حرام اور نکاح ثانی مباح اور بسبب خوف زنا واجب ہوا مجھ سے کیا
پوچھتے ہو۔ تمام دنیا کے عالم تو فعل و قول رسول کو حجۃ گردانتے ہیں کہ اصل مقیس علیہ دین ہے
ور آپ کہتے ہیں کہ وہ خود شارع تھے ماشاء اللہ اگر شارع کے فعل پر قیاس نہ ہوگا تو دین کی
کی اصل کہاں سے آوے گی یہ تو تم نے ایسی کہی کہ دنیا میں کوئی نہیں کہہ سکتا۔ قیاس قرآن حدیث
پر آتا ہے اس کے بعد کوئی مردلیل ہوتا ہے تو اب ہو لو کہ یہ کیا تم نے لکھ دیا ہے۔ اور صحابہ کا
قول بھی خود حجت ہے جیسا صحابہ مامور باتباع میں متّبَع بالکسر رسول کے اور متبع بالفتح من

بعد نے ۔ ایسا ہی دیگر قرون میں ہے ۔ نہ معلوم یہ فرق کہاں سے نقل کیا ہے صحابہ کا فعل حجت اور مقیس علیہ ہوتا ہے اگر قیاس صحابہ کا نہ ہو ۔ اصول کو دیکھو لو فخر عالم علیہ السلام نے غیر قریش کی زبان میں قرآن کو مباح کیا حضرت عثمان نے اس کو حرام اور ترک کرنا اس کا واجب کر دیا ۔ شورش عوام کی وجہ سے یہ عین حجت ہے ۔ نہ یہ کہ اس کا مقیس علیہ بنانا درست نہیں کہ یہ قول محض غلط و خطا ہے ۔ اب دوسری قسم کی مثال آپ کی محض خلاف فہم ہے کیونکہ قرون ثلثہ میں عمل نہ ہونے سے فرض منصوص بدعت نہیں ہو سکتا ۔ اور جو بدعت ہے وہ جائز نہیں ہو سکتی ۔ یہ آپ کی فہم غلط سے پیدا ہوا ہے ۔

فاسئلوا اهل الذکر میں مجتہدین بھی داخل ہیں ۔ نہ جانیں تو دوسرے سے پوچھیں حکم عام ہے کوئی مخصوص نہیں ۔ احادیث صحیحہ و غیر منسوخہ کا جاننا ہی تو مشکل ہے اس کے ہی لئے تقلید کی جاتی ہے اگر کسی کو معلوم ہو جاوے تو حاجت تقلید نہ ہو ۔ مگر کیونکر معلوم ہو خود یہ بھی تقلید ہی ہے ۔ دو حدیث صحیح متعارض کہ نسخ کسی کا معلوم نہیں پھر کسی سے پوچھ کر کسی کو مرجح کرے گا ورنہ تذبذب میں رہا ۔ اور احتمال ائمہ کے حدیث نہ ملنے کا ایک لغو امر ہے ۔ جب مصرح اس کی تحقیق موجود ہے پھر یہ احتمال محض ہوائے نفسانی ہے ۔

جیسا احادیث جہر آمین رفع یدین وغیرہ میں صحیح ہیں ۔ دوسری جانب بھی احادیث ہیں ترجیح معارضہ کے وقت ہوتی ہے یہاں معارضہ ہی نہیں ۔ امام صاحب بھی وجود ان افعال کے مقر ہیں مگر آخر فعل ہونا ثابت نہیں ہوتا تعارض میں وحدت زمان شرط ہے دو وقت میں دو فعل کئے ناسخ کا حال اور منسوخ کا محقق نہیں ہر ایک نے ترجیح ایک جانب کو اجتہاد سے دی ہے جس کو چاہے قبول کر لیوے اگر سمجھ جاؤ تو مطلع کر دینا ورنہ پھر لکھنا کہ تمہاری اصلاح ضروری ہے ۔ تم تو ایک ہی بحث میں بہک کر آل بتال کہنے لگے ۔ اور شرم مت کرنا صاف صاف لکھنا کہ دین کی بات ہے ، لغزش عالم کی خلق کو تباہ کرتی ہے ۔ غیر مقلدین انہیں دو تین قاعدہ کے خبط سے خراب ہو گئے ہیں ۔ براہین قاطعہ کو سمجھ لیتے تو ان خدشات سے محفوظ رہتے مگر سرسری نظر سے دیکھا ہے ۔

بندہ
رشید احمد از گنگوہ

تقلیدِ شخصی

کا ثبوت

صحابۂ کرامؓ کے تعامل سے

از

افادۂ سیدی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دامت فضائلہم

"مولانا موصوف کی مجالس عموماً افاداتِ علمیہ سے معمور رہتی ہیں، ایک اتفاقی مجلس میں آپ نے دو عظیم الشان فائدوں کی طرف اشارہ فرمایا جن میں سے ایک اس صحبت میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اس میں آپ نے تقلید شخصی کے ثبوت میں صحیح بخاری کی روایت سے صحابۂ کرامؓ کے تعامل کا ایک واقعہ بیان فرمایا جس کو احقر نے باضافۂ مختصر تمہید ضبط کر لیا وہو ہذا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کسی مسلمان کو اس میں خلاف نہیں ہو سکتا کہ اصل حکم تمام امور میں حق تعالیٰ کا ہے اور صرف اُسی کا اتباع ہر شخص پر واجب ہے۔ انبیاء و رسل کے احکام جو واجب التسلیم ہیں وہ بھی صرف اسی بنا پر کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام کے مبلغ اور خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں۔ وہ اگر اپنے اجتہاد سے کوئی حکم دیتے ہیں تو اسی بنا پر کہ اس کو کسی قرینہ و دلیل سے حق تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہیں اور اسی لئے خود حق سبحانہ و تعالیٰ نے اُن کے احکام کی اطاعت مخلوق پر فرض و واجب قرار دی ہے ورنہ اِن الحکم الا للّٰہ (اللہ کے سوا کسی کا حکم قابل تسلیم نہیں) قرآن کا کھلا ہوا اعلان ہے۔

[illegible] کہ جس طرح انبیاء و رسل کے احکام کی اطاعت کو
[illegible]

علیہم السلام کے نائبین اور اُن کے احکام کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنے والے ہیں، اُن کے بتائے ہوئے احکام کی تبلیغ کرنے والے ہیں وہ جو کچھ اجتہاد سے بھی کہتے ہیں تو اس کی بھی اصل کتاب و سنت کی ساتھ مستند ہوتی ہے۔ تو جس طرح انبیاء علیہم السلام کی اطاعت عین حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اسی طرح ائمہ دین کی طاعت بھی بالشرط اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اسی طاعت کا نام اصطلاح فقہ میں تقلید ہے۔

آیت کریمہ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو) میں قرآن کریم نے اسی مضمون مسئلہ کی تعلیم دی ہے کہ جو لوگ خود قرآن و حدیث کے غوامض کو نہیں سمجھ سکتے وہ اہل علم سے احکام الٰہیہ دریافت کریں اور اُن کی تقلید کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقلید کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ نہ جاننے والے جاننے والوں سے پوچھ پوچھ کر احکام خدا پر عمل کریں۔ اور یہ ایک ایسا مسلّم الثبوت ضابطہ ہے کہ کوئی سمجھ دار انسان اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اسی وجہ سے منصف اہل حدیث بھی مطلق تقلید کے جواز بلکہ وجوب میں اختلاف نہیں کرتے۔ اور اسی لئے اس کے عقلی اور نقلی دلائل جو عام کتب میں مذکور و معروف ہیں اُن کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اختلاف اور بحث صرف اس میں ہے کہ امام معین کی تقلید پر پابندی کی جاوے کہ ایک امام کی تقلید کرتے ہوئے دوسرے ائمہ کے اقوال پر عمل نہ کیا جاوے جس کو اصطلاح میں تقلید شخصی کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کی حقیقت کو سمجھ لیا جاوے تو یہ بھی کوئی مشکل بحث نہیں رہتی۔

تقلید شخصی کی حقیقت

اصل یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص اتباع ہوی (خواہش پرستی) کی حرمت و ممانعت کے لئے آئی ہیں اور اسی لئے ہر زمانہ میں تمام اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ اتباع ہوی احکام دینیہ میں قطعاً حرام ہے جو شخص اپنی غرض اور خواہشات کو سامنے رکھ کر اس کی پیروی کرتا ہے وہ بجز قرآن و حدیث میں اس کے دلائل ڈھونڈتا ہے وہ اپنے ارادے اور خیال کے اعتبار سے متبع ہوی ہے متبع قرآن نہیں اگرچہ قرآن میں اس کی کوئی سند [illegible]
[illegible] جو دلوں کی گہرائیوں پر مطلع اور نیتوں [illegible]

رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں اس پر ایک مبسوط مقالہ میں تمام امت کا اتفاق نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شخص اپنی خواہشات کی پیروی کرنے کے لئے ائمہ مجتہدین کے مذاہب ڈھونڈھتا ہے۔ اور اپنی ہوی پر عمل کرکے اس کو کسی امام کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا متبع نہیں۔ بلکہ متبع ہوی ہے اور ایسا کرنا دین کو ایک کھلونہ بنانا ہے۔

ابن تیمیہؒ کے بعض الفاظ یہ ہیں :-

فی وقت یقلدون من یفسدہ وفی وقت یقلدون من یصححہ بحسب الغرض والہوٰی ومثل ھذا لا یجوز باتفاق الامۃ (ثم قال بعد ثلاثۃ اسطر) ونظیر ھذا ان یعتقد الرجل ثبوت شفعۃ الجوار اذا کان طالبا لھا وعدم ثبوتھا اذا کان مشتریا فان ھذا لا یجوز بالاجماع وکذا من بنی صحۃ ولایۃ الفاسق فی حال نکاحہ وبنی علی فساد ولایتہ حال طلاقہ لم یجز ذلک باجماع المسلمین و لو قال المستفتی المعین انا لم اکن اعرف ذلک وانا الیوم التزم ذلک لم یکن من ذلک لان ذلک یفتح باب التلاعب بالدین ویفتح الذریعۃ الی ان یکون التحریم والتحلیل

یہ لوگ ایک وقت اس امام کی تقلید کرتے ہیں جو نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے اور دوسرے وقت میں اس امام کی جو اس کو صحیح قرار دیتا ہے اور یہ محض اپنی غرض و ہوی کی وجہ سے ہے اور ایسا کرنا باتفاق امت ناجائز ہے (پھر اس کے تین سطر بعد لکھا ہے) اور اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی آدمی جس وقت کسی حق شفعہ کا خود طالب ہو تو مذہب امام ابوحنیفہ کے موافق، شفعہ جوار کے ثبوت کا اعتقاد ظاہر کرے اور اگر مشتری ہو اور دوسرا شخص طالب شفعہ تو مذہب امام شافعیؒ کے مطابق، اس کے عدم ثبوت کا معتقد بن جائے۔ ایسے ہی وہ شخص جو بحالت قیام نکاح ولایت فاسق کی صحت کا قائل اور اس کی بنا پر منافع نکاح سے منتفع ہے مگر جب طلاق ثلثہ دیدے تو حرمت مغلظہ سے بچنے کے لئے ولایت فاسق کو کالعدم اور اس کے ماتحت منعقدہ شدہ نکاح کو فاسد قرار دے کر یہ باجماع مسلمین جائز نہیں۔ اور اگر کوئی مستفتی یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں تب بھی اس کا قول قابل تسلیم

بحسب الاھواء	نہیں کیونکہ یہ دین کو ایک کھلونہ بنانے کا دروازہ کھولنا
(فتاوی ابن تیمیہ جلد ثانی ص ۲۴۲	ہے اور اس کا سبب بنتا ہے کہ حرام وحلال کا مدار محض
وص ۲۴۱)	اہواء وخواہشات پر ہو جاوے۔

علماء امت کی تصریحات اس بارہ میں بے شمار ہیں ہم نے اُن میں سے صرف حافظ ابن تیمیہؒ کے کلام پر اس لئے اکتفاء کیا کہ حضرات اہل حدیث بھی ان کی امامت وجلالت کے قائل اور بہت سے معاملات میں ان کے متبع ہیں۔

الغرض اتباع ہوئی باجماع اُمت حرام ہے۔ اور ادھر یہ بات تجربہ سے محسوس ومشاہد ہے کہ اگر عوام کو آزاد چھوڑ دیا جاوے کہ جس مسئلہ میں چاہیں ابو حنیفہؒ کے مذہب پر عمل کریں اور جس میں چاہیں شافعیؒ کے مذہب پر پھر جب چاہیں مالکیہ کا قول لے لیں اور جب چاہیں حنابلہ یا دوسرے ائمہ مجتہدین کا تو اس کا انجام لازمی طور پر وہی ہو گا جس کو حافظ ابن تیمیہؒ نے باجماع مسلمین حرام وناجائز قرار دیا ہے۔ اس شرعی مصلحت کی بناء پر عافیت اور سلامت اس میں دیکھی گئی کہ امام واحد کا اتباع تمام مسائل میں لازم قرار دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود اتباعِ ہوئی سے بچنا ہے اور چونکہ اس کی تدبیر اس ہوئی پرستی کے زمانہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ عمل کرنے والوں کو آزاد نہ چھوڑا جاوے بلکہ امام واحد کی تقلید پر مجبور کیا جاوے اس لئے تقلید شخصی بوجہ ذریعہ مقصود ہونے کے واجب قرار دی گئی۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کی ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ائمہ اربعہ کی تقلید یا کسی دوسرے امام معین کی تقلید کے ثبوت کے لئے ضروری نہیں کہ قرآن وحدیث میں اُن کا نام بتلایا گیا ہو یا اُن کی تعیین کو ضروری کہا گیا ہو۔ کیونکہ قرآن وسنت مقاصد شرعیہ کی تصریح کرتے ہیں اُن کے ذرائع کی تصریح کرنا ضروری نہیں جیسے حج کا فرض ہونا قرآن وحدیث میں منصوص ہے۔ مگر ریل اور جہاز یا موٹر اور اونٹ جن کے ذریعہ حج کے مقصود تک رسائی ہوتی ہے اُن میں سوار ہونے کی ضرورت کی تصریح یا جہاز کے نام کی تعیین کتاب وسنت میں ڈھونڈھنا ناواقفیت اور بے علمی کی دلیل ہے۔ اس لئے اگر کتاب وسنت میں کہیں بھی تقلید شخصی کا ثبوت تصریحاً نہ ہوتا صرف اتباعِ ہوائی کی ممانعت تقلید شخصی کے ثبوت کے لئے کافی تھی۔

لیکن حضرات صحابہ کے تعامل سے ثابت ہوتا ہے کہ قرن اول میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ عام حضرات صحابہ علماء صحابہ کی تقلید کرتے تھے۔ پھر ان میں بھی بعض تو مطلقاً بلا تعیین کبھی کسی عالم کی اور کبھی کسی دوسرے بزرگ کی تقلید کر کے عمل کرتے تھے کیونکہ وہ حضرات اتباع ہویٰ کے خطرہ سے محفوظ و مامون تھے۔ اور بعض اس وقت بھی تقلید شخصی پر عامل تھے جس کی ایک نظیر اس جگہ لکھی جاتی ہے اور یہی اس تحریر کا اصل مقصد ہے۔

اہلِ مدینہ کا تعامل زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی

صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:۔

ان اهل المدینة سألوا ابن عباس رضؓ عن امراة طافت ثم حاضت قال لهم تنفر قالوا لا ناخذ بقولك وندع قول زید۔

(بخاری باب اذا حاضت المرأة بعد ما افاضت، کتاب الحج)

اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس رضؓ سے اس عورت کے بارہ میں سوال کیا جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہوگئی ہو کہ وہ طواف وداع کے لئے پاک ہونے تک ٹھہرے یا طواف اس سے ساقط ہو جائے گا اور اس کو چلا جانا جائز ہوگا، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ جا سکتی ہے۔ اہل مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کے قول پر زید بن ثابت کے قول کو چھوڑ کر عمل نہیں کریں گے۔

اور فتح الباری میں بحوالہ ثقفی اسی واقعہ میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:۔

افتیتنا او لم تفتنا زید بن ثابت یقول لا تنفر۔

آپ فتویٰ دیں یا نہ دیں حضرت زید بن ثابت تو یہ کہتے ہیں کہ یہ عورت (بغیر طواف) واپس نہیں جا سکتی۔

نیز فتح الباری میں بحوالہ مسند ابی داؤد طیالسی بروایت قتادہ اسی واقعہ کے یہ الفاظ منقول ہیں۔

فقالت الانصار لا نتابعك یا ابن عباس وانت تخالف زیدا [illegible]

[illegible]

انصار نے کہا کہ [illegible] [illegible]

اس واقعہ میں انصار مدینہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی گفتگو کے الفاظ مذکورہ سے دو چیزیں بوضاحت ثابت ہوگئیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ انصار مدینہ حضرت زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کرتے تھے اُن کے قول کے مقابل کسی کے فتوے پر عمل نہ کرتے تھے۔ دوم یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ان لوگوں پر یہ اعتراض نہیں فرمایا جو ہمارے زمانہ کے مدعیان عمل بالحدیث مقلدین پر کرتے ہیں کہ تقلید شخصی تو شرک فی النبوۃ ہے، حرام ہے، ناجائز ہے۔ بلکہ اُن کو مسئلہ کی تحقیق اور حضرت زید بن ثابت رضؓ کی طرف دوبارہ مراجعت کے لئے ارشاد فرمایا۔

چنانچہ فتح الباری ہی میں ہے کہ یہ حضرات مدینہ طیبہ پہنچے تو انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے ارشاد کے موافق حضرت ام سلیم رضؓ سے واقعہ کی تحقیق کی اور حضرت زید بن ثابت رضؓ کی طرف مراجعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت زید بن ثابت رضؓ نے مکرر حدیث کی تحقیق فرما کر حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے قول کو قبول فرما لیا اور اپنے سابق فتوے سے رجوع کر لیا (کما صرح بہ فی الفتح ص ۴۸۴ ج ۲)۔

الغرض اس واقعہ سے اتنی بات پر انصار مدینہ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا اتفاق معلوم ہوا کہ جو لوگ شان اجتہاد اور کافی علم نہیں رکھتے۔ وہ کسی امام معین کی تقلید کو اپنے پر لازم کرلیں تو بلاشبہ جائز ہے۔

تنبیہ

اس واقعہ سے قرن اوّل اور حضرات صحابہ کے تعامل سے تقلید شخصی کا ثبوت وجواز ثابت ہوا۔ پھر قرون متاخرہ میں اُس کو واجب و لازم قرار دینے کا سبب یہ ہوا کہ بغیر اس کے اتباع ہویٰ سے محفوظ رہنا عادۃً محال ہوگیا۔ اس کے وجوب کی بھی ایک نظیر قرن اوّل ہی میں موجود ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ رسالہ میں لکھی جاوے گی۔ واللہ موفق

حررہ العبد **محمد شفیع** عفا اللہ عنہ

ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

اتمام الخير
فی الافتاء
بمذهب الغير

دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کے حدود
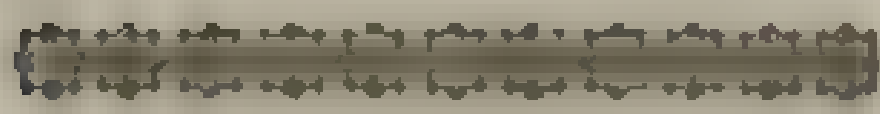
اضطراری حالت میں افتاء بمذہب الغیر مشروع ہے، لیکن یہ بہت کٹھن باب ہے، اس کے مخصوص حدود و قیود ہیں جن سے تجاوز کرنا ائمہ کے نزدیک جائز نہیں، جب اضطرار عام کا تحقق ہو جائے اور رجوع الی مذہب الغیر کی تمام شرائط پائی جائیں تو اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا اور اس کے لئے یہ ابتدائی تمہید بھی لکھی گئی تھی، اس کے لئے مختلف کتب سے آپ نے اس موضوع سے متعلق عبارات کے حوالے بھی جمع فرمائے تھے۔

اس وقت فقہی رسائل کے مسودات میں سے یہ تمہید اس موضوع سے متعلق ایک مختصر مسودہ اور عبارات فقہاء کے حوالوں پر مشتمل ایک یادداشت نکل آئی۔

بحکم حضرت مفتی صاحب ان تینوں کو اس امید پر طبع کیا جا رہا ہے کہ شاید کوئی عالم اس کی تکمیل کا ارادہ کرے تو اس وقت انشاء اللہ اس محنت کا ثمرہ نکل آئے گا۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

یا فتاح

انعام الخبیر
فی الافتاء
بمذہب الغیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ الذی لا الٰہ الا ھو ولا حکم ولا طاعة الا لہ ۔ بعث لنا الرسول الامین بحبل متین وکتاب مبین ۔ فامر المستنبطین منا باعمال الرویة والفحص والذین لا یعلمون ان یسألوا اھل الذکر ۔ کیلا یتخذ الھوی مذھب ۔ او یجعل لمذھب معیب ۔ والصلوٰة والسلام الاتمان الاکملان علی سید الانس والجان ۔ جاء بسمحة سھلة بیضاء لیلھا ونھارھا سواء ۔ وعلی آلہ واصحٰبہ نجوم الھدایة فی دیاجی الغوایة ولیالی العمایہ ۔

وبعد فقال العبد الضعیف محمد المدعو بشفیع الدیوبندی کان اللہ لہ ۔ ان فی ایامنا ھٰذہ قد شاعت المعاملات الفاسدة والباطلة فی التجارات والاجارات وعمت بہ البلوی ۔ ومشائخ الائمة الاربعة متفقون علی جواز العمل والفتوی عند البلوی والاضطرار العام علی ای مذھب من مذاھب الفقھاء المجتھدین یوجد فیہ الرخصة والسھولة ولکن مشروطًا بشرائط کیلا یتجاسر العوام فی التلعب بالدین واتباع الھوی ۔

فارادا العبد الضعیف ان یجمع نصوص المذاھب وشرائط

العمل بمذهب الغير فی جزء مستقل وذلک حین کان العبد الضعیف یتولی منصب الافتاء بدار العلوم دیوبند الهند ١٣٦٠ھ من الهجرة ۔ فجمع مواد المسئلة من کتب شتی ولم یرخص هجوم المشاغل بسط هذه المسئلة تصنیفا وتالیفا الی ان مناهز من ١٣٩٢ھ وقد بلغت الثمانین من عمری وسقطت القوی کلها ۔ والآن لا استطیع النظر فی ما کتبت سابقًا فکیف بترتیبها و تالیفها فی صورة مقالة او رسالة ۔ فسألنی بعض الاحبة ان اجعل مواد هذه المسئلة کما هی من غیر ترتیب لتشریح جزءًا مستقلاً لعله تفید اهل العلم والنظر اذا ارادوا الخوض فی هذه المسئلة فهی من عبارات الفقهاء من کتب شتی من المذاهب ۔ والله ولی التوفیق ۔

العبد محمد شفیع الدیوبندی
دارالعلوم کراتشی ١٤
١٣٩٤ھ

بسم الله الرحمٰن الرحیم

اقول وبالله التوفیق ان الحق الحقیق والتحقیق الذی لایمزجہ تلبیس ولاتلفیق فی ھذا الباب ھوجواز الافتاء بمذھب امام المالک رحمہ اللہ فی امراۃ المفقود وغیرہ مہامست الضرورۃ الیہ لعموم البلوی فقول عمر فی ھذا الباب ھوالصحیح المختار ومنہ اخطاء فی عدم اشتراط القضاء فان الصحیح المختار عند ارباب الترجیح من مشائخ المالکیۃ والمرجوع الیہ من مذھب امام دار الھجرۃ رحمۃ اللہ علیہ ھواشتراط القضاء فی التفریق بین المفقود وزوجہ کما صرح بہ العلامۃ الباجی فی شرح المؤطا تحت اثر فاروق الاعظم حیث قال قولہ رضی اللہ عنہ ایما امراۃ فقدت زوجہ فلم تدراین ھو فانھا تنتظر اربع سنین ولم یتبین بماذا قدمت قبل ان ترفع الیہ۔ یعنی الحاکم ولو اقامت عشرین سنۃ (منتقی شرح مؤطا ص ۹۰ ج ۴) وقال العلامۃ الخلیل وھومن کبار الائمۃ المالکیۃ فی مختصرہ ولزوجۃ المفقود الرفع الی القاضی والوالی ووالی الماء والا لجماعۃ المسلمین قال العلامۃ الدردیر فی شرحہ ای وان لم یوجد واحد منہم فلجماعۃ المسلمین من صالحی بلدھا۔ (شرح دردیر علی مختصر الخلیل ص ۹۹ ۳ ج ۱)

وکذلک اشتراط القضاء مصرح عند الحنفیۃ ایضاً نص علیہ فی الھدایۃ والکنز والدر وغیرھا فی الحکم بالتفریق بین المفقود وزوجہ بلا اشتراط القضاء خلاف الاجماع واما قول من قال ان الافتاء بمذھب الغیر والمذھب المرجوح لایجوز فھو صحیح فی نفسہ بلاخلاف

ولا نکار کما صرح به فی الدر المختار وعدہ خلاف للاجماع وھو المصرح فی عامة کتب الفقه والاصول وبه صرح العلامة الشامی فی رسالته المسماة بعقود رسم المفتی غیر ان مواضع الضرورة مستثنٰی ة من الافتاء بمرجوح فی مسئلة المفقود وامثاله حد نختمه الا اذا شهدت فیها ضرورة تفوق الضرورات والدلیل علی ماقلنا ماذکرہ العلامة ابن عابدین فی رسالته المسماة بعقود رسم المفتی ولفظه ومتی کان قول ابی یوسف ومحمد موافق قوله لا یتعدی عنه الا فیما مست الضرورة وعلم انه لو کان ابو حنیفة رای ما راؤا لافتی به ص ۲۶ وله فی ذلک نظم

ولا یجوز بالضعیف العمل	ولا یجاب من جاء یسأل
الا لعامل له ضرورة	او من له معرفة مشهورة

وقال فی شرح هذه الابیات والاظهر فی الجواب اخذًا من التعبیر بالتشهی ان یقال ان الاجماع علی منع اطلاق التخییر ای بان یختار ویتشهی مهما اراد من الاقوال فی ای وقت اراد اما لو عمل بالضعیف فی بعض الاوقات لضرورة اقتضت ذلک فلا یمنع منه وعلیه یحمل ما تقدم عن الشرنبلالی من ان مذهب الحنفیة المنع بدلیل انهم اجازوا للمسافر الضعیف الذی خاف الریبة ان یاخذ بقول ابی یوسف بعدم وجوب الغسل علی المحتلم الذی امسک ذکرہ عند ما احس بالاحتلام الی ان فترت شهوته ثم ارسله مع ان هذا خلاف الراجح فی المذهب لکن اجازوا الاخذ به للضرورة وینبغی ان یکون من هذا القبیل ما ذکرہ الامام المرغینانی صاحب الهدایة فی کتابه مختارات النوازل وھو کتاب مشهور ینقل عنه شراح الهدایة وغیرهم حیث قال فی فصل النجاسة والدم اذا خرج من القروح قلیلاً قلیلاً غیر سائل فذاک

ليس بمانع وان كثر وقيل لو كان بحال لو تركه يسيل يمنع انتهى ثم
اعاد المسئلة فى نواقض الوضوء فقال ولو خرج منه شئ قليل ومسحه
بخرقة حتى لو ترك يسيل لا ينقض وقيل الخ ولا يخفى ان المشهور
فى عامة كتب المذهب هو القول الثانى المعبر عنه واما ما اختاره
من القول الاول فلم ار من سبقه اليه ولا من تابعه بعد المراجعة
الكثيرة فهو قول شاذ ولكن صاحب الهداية امام جليل اعظم مشائخ
المذهب من طبقة اصحاب الترجيح والتصحيح كما مر فيجوز لمعذور
تقليده فى هذا القول عند الضرورة فانه فيه توسعة عظيمة اه اعلم
(ثم قال بعد ذلك) وقد ذكر صاحب البحر فى الحيض فى الوان الدماء
اقوالا ضعيفة ثم قال وفى المعراج عن فخر الائمة لو افتى مفت بشئ
من هذه الاقوال فى مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسنا انتهى
وبه علم ان المضطر له العمل بذلك لنفسه كما قلنا وان المفتى
له الافتاء به للمضطر فما مر انه ليس له العمل بالضعيف والافتاء
به محمول على غير موضع الضرورة كما علمته من مجموع ما قررناه
والله اعلم - انتهى ما قاله العلامة الشامى فى رسم المفتى قال العبد
الضعيف اقال الله تعالى عثراته ان هذا هو الحق الحقيق الذى لا ينبغى
ان يتجاوز عنه وهو الامر العدل والقول الفصل فى الباب وبه صرح
العلامة كمال المحقق ابن الهمام فى تحرير الاصول ص ۳۵۰ ج ۳ وفيه
من المساهلة فى هذا الباب ما لا ينبغى اظهاره والساعة فى زمننا هذا
الغلبة الفساد واتباع الهوى فرأينا طيه على غيره اولى ولكن نورد هنا
شرائط الانتقال من مذهب الى مذهب آخر وهو جملة منيرة تثبت
الضرورة السد وهو هذا اقال الروبانى يجوز تقليد المذاهب والانتقال
... الا ... اء كمن تزوج

بغير صدق والاولى ولا شهود فان هذه الصورة لم يقل بها احد وان يعتقد فيمن يقلده الفضل بوصول اخباره اليه ولا يقلد اميا فی عماية والا يتتبع رخص المذاهب انتهى (تحرير الاصول ص ٣٥٢ ج ٣) و قال الامام العلامة سيف الدين الآمدی فی احكام الاحكام فی هذا الباب ما نصه۔

المسئلة الثامنة اذا اتبع العامی بعض المجتهدين فی حكم حادثة من الحوادث وعمل بقوله فيها اتفقوا على انه ليس له الرجوع عنه فی ذلك الحكم بعد ذلك الی غيره وهل له اتباع غير ذلك المجتهد فی حكم آخر اختلفوا فيه فمنهم من منع منه ومنهم من اجازه وهو الحق نظراً الی ما وقع عليه اجماع الصحابة من تسويغ استفتاء العامی لكل عالم فی المسئلة وانه لم ينقل عن احد من السلف الحجر على العامة فی ذلك ولو كان ذلك ممتنعاً لما جاز من الصحابة اهماله والسكوت عن الانكار عليه ولان كل مسئلة لها حكم نفسها فكما لم يتعين الاول للاتباع فی المسئلة الاولى الا بعد سؤاله كذلك فی المسئلة الاخرى واما اذا اتبع العامی مذهباً معينا كمذهب الشافعی او ابی حنيفة او غيرهما وقال انا على مذهبه وملتزم له فهل له الرجوع الی الاخذ بقول غيره فی مسئلة من المسائل اختلفوا فيه فجوزه قوم نظراً الی ان التزامه لمذهب معين غير ملزم له ومنع من ذلك آخرون لانه بالتزامه المذهب صار لازماً له كما لو التزم مذهبه فی حكم حادثة معينة والمختار انما هو التفصيل و هو ان كل مسئلة من مذهب الاول اتصل عمله بها فليس له تقليد الغير فيها وما لم يتصل عمله بها فلا مانع من اتباع غيره فيها انتهى

(احكام ص ٢٠٠ ج ٢) و فی كتاب الاحكام للآمدی ان ليس بمجتهد ان تجوز له الفتوى بمذهب غيره من المجتهدين ... المختار فی زمننا

هذا اختلفوا فيه فذهب ابو الحسين البصري وجماعة من الاصوليين الى
المنع من ذلك لانه انما يسئل عما عنده   ولانه لو جازت الفتوى
بطريق الحكاية عن مذهب الغير لجاز ذلك للعامي وهو مخالف
للاجماع ومنهم من جوزه اذا ثبت ذلك عنده بنقل من يوثق بقوله
والمختار انه اذا كان مجتهدا في المذهب بحيث يكون مطلعا على مأخذ
المجتهد المطلق الذي يقلده وهو قادر على التفريع على قواعد امامه
واقواله متمكن من الفرق والجمع والنظر والمناظرة في ذلك كان
له الفتوى تمييزا له عن العامي ودليله انعقاد الاجماع من اهل كل
عصر على قبول مثل هذا النوع من الفتوى وان لم يكن كذلك فلا
(احكام الاحكام ص٣١٥ ج٤) وفي تحرير الاصول للكمال ابن الهمام و
شرحه لابن امير الحاج مسئلة لا يرجع المقلد فيما   المجتهد فيه اي
عمل به اتفاقا) ذكره الآمدي وابن الحاجب لكن قال الزركشي وليس
كما قالا ففي كلام غيرهما ما يقتضي جريان الخلاف بعد العمل ايضا وكيف
يمتنع اذا اعتقد صحته لكن وجه ما قالاه انه بالتزامه مذهب امام
مكلف به ما لم يظهر له غيره والعامي لا يظهر له بخلاف المجتهد حيث
ينتقل من امارة الى امارة (الى ان قال) نعم المفتي على مذهب الامام
اذا افتى بكون الشيء واجبا او مباحا وحراما ليس له ان يقلد ويفتي
بخلافه لانه حينئذ محض تشهي كذا (ثم قال) وهل يقلد غيره اي غير
من قلده اولا في شيء (في غيره) اي غير ذلك الشيء كان يعمل اولا في
مسئلة بقول ابي حنيفة رح وثانيا في اخرى بقول مجتهد آخر (المختار)
كما ذكره الآمدي وابن الحاجب (نعم للقطع) بالاستقراء التام
(بانهم) اي المستفتين في كل عصر من زمن الصحابة وهلم جرا كانوا
يستفتون مرة واحدة ومرة غيره غير ملتزمين مفتيا واحدا وشاع

ثم قال (ولم يغير) وهذا اذا لم يلتزم مذهباً معيناً فلو التزم مذهباً معيناً
كابي حنيفة رح والشافعي رح فهل يلزمه الاستمرار عليه فلا يعدل عنه
في مسئلة من المسائل فقيل يلزم لانه بالتزامه يصير ملزماً به
كما لو التزمه في حكم حادثة معينة ولانه اعتقد ان المذهب الذي
انتسب اليه هو الحق فعليه الوفاء بموجب اعتقاده (وقيل لا يلزم
وهو الاصح) كما في الرافعي وغيره لان التزامه غير ملزم اذ لا واجب
الا ما اوجبه الله تعالى ورسوله ولم يوجب الله ولا رسوله على احد
من الناس ان يتمذهب بمذهب رجل من الامة فيقلده في دينه
في كل ما ياتي ويذر دون غيره (الى ان قال) ثم قال الامام صلاح الدين
علائي والذي صرح به الفقهاء في مشهور كتبهم جواز الانتقال في
احاد المسائل والعمل فيها بخلاف مذهب امامه الذي يقلد مذهبه
اذا لم يكن ذلك على وجه التتبع للرخص انتهى (تحرير مع شرحه ص ٣٥١
ج ٣) وبمثل هذا صرح الاسنوي في شرح المنهاج للبيضاوي حيث قال
اذا قلد مجتهداً في مسئلة فليس له تقليد غيره منها اتفاقاً ويجوز ذلك
في حكم آخر على المختار فلو التزم مذهباً معيناً كالطائفة الشافعية
والحنفية ففي الرجوع الى غيره من المذاهب الثلاثة اقوال ثالثها
يجوز الرجوع في ما لم يعمل به ولا يجوز في غيره.

(فائدتان) احدهما ذكر القرافي في شرح المحصول ان تقليد
مذهب الغير حيث جوزناه فشرطه ان لا يكون موقعاً في امر يجتمع
على ابطاله الامام الذي كان على مذهبه والامام الذي انتقل اليه
فمن قلد مالكاً مثلاً في عدم النقض باللمس الخالي عن الشهوة فصلى
فلابد ان يدلك بدنه ويمسح جميع راسه والا تكون صلوته
باطلة عند الامامين. انتهى بقدر الضرورة (اسنوي على المنهاج ص ٣٦

علی هامش التحریر ج ۳) وحاصل الکلام الذی تلخص من نقولات
اولئک الاکابر ان اختیار مذهب الغیر فی بعض المسائل والافتاء به
یجوز للمجتهد فلا یجوز الا بشرائط - الاول ان لا یلزم التلفیق بین
المذهبین بحیث یتحقق اجماع الائمۃ علی بطلانه کما فی تحریر الاصول
والاحکام والاسنوی وغیرہ والثانی ان یکون اختیار مذهب الغیر
قبل العمل بمذهب امامه بان لم یکن عمل به فی هذه الحادثۃ
بمذهب امامه کما فی التحریر والاحکام وغیرہ - والثالث ان لا یکون
علی وجه التتبع للرخص فانه لا یجوز مطلقاً کما صرح به ابن عبد البر
من انه لا یجوز للعامی تتبع الرخص اجماعاً (شرح تحریر ص ۳۵۰ ج ۳) وهذا
هذا رأی المتقدمین من مشائخ الحنفیۃ حیث لم یشترطوا الضرورۃ
الشدیدۃ والمتأخرون لم یکتفوا علی اشتراط عدم تتبع الرخص واما
زماننا هذا فهو زمان اتباع الهوی واعجاب کل ذی رای برایه وما
یلیق بنا فتتبع الرخص متعین ومتیقن باعتبار الغالب الاکثر فلا
یجوز الا بشرط الضرورۃ الشدیدۃ وعموم البلوی والاتقاء کما ذکرہ
العلامۃ ابن العابدین فی رسالته عقود رسم المفتی وقد مر نقله
فیما سبق والله سبحانه وتعالی اعلم وعلمه اتم واحکم

کتبه الاحقر الفقیر
محمد شفیع الدیوبندی

ماخذ المسئلة

قنیۃ الفتاوی فی باب مستقل ص ۱۵۵

فتاوی مہدویہ ص ۲۱۲ ج ۲

رد المحتار باب الرجعۃ مطلب التحلیل رشامی مصری قدیم ص ۵۵۲)

شرح المنظومۃ المسماۃ بعقود رسم المفتی ص ۲۰ ، ۲۵ الی آخر الرسالۃ

تحریر الاصول لابن ہمام ح ص ۳۵۳ ج ۳

شروط الانتقال من مذہب الی آخر

تحریر الاصول ص ۳۵۲ ج ۳

ترجیح بعض الائمۃ علی بعض تحریر الاصول ص ۳۵۳ ج ۳

و اجماع المحققین علی الائمۃ الاربعۃ

ما یتعلق بالاجتہاد و التقلید و الافتاء و الاستفتاء مفصلا کتاب الاحکام للآمدی ج ۴ ص ۸ الی آخر کتاب القاعدۃ الثالثۃ فی المجتہدین

واحوال المفتین والمستفتین۔

فتاوی ابن تیمیہ ص ۲۴۰ ج ۲ وقبل ذلک وبعدہ مطالب مفیدۃ فی الباب فلیراجع۔

الرسالۃ ، الرسالۃ الثامنۃ لصاحب الاشباہ ص ۳۰۲

الافتاء بمذہب الغیر وشرائطہ فتاوی خیریہ ص ۱۵ ج ۲

الافتاء بالضعیف شامی ص ۵۰ ج ۲

الافتاء بمذہب الغیر کتاب الحدود ، حد السرقۃ شامی ص ۲۱۸

ذکر الفقیہ ابو اللیث فی تاسیس النظائر انہ اذا لم یوجد فی مذہب الامام قول فی مسئلۃ یرجع الی مذہب المالک لانہ اقرب المذاہب الیہ۔

شامی کتاب الطلاق باب الرجعۃ فصل التحلیل ج ۲ ص ۵۱۲
باب القضاء بخلاف مایعتقد المحکوم لہ او المحکوم علیہ۔
باب ثامن من قضاء العالمگیریۃ مصری ص ۲۷۵ ج ۳
اذا لم یوجد فی المسئلۃ عن ابی حنیفۃ رح
تنقیح الفتاوی ص ۳۳۴ ج ۲ وص ۳۰۵
الانتقال من مذہب الی مذہب آخر قنیہ ص ۱۵۵
تنقیح الفتاوی کتاب الکراھیہ ص ۳۲۷ ج ۲

الحکم

کتاب الموافقات للشاطبی ص ۸۰ ج ۴ فیض القدیر شرح جامع صغیر
(حدیث) تحت حدیث اختلاف امتی رحمۃ ص ۲۱۰ ج ۱
شامی کتاب الشہادۃ باب قبول الشہادۃ ص ۴۲۰ ج ۴ وشامی
فصل التعزیر۔

فتاوی حدیثیہ ص ۸۵ و ۸۶

تنقیح الفتاوی کتاب القضاء مطلب فسخ یمین المضافۃ ومثلہ
فی طلاق الشامیۃ۔

تاریخ تالیف :- ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ
مارچ ۱۹۷۵ء

مقام تالیف :- کراچی

غیر مطبوعہ :-

سوال

بخدمت حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مفتی اعظم پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذارش آنکہ جیسا کہ حضرت والا کو معلوم ہے کہ احقر کو دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار میں افتار کی خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔ طرح طرح کے سوالات میں کثر یہ سوال بھی آتا ہے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت جمہور اہل سنت والجماعت کے طریقہ پر ہے یا نہیں؟ اور مذاہب اربعہ میں سے ان کا کس مذہب سے تعلق ہے؟ اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اور یہ جو مشہور ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کے رجحانات سلف صالحین کے خلاف ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟ بعض لوگ آپ کی کسی سابقہ تحریک کی بنار پر آپ کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں کہ آپ ان کے نظریات سے اتفاق رکھتے ہیں، اس کی کیا اصل ہے؟

والسلام

احقر محمد وجیہہ، از دار العلوم،
ٹنڈوالہ یار (سندھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب

مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے بارے میں میرے پاس سالہا سال سے سوالات آتے رہے ہیں جن کا جواب میں اس وقت کے درجات ان کے بارے میں اپنی اس وقت کی معلومات کے مطابق لکھتا رہا ہوں۔ ان میں بعض تحریریں شائع بھی ہوئی ہیں اور بعض نجی مکاتیب کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ اس وقت ان تمام تحریروں کو سامنے رکھنا ممکن نہیں۔ البتہ اس عرصہ میں احقر کو کچھ ان کی مزید

تحریرات کے مطالعہ کا موقعہ ملا، کچھ ان کی نئی تالیفات سامنے آئیں اور کچھ ان کے لٹریچر کے عام اثرات اور ان کی جماعت کے حالات کو مزید دیکھنے کا موقع ملا، اس مجموعے اب ان کے بارے میں جو میری رائے ہے وہ بکمال وضاحت ذیل میں لکھ رہا ہوں:-

میری سابقہ تحریرات اگر اس تازہ تحریر کے موافق ہوں تو فبہا اور اگر سابقہ تحریرات میں کوئی چیز اس کے خلاف محسوس ہو تو اسے منسوخ سمجھا جائے اور اب میری رائے کے حوالہ کے لئے صرف ذیل کی تحریر پر اعتماد کیا جائے۔

احقر کے نزدیک مولانا مودودی صاحب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عقائد اور احکام میں ذاتی اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں، خواہ ان کا اجتہاد جمہور علمائے سلف کے خلاف ہو، حالانکہ احقر کے نزدیک منصب اجتہاد کی شرائط ان میں موجود نہیں اس بنیادی غلطی کی بنا پر ان کے لٹریچر میں بہت سی باتیں غلط اور جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تحریروں میں علمائے سلف یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ انتہائی غلط ہے خاص طور سے "خلافت و ملوکیت" میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جس طرح نہ صرف تنقید ہی نہیں بلکہ ملامت کا ہدف بھی بنایا گیا ہے، اور اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے توجہ دلانے کے باوجود اصرار کی جو روش اختیار کی گئی ہے وہ جمہور علمائے اہل سنت والجماعت کے نزدیک بالکل غلط ہے۔

نیز ان کے عام لٹریچر کا مجموعی تاثر بھی اس کے پڑھنے والوں پر بکثرت یہ محسوس ہوتا ہے کہ سلف صالحین پر سے اعتماد نہیں رہتا۔ اور ہمارے نزدیک یہ اعتماد ہی دین کی حفاظت کا بڑا حصار ہے۔ اس سے نکل جانے کے بعد پوری نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ بھی انسان نہایت غلط اور گمراہ کن راستوں پر پڑ سکتا ہے، ہاں یہ صحیح ہے کہ ان کو منکرین حدیث، قادیانیوں یا اباحیت پسند لوگوں کی صف میں کھڑا کرنا بھی میرے نزدیک درست نہیں، جنہوں نے سود، شراب، قمار اور اسلام کے کھلے محرمات کو حلال کرنے کے لئے قرآن و سنت میں تحریفات کی ہیں۔

.... بلکہ ایسے لوگوں کی تردید میں ان کی

تحریریں ایک خاص سطح تک کے تعلیم یافتہ حلقوں میں مؤثر اور مفید بھی ثابت ہوئی ہیں، یہ بات میں ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں، لیکن اگر کوئی شخص میری اس بات کو بنیاد بنا کر یہ کہے کہ میں مودودی صاحب کے ان نظریات سے متفق ہوں جو انہوں نے جمہور علماء کے خلاف اختیار کئے ہیں تو یہ بالکل غلط اور خلافِ واقعہ بات ہے۔

اگرچہ جماعت کے قانون میں مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں اور اصولاً جو بات مولانا مودودی صاحب کے بارے میں درست ہو، ضروری نہیں کہ وہ جماعت اسلامی کے بارے میں بھی درست ہو، لیکن عملی طور سے جماعت اسلامی نے مولانا مودودی صاحب کے لٹریچر کو نہ صرف جماعت کا علمی سرمایہ اور اپنے عمل کا محور بنایا ہوا ہے بلکہ اس کی طرف سے زبانی اور تحریری مدافعت کا عام طرزِ عمل ہر جگہ مشاہدہ میں آتا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت کے افراد بھی ان نظریات اور تحریروں سے متفق ہیں، البتہ اگر کچھ مستثنیٰ حضرات ایسے ہوں جو مذکورہ بالا امور میں مولانا مودودی سے اختلاف رکھتے ہوں اور جمہور علمائے اہل سنت کے مسلک کو اس کے مقابلے میں درست سمجھتے ہوں تو ان پر اس رائے کا اطلاق نہیں ہوگا۔

نماز کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ امام اس شخص کو بنانا چاہئے جو جمہور اہل سنت کے مسلک کا پابند ہو، لہٰذا جو لوگ مودودی صاحب سے مذکورہ بالا امور میں متفق ہوں انہیں باختیارِ خود امام بنانا درست نہیں۔ البتہ اگر کوئی نماز ان کے پیچھے پڑھ لی گئی تو نماز ہو گئی

یہ میری ذاتی رائے ہے جو اپنی حد تک غور و فکر کے بعد فیما بینی و بین اللہ قائم کی ہے۔ میں کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی اور بے احتیاطی سے بھی اللہ کی

پناہ مانگتا ہوں اور دین کے معاملہ میں مداہنت سے بھی۔

جن حضرات کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو وہ اپنے عمل کے مختار ہیں۔ مجھے ان سے کوئی مباحثہ کرنا نہیں نہ میرے قویٰ اور مصروفیات اس کے متحمل ہیں، اور اگر کوئی صاحب ....

...... اس کو شائع کرنا چاہیں تو ان سے میری درخواست ہے کہ اس کو پورا شائع کریں۔ ادھورا یا کوئی ٹکڑا شائع کر کے خیانت کے مرتکب نہ ہوں۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ

پیر و مرید کا فقہی اختلاف

مثالی بحث و تنقید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیرِ نظر سطور میں ایک واقعہ کی یادداشت ہے، جس کو متعدد فوائد کے پیشِ نظر ضبط کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کا تعلق میرے مخلص دوست مولانا حافظ جلیل احمد صاحب سابق رئیس علی گڑھ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ مرحوم سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص اور ممتاز خلفاء میں سے تھے۔ حضرت رح سے تعلق ارادت و اصلاح ہونے کے بعد آپ پر درویشی کا ایسا رنگ غالب ہوا کہ اپنی زمینداری اور ریاست کو چھوڑ چھاڑ کر مع اہل و عیال تھانہ بھون کی سکونت اختیار کر لی تھی اور حضرت رح کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ علمِ دین حاصل کرنے کا شوق ہوا تو خانقاہ میں مقیم ایک عالم سے باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے درسی علوم پورے کئے۔ حضرت رح کی وفات کے بعد جب پاکستان بنا تو پاکستان میں منتقل ہو گئے اور جامعہ اشرفیہ انارکلی لاہور میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس قیام فرمایا۔ اور خموشی و گمنامی کے ساتھ دعوت و ارشاد اور تعلیم و تبلیغ کی خدمات میں مشغول رہ کر اب سے چند سال پہلے جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ اپنے صاحبزادے کے ساتھ اب بھی خانقاہ ہی میں مقیم ہیں۔ آپ کے صاحبزادے مولانا وکیل احمد

صاحب شروانی اب بھی جامعہ اشرفیہ میں مدرس ہیں۔

جس زمانے میں مرحوم اپنے اہل و عیال کے ساتھ تھانہ بھون میں مقیم تھے آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وقف کردہ جائداد کے متعلق کچھ سوالات حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کئے جن کا جواب اس وقت کے مفتی خانقاہ نے تحریر فرمایا مگر حضرت رح کو اس جواب پر اطمینان نہ ہوا اور اس پر کچھ اشکالات تحریر فرما کر پھر جواب لکھا اور ارشاد فرمایا کہ اب یہ مجموعہ محمد شفیع کے پاس دیوبند بھیج دیا جائے کہ وہ جواب لکھے۔ میں نے مسئلہ میں جتنا غور و فکر کیا تو مجھے حضرت رح کی تحریر پر اطمینان اور شرحِ صدر نہ ہوا بلکہ کچھ شبہات و اشکالات پیش آئے جن کو تحریر کر کے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا اور مسئلہ کے متعلق میرا جواب حضرت رح کے جواب سے مختلف ہو گیا۔ اب معاملہ اور زیادہ الجھ گیا تو حضرت رح نے مولانا حافظ محمد جمیل صاحب سے فرما دیا کہ خط و کتابت میں طول ہو گا، محمد شفیع کے تھانہ بھون آنے کا انتظار کرو زبانی گفت گو سے بات طے کر لی جائے گی۔ جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا تو حضرت رح نے اس مسئلہ پر گفتگو کے لئے ایک وقت مقرر فرمایا اور کافی دیر تک مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث و گفت گو ہوتی رہی مگر عجب اتفاق یہ پیش آیا کہ اس زبانی گفت گو میں بھی کسی ایک صورت پر رائیں متفق نہ ہوئیں، حضرت کے سامنے مجھ بے علم و عمل کی رائے ہی کیا تھی؛ مگر حکم یہی تھا کہ جو کچھ رائے ہو اس کو پوری صفائی سے پیش کرو اس میں ادب مانع نہ ہونا چاہیئے اس لئے اظہار رائے پر مجبور تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجلس اس بات پر ختم ہوئی کہ دیر کافی ہو گئی ہے اب پھر کسی روز اس مسئلہ پر غور کریں گے۔

اب حافظہ رخصت ہو چکا ہے پوری بات یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد پھر تحریری سلسلہ شروع ہوا، حضرت رح نے میرے شبہات و اشکالات کا جواب تحریر فرمایا مگر اس جواب پر احقر کو اطمینان نہ ہوا تو مزید سوالات لکھ کر بھیجے اس طرح ایک عرصہ تک پھر یہ زیر بحث مسئلہ ملتوی رہا اور آخر میں جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا

تو مزید غور و فکر کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی اس میں بھی صورت حال یہی رہی
کہ نہ حضرت رح کی رائے بدلی نہ میری حضرت رح نے فرمایا کہ میں تمھارے جواب کو
اصول و قواعد کی رو سے غلط نہیں کہتا، مگر اس پر میرا شرح صدر نہیں، اس لئے اختیار
نہیں کرتا۔ احقر نے بھی عرض کیا کہ حضرتؒ کی تحقیق کے بعد غالب یہی معلوم ہوتا ہے
کہ میری ہی رائے غلط ہوگی مگر کیا عرض کروں کہ اس کا غلط ہونا مجھ پر واضح نہیں۔ اس
پر حضرت رح نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا بس آپ اپنی رائے اور فتویٰ پر رہو میں اپنی
رائے اور فتویٰ پر ہوں مستفتی کو ہم اس کی اطلاع کردیں گے کہ اس مسئلے میں ہم
دونوں میں اختلاف ہے اور ہم کسی جانب کو یقینی غلط بھی نہیں کہہ سکتے اس لئے تمہیں
اختیار ہے کہ جس پر چاہو عمل کرلو۔

عجیب اتفاق ہے کہ مستفتی جو حضرت رح کے مرید اور خلیفہ خاص تھے ان کو جب
اختیار ملا تو انھوں نے عرض کیا کہ اگر مجھے اختیار ہے تو بندہ محمد شفیع کے فتویٰ کو
اختیار کرتا ہے، حضرت رح نے بڑی خوشی کے ساتھ اس کو تسلیم کیا۔ یہ واقعہ حضرت
حکیم الامتؒ کی وفات سے چھ سال پہلے یعنی ۱۳۵۶ھ کا ہے۔

مسئلہ کی اہمیت اور اس پر مکرر سہ کرر غور و فکر کا تقاضہ تھا کہ یہ ساری
بحث سوالات و جوابات پورے تحریر کے ذریعہ محفوظ کئے جاتے اور فتاویٰ
کا جزو بنتے مگر افسوس اس وقت اس کا اندازہ .... نہ تھا کہ یہ بحث اتنا طول پکڑے
گی، اور اس میں اتنے علمی فوائد ہوں گے، اس لئے زبانی بحث کو ترتیبًا ہی نہیں
کیا گیا۔ تحریریں بھی دو طرفہ تحریروں کے جمع کرنے کا اتفاق نہ ہوا اور یہ بات ہمیشہ
دل میں کھٹکتی رہی کہ ہم نے اس مفید علمی بحث کو ضائع کردیا۔ کچھ عرصہ ہوا مولانا مرحوم
کے صاحبزادے مولانا وکیل احمد صاحب سے اس کا تذکرہ ہوا میں نے ان سے
کہا کہ شاید والدہ محترمہ کے پاس اس خط و کتابت کا کچھ حصہ محفوظ ہو، انھوں نے
تفتیش کی تو صرف ایک خط ملا جو احقر نے مولانا جلیل احمد صاحب کو حضرتؒ کی خدمت
میں پیش کرنے کے لئے لکھا تھا جس پر تاریخ ۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۵۶ھ پڑی ہوئی ہے

ظاہر ہے کہ یہ درمیانی ایک خط ہے نہ اس میں مسئلے کی پوری صورت مذکور ہے نہ پہلے سوال وجواب نہ آخری فیصلہ اس سے کسی خاص نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے مگر اس کو اس لیے شائع کیا جاتا ہے کہ کم از کم اس سے اتنا فائدہ ہوگا کہ استاد شاگرد پیر مرید میں اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو طرزِ اختلاف کیا اور کیسا ہونا چاہیئے کہ بے ادبی کا شائبہ بھی نہ آئے۔ آج کل بہت سے لوگ بڑوں پر تنقید کرنے کو تو اپنا حق سمجھتے ہیں مگر تنقید کے بجائے تنقیص میں مبتلا ہو کر ادب سے محروم ہو جاتے ہیں، اُن کے لئے یہ واقعہ اور اس کا یہ ایک خط ہی سبق حاصل کرنے کے لئے کافی ہے، اس خط کی نقل یہ ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مخدوم بندہ مولوی جلیل احمد صاحب۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر چند روز سے بیمار رہتا اور اب بھی طبیعت صاف نہیں اس لئے جناب کی تحریر کے جواب میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔

اب حضرت والا دامت برکاتہم کی تحریر کو چند بار مطالعہ کیا، حضرت کے شرح صدر کے بعد عمل میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ اس باب میں سب سے بڑی چیز حقیر کی نظر میں بزرگوں کا شرح صدر ہے لیکن طالب علمانہ چند شبہات قلب میں وارد ہوتے ہیں وہ احقر نے اس پرچہ میں ضبط کر دیئے ہیں اگر موقع ملے تو حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش فرمادیں، اور جو کچھ ارشاد ہو اگر اس کو ضبط کر کے حقیر کو بھی مطلع فرمادیں تو عنایت ہو۔

حضرت والا کے ارشادِ گرامی کا ماحصل یہ ہے کہ رجسٹری کی شرط ملائم عقد نہ ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں۔ اس پر یہ شبہ گزرتا ہے کہ کسی شرط کے معتبر ہونے کے لئے متون وفتاویٰ میں صرف یہ شرط تو مذکور ہے کہ خلاف شرع نہ ہو، شرط کے مقتضائے عقد[1]

[1] یعنی ایسے مسائل میں جہاں علماء کا اختلاف ہو اور دلائل دونوں کے موجہ ہوں ۱۲ محمد شفیع

ہونے کی شرط کہیں نظر سے نہیں گذری۔ بلکہ شامی کی عبارت ذیل سے کچھ اطلاق و تعمیم ہی متبادر ہوتی ہے۔ عبارت یہ ہے:

فان شرائط الوقف معتبرة مالم تخالف الشرع وهو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية وله ان يخص صنفا من الفقراء ولذا (؟) اريت لو وقف على فقراء اهل الذمة ولم يذكر غيرهم اليس يحرم منه فقراء المسلمين ولو دفع المتولى و يضمن الخ (شامی استنبولی ص ۴۹۹ ج ۳) تحت مطلب۔ شرائط الوقف معتبرة مالم تخالف الشرع۔

اس سے خلاصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک اپنی ملک کے تصرف میں کوئی شرط بیہودہ و فی سے غیر ملائم عقد بھی لگا دے تو گو اس کے لئے وہ شرط نافع نہ ہو، مگر متولی اس کا پابند ہوگا جیسا کہ تمام عقود میں مالک کے تصرفات اور شرائط خواہ اس کے لئے مفید ہوں یا مضر ملائم ہوں یا غیر ملائم نافذ سمجھے جاتے ہیں۔

دوسرا جزء یہ ہے کہ رجسٹری کی شرط خلاف شرع ہے کیوں کہ حکومت موجودہ کے ماتحت حکام کبھی مسلم ہوتے ہیں کبھی کافر اور کافر کی شہادت معتبر نہیں اس میں یہ شبہ ہے کہ اصل شرط تو کوئی ستم نہیں کہ احتمال شہادت مسلم کا بھی ہے، وقوعاً کسی وقت شہادت کافر اس پر مرتب ہو جائے تو اس کی وجہ سے شرط کو خلاف شرع قرار دینا سمجھ میں نہیں آیا۔

تیسرا جزء یہ ہے کہ رجسٹری اصل مقصود نہیں بلکہ بحسب عرف مقصود اصلی جعل سازی کا انسداد اور ثبوت ہے، رجسٹری بھی چوں کہ عادۃً اس کا ایک ذریعہ ہے اس لئے رجسٹری کا ذکر کر دیا گیا۔

اس میں یہ بات غور طلب ہے کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ رجسٹری خود کوئی مقصود چیز نہیں، لیکن پھر اس کلام کے دو محمل ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مقصود اصلی ثبوت اور خدادعی کا انسداد ہے مگر اس عام مضمون کو خاص عنوان رجسٹری سے تعبیر کر دیا

جیسا کہ حضرتِ والا کی تحریر میں مذکور ہے اور دوسرا محمل اس کلام کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ثبوت اور انسداد جعل سازی کو قرار دے کر اس کے ذرائع اور طرق مختلفہ میں سے واقف نے اپنی نظر اور عادت وعرف کی بنا پر ایک ذریعہ رجسٹری کو متعین کر دیا پہلے محمل کی بنا پر رجسٹری شرط نہ رہے گی بلکہ نفس ثبوت خواہ کسی طریق سے ہو جائے ترمیم کے لئے کافی ہوگا۔ اور دوسرے محمل پر رجسٹری شرط قرار دی جائے گی کیوں کہ واقف نے طرق ثبوت میں سے اس کو متعین کر دیا ہے اور ظاہر عبارت سے احقر کا خیال یہی ہے کہ محمل ثانی متبادر ہے۔

یہ چند طالب علمانہ شبہات ہیں جن کا کچھ جواب ہو جائے تو تشفی ہو جاوے گی ورنہ عمل میں حضرت والا کے شرح صدر سے تجاوز کرنا مناسب نہیں۔

احقر کو جو اس فتویٰ میں کوئی بات کھٹک کی باقی ہے وہ صرف ائمہ اور ارباب فتویٰ کے اقوال متضادہ میں سے قول محمد کو ترجیح دینا ہے کہ یہ اپنی حیثیت سے بہت دقیق معاملہ ہے، اس میں خصوصیت سے حضرت والا کی رائے معلوم ہو جائے تو بہتر ہے

والسلام بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۵۶ھ

انتباہ

اصل معاملہ کیا اور کس طرح تھا، اب حافظہ میں کچھ نہیں رہا، خط میں غور کرنے سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ واقف نے وقف نامہ میں اپنے لئے شرائط وقف میں ترمیم و تبدیل کا حق رکھا تھا اُس کے لئے شرط یہ لگائی تھی کہ اس ترمیم کی بھی رجسٹری کرائی جائے جیسا کہ اصل وقف نامہ رجسٹری ہے۔ بعد میں کوئی ترمیم کی گئی مگر اس کی رجسٹری نہیں ہوئی، اس لئے سوال یہ ہوا کہ یہ ترمیم شرعاً معتبر ہوگی یا نہیں، حضرت نے رجسٹری کی شرط کو غیر لازم معتقد قرار دے کر اس کے بغیر بھی ترمیم کو معتبر قرار دیا، احقر کو اس پر شبہات تھے جن کا اس خط میں ذکر کیا گیا ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲ رجب ۱۳۹۴ھ

تعدیل الهادی فی
تقبیل الایادی

دست بوسی اور قدم بوسی

****

مقامِ تالیف	دار العلوم کراچی
تاریخِ تالیف	۱۴؍ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ
اشاعت اوّل	البلاغ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ

"اس کا سبب تالیف دلچسپ ہے اور اندر حضرت
مفتی صاحب مدظلہم کی تحریر میں ملاحظہ ہو"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

عجائب اتفاق سے ہے کہ آج سے سینتیس سال پہلے وسط ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ میں احقر نے خواب میں دیکھا کہ سیدی و مرشدی حکیم الامت قدس سرہٗ میرے مکان پر تشریف دیئے اور مجھے ارشاد فرمایا کہ تقبیل کے متعلق تم نے کتاب دیکھی ہے یا نہیں (ایسا محسوس کرتا تھا کہ حضرت نے اس سے پہلے کسی اشکال کی وجہ سے اس مسئلہ پر کتابیں دیکھنے کے لئے ارشاد فرمایا تھا، اس کی تاکید کے لئے اس وقت یہ جملہ فرمایا) میں نے عرض کیا کہ اب تک دیکھنے کا وقت نہیں ملا، اب دیکھوں گا، اور غالباً طریقہ محمدیہ میں مسئلہ مل جائے گا۔ یہ تو حضرت سے عرض کیا اور اپنے دل میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ عالمگیری کتاب الحظر والاباحۃ میں یہ مسئلہ ہے، اب اس کو بھی دیکھوں گا، اسی اثناء میں آنکھ کھل گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ تقبیل سے کیا مراد ہے اور اس پر اشکال کیا ہے جس کے لئے کتابیں دیکھنے کا ارشاد ہوا ہے، احقر نے یہ خواب حضرت کی خدمت میں لکھ بھیجا جس کا جواب یہ آیا:

"اول بار تو شرحِ صدر کے ساتھ کچھ سمجھ میں نہ آیا گو تکلف سے کچھ حل ہوا مگر خود تکلف ہی پسند نہیں۔ دوسری بار جو خط پڑھا تو بے ساختہ خیال آیا کہ اس وقت تقبیل ید (دست بوسی) کی جو اہتمام کے ساتھ عادت ہو گئی ہے، میں اُس کے مفسدات بھی بیان کرتا ہوں، شاید خواب میں اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہو گا۔ خواہ عمل کے لئے خواہ ضبط کے لئے تاکہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے، واللہ اعلم۔ اگر کسی وقت اس کے متعلق کچھ لکھا جاوے اس کا نام یہ مناسب ہے۔ تعدیل الہدی فی تقبیل الایدی:

اوّل تو مدلولِ خواب کا پھر تعبیر خواب میں بھی حضرتِ والا نے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کی

تاکید نہیں فرمائی، بلکہ محض اپنی فرصت اور خواہش پر چھوڑ ا، اس لئے اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کا فوری طور پر کوئی ارادہ نہ ہوا اور انجام کار مرورِ ایام سے اس میں ذہول ہو گیا۔

اتفاق سے ۱۳۹۲ھ میں احقر کو عمرہ و زیارت کے لئے حرمین کی حاضری نصیب ہوئی۔ مدینہ طیبہ میں محب محترم اخی فی اللہ مولانا سید محمود بن سید نذیر طرازی مقیم مدینہ منورہ کے پاس ایک قلمی رسالہ شیخ امام محمد عابد سندھی کا جو بارھویں صدی ہجری کے مشائخ سندھ میں سے ہیں اور آپ کے حواشی تقریباً صحاح ستہ پر معروف و مقبول ہیں، نظر پڑا جس کا نام تھا "الکرامۃ والتقبیل" جس میں پہلے کراماتِ اولیاء کے حق ہونے کا مسئلہ بیان فرمایا ہے اس کے بعد علماء و مشائخ کی دست بوسی اور قدم بوسی کو احادیث معتبرہ اور آثار صحابہ و تابعین سے ثابت فرمایا ہے۔ جس سے احقر کو یہ خیال آیا کہ خواب میں جو اس مسئلہ کا طریقہ محمدیہ میں نے دیکھنے کا ذکر کیا ہے، شاید طریقہ محمدیہ سے بھی سنن و آثار مراد ہوں۔ احقر نے اس رسالہ کو خود اپنے قلم سے نقل کر لیا، تاکہ وہ قدیم ارادہ پورا کروں کہ مسئلہ تقبیل پر کچھ لکھوں،

لیکن اب کہ ۱۳۹۰ھ ہے، اس واقعہ کو بھی دس سال ہو گئے اور اس کام کا موقع نہ ملا! خواب میں جس تعویق اور تاخیر کا اظہار ہوا تھا وہ شاید کوئی تکوینی امر تھا کہ اب تک بھی اس کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۳۹۲ھ میں احقر کو شدید قلبی دورہ پیش آیا۔ بظاہر امید زیست نہ تھی، پھر حق تعالیٰ نے کرم فرمایا اور صحت ہو گئی مگر ضعف شدید ہنوز چل رہا ہے اسی حال میں نامکمل تالیفات کی تکمیل اور خاص خاص تالیفات پر نظرثانی کا عزم کیا حق تعالیٰ نے سب سے اہم تالیف تفسیر معارف القرآن کی تکمیل بھی اس واقعہ کے بعد کرا دی اور اس وقت شیخ محمد عابد سندھی کا قلمی نسخہ سامنے آ کر اس کے لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ مفید و نافع بنا دیں اور قبول فرمائیں۔

بندہ محمد شفیع روز عید الاضحیٰ
۱۳۹۲ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ وازواجہ اجمعین

علماء ومشائخ کی دست بوسی وقدم بوسی کے مسئلے میں حضرات فقہاء میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور مستند روایات حدیث اور آثار صحابہ وسلف سے اس کا جواز بلکہ اس پر تعامل ثابت ہوتا ہے مگر جامع ترمذی میں حضرت انس رض کی ایک حدیث سے تقبیل کی ممانعت بھی معلوم ہوتی ہے اس لئے مسئلہ تحقیق طلب ہو گیا، روایاتِ حدیث کی تطبیق وتحقیق کے لئے تو حضرت شیخ محمد عابد سندھی رح کا رسالہ مذکورہ کافی شافی ہے۔ حضرات فقہاء نے جو اس کو منع فرمایا اس کی وجہ اس کی فی نفسہ ممانعت وحرمت نہیں بلکہ بعض مفاسد اور منکرات کی شمولیت کے سبب سے اُن حضرات نے بطور سد ذرائع دست بوسی وقدم بوسی کو منع فرما دیا ہے۔

میں پہلے اس جگہ رسالہ حضرت شیخ محمد عابد سندھی رح کی تلخیص اردو زبان میں لکھتا ہوں ان کا اصل رسالہ عربی زبان میں ہے۔ اس کے بعد حضرات فقہاء کے اختلاف اور اس میں اعدل الاقوال پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

تلخیص مقالہ حضرت شیخ محمد عابد سندھی محررہ ۱۲۲۴ھ

کسی کی تقبیل یعنی بوسہ دینا مختلف اسباب سے ہوتا ہے۔ ایک نفسانی شہوت کے ساتھ بوسہ دینا ہے وہ باتفاق فقہاء بجز اپنی زوجہ یا زرخرید کنیز کے کسی دوسری عورت یا مرد کے لئے جائز نہیں خواہ اِتصول یہ ہو یا سر اور چہرہ وغیرہ پر۔ دوسرا سبب اس کا بزرگانہ شفقت ہوتی ہے جیسے والدین کا اپنی اولاد کے سر یا چہرہ وغیرہ پر بوسہ دینا تیسرا

سبب اس کا تعظیم و تکریم ہوتا ہے جیسا کہ علماء مشائخ یا سلطان عادل کے ہاتھوں وغیرہ پر بوسہ دینا۔ آخری دونوں صورتیں جائز ہیں اور احادیث و آثار سے ثابت ہیں۔

تقبیل شفقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بدن کو بوسہ دیا اور حضرت صدیق اکبر رضؓ نے حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ کے چہرہ پر بوسہ دیا جب کہ اُن کو بخار میں مبتلا دیکھا (کما اخرجہ ابوداؤد) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضؓ کی پیشانی کو بوسہ دیا (کما اخرجہ ابوداؤد) یہ واقعات وہ ہیں کہ تقبیل بزرگانہ شفقت کی بناء پر ہوئی اور اس میں فقہاء کا بھی کوئی اختلاف نہیں۔

تقبیل تعظیم شیخ محمد عابد سندھی نے اپنے رسالہ میں تحریر فرمایا کہ تعظیم و تکریم کے لئے دست بوسی یا قدم بوسی صرف ان لوگوں کی جائز ہے جو عالم صالح یا سلطان عادل ہو یا کوئی دینی شرف و بزرگی رکھتا ہو، ان کے سوا دوسروں کے لئے جائز نہیں حرام ہے، کیوں کہ نصوص حدیث سے اس کا جواز صرف دینی شرافت و فضیلت رکھنے والوں کے لئے ثابت ہے۔ اُن کے سوا دوسروں کے لئے ثابت نہیں۔

البتہ علمی و دینی شرف رکھنے والوں کے لئے دست بوسی بلکہ پابوسی بھی قوی روایات حدیث سے ثابت ہے۔

روایات حدیث متعلقہ تقبیل تعظیم

۱ ــــــ ابوداؤد نے سنن میں اور امام بخاری نے الادب المفرد میں حضرت ذارع رضؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ ایک وفد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، ان کی روایت ہے کہ ہم جب مدینہ طیبہ پہنچے تو ہم اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا

۲ ــــــ نیز ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے اس قصہ کے ذکر کے بعد یہ الفاظ لکھے ہیں (رواہ ابن ماجہ فی کتاب الادب)

قال فدنونا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقبّلنا یدیہ

یعنی ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے دونوں ہاتھوں

کو بوسہ دیا۔

۳ ——— نیز ابوداؤد نے حضرت صدیقہ عائشہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں داخل ہوتے تو وہ استقبال کے لئے کھڑی ہوجاتیں اور آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیتی تھیں۔

۴ ——— نیز ابوداؤد نے حضرت سید بن حصین سے روایت کی کہ وہ ایک انصاری صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز کچھ لوگ بیٹھے ہوئے باہم بات چیت کر رہے تھے۔ ان میں ایک شخص ہنسی مزاح کرنے والا بھی تھا جو ان کو ہنسا رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوکھ کو ایک لکڑی سے چھیڑا تو اس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ (آپ نے میری کوکھ میں لکڑی لگائی ہے میں اس کا بدلہ لوں گا) آپ مجھے بدلہ دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آؤ بدلہ لے لو۔ اس نے عرض کیا کہ میرے بدن پر تو کرتہ نہیں تھا ننگے بدن پر آپ کی چھڑی لگی ہے اور آپ کے بدن پر کرتہ ہے۔ اس لئے انتقام پورا نہیں ہوگا۔ آپ نے قمیص مبارک کچھ اٹھا دی یہ شخص آگے بڑھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لپٹ کر آپ کے پہلو کو بوسے دینے لگا اور پھر عرض کیا، یا رسول اللہ میری غرض اس گفتگو سے یہی تھی۔

۵ ——— طبرانی نے کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے تو آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک اپنے ہاتھوں سے تھاما اور اس کو بوسہ دیا۔

۶ ——— طبرانی نے معجم اوسط میں سند جید کے ساتھ حضرت سلمٰن کوعؓ سے روایت کیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ میں نے آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا تو آپ نے مجھے منع نہیں فرمایا۔

۷ ——— حاکم نے مستدرک میں حضرت بریدہؓ سے روایت کرکے اس کو

صحیح الاسناد قرار دیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے آپ کے سر مبارک اور قدموں کو بوسہ دیا۔

۵ ـــــــ ترمذی، نسائی۔ ابن ماجہ نے حضرت صفوان سے روایت کیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کو بوسہ دیا۔ امام ترمذی نے اس کو روایت کر کے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

حضرت شیخ محمد عابد سندھیؒ نے مذکورہ بالا روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ عالم اور سلطان عادل، ور صاحب شرف دینی کی دست بوسی بلکہ قدم بوسی بھی جائز ہے کیوں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں صفات کے ایسے جامع ہیں کہ جس کی کوئی نظیر عالم میں نہیں۔ اس کے بالمقابل حضرت انس رضؓ کی ایک روایت سے جو تقبیل کی ممانعت معلوم ہوتی ہے وہ ان عام لوگوں کے لئے ہے جو اوصاف ثلثہ مذکورہ سے خالی ہوں۔

۶ ـــــــ ترمذی نے بسند حسن حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کوئی آدمی جو اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا اُس کی تعظیم کے لئے جھک جائے آپؐ نے فرمایا نہیں۔ پھر اس نے سوال کیا کہ کیا معانقہ کرے اور تقبیل کرے، آپؐ نے فرمایا نہیں۔ پھر اس نے سوال کیا کہ کیا مصافحہ کرے؟ تو فرمایا کہ ہاں۔

شیخ محمد عابد صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث ان لوگوں پر محمول ہے جن میں مذکور الصدر اوصاف ثلثہ میں سے کوئی وصف نہ ہو اس کے ساتھ یہ معاملہ معانقہ اور تقبیل کا نہ کیا جائے، صرف مصافحہ کافی ہے اور قرینہ اس کا خود وہ سوال ہے جو حدیث میں مذکور ہے، کیوں کہ سائل نے یہ نہیں پوچھا کہ بڑے عالم یا بزرگ سے ملیں تو کیا کریں بلکہ سوال عام دوست یا بھائی کا کیا ہے جس کے جواب میں آپ نے معانقہ اور تقبیل کو منع فرمایا۔ یہاں تک تو واقعات اس کے تھے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی دست بوسی کی، اب وہ واقعات بھی سنئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کی تقبیل فرمائی۔

۱۰ ——— حدیث میں ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے معانقہ فرمایا اور ان کے منہ کو بوسہ دیا۔ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دیکھا تو انھوں نے بھی آپ کی اتباع میں صدیق رضی اللہ عنہ اکبر کے منہ کو بوسہ دیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا اے ابوالحسن ابوبکر کا درجہ میرے نزدیک ایسا ہے جیسا میرا درجہ میری والدہ کے سامنے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقبیل اور دست بوسی وغیرہ کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں، دوسروں کے لئے بھی جائز ہے بشرطیکہ ان میں اوصاف مذکورہ میں سے کوئی موجود ہو اور مندرجہ ذیل روایات سے اس عدم خصوصیت کی پوری تائید ہو جاتی ہے جن میں صحابہ کرام کا باہم ایک دوسرے کی دست بوسی وغیرہ کرنا ثابت ہے اور اس پر کسی نے نکیر نہیں کیا۔

۱۱ ——— طبرانی نے یحییٰ بن حارث الذماری سے روایت کیا ہے انھوں نے فرمایا کہ میں واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے ملا تو اُن سے کہا کہ آپ کے اس ہاتھ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے انھوں نے فرمایا کہ ہاں، میں نے عرض کیا تو آپ اپنا ہاتھ مجھے دیجئے کہ میں اس کو بوسہ دوں، انھوں نے میری درخواست منظور کر لی۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا، حافظ ہیثمی نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ رجالہ ثقات یعنی اس کی اسناد کے سب رجال ثقہ ہیں۔

۱۲ ——— اور محب طبری نے اپنی کتاب الریاض النضرہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں ابورجاء عطاردی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں مدینہ منورہ میں داخل ہوا تو لوگوں کا ایک مجمع دیکھا اور ایک شخص کو دیکھا جو ایک دوسرے

شخص کے سر کو بوسہ دے رہا تھا اور یہ کہتا جا رہا تھا کہ میں تم پر قربان ہو جاؤں اگر تم نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟ جس کے سر کو بوسہ دیا جا رہا ہے۔ اور بوسہ دینے والا کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ ابوبکر صدیق رضؓ ہیں اور بوسہ دینے والے حضرت عمر بن خطاب ہیں۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کرنے پر حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے جم گئی تھی اور حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کو اس میں خطرہ تھا، اس لئے مخالفت کر رہے تھے، مگر جب صدیق اکبر کی رائے کے مطابق جہاد ہوا اور اس کے نتائج خیر سامنے آئے تو اس وقت عمر بن خطابؓ نے صدیقِ اکبر کی رائے کی تصویب کے لئے یہ عمل مظاہرہ فرمایا۔

۱۳ ——— اور حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حالات میں بروایت ابن مبارک عن داؤد بن ابی الہند عن الشعبی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابت گھوڑے پر سوار ہونے تو حضرت ابن عباسؓ نے زید کی تعظیم و اکرام کے لئے ان کی رکاب تھام لی، حضرت زید نے منع کیا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی! آپ ایسا نہ کریں، مگر حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ:

ھٰکذا امرنا ان نفعل بعلمائنا۔ ہمیں ایسا ہی حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے علماء کے ساتھ تعظیم و اکرام کا ایسا ہی معاملہ کریں۔ حضرت زید بن ثابت رضؓ نے حضرت ابن عباسؓ کے ہاتھ چوم لئے اور فرمایا ھٰکذا امرنا ان نفعل باھل بیت نبینا صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح کی تعظیم و اکرام کا معاملہ کریں۔

یہی واقعہ مستدرک حاکم باب معرفۃ الصحابہ میں بروایت ابن عباسؓ نقل کر کے فرمایا ہے کہ اسناد اس کی صحیح علی شرط مسلم ہے اور حافظ ذہبی نے بھی

اس پر کوئی تنقید نہیں فرمائی، بلکہ سکوت سے اقرار فرمایا ہے۔ اور یہ واقعہ شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں بھی ذکر کیا ہے (ص ۷۳ - ج ۱۶)

۱۴ ـــــــ اور بیہقی نے بروایت ضرار بن عمر حضرت ابو رافع رضہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضہ نے ایک لشکر روم کے جہاد کے لئے بھیجا تھا جن میں حضرت عبد اللہ بن حذافہ صحابی رضہ بھی تھے (اتفاق) ہوا یہ کہ رومیوں کی قوت زیادہ تھی انھوں نے ان مسلمانوں کو قید کر لیا، اور بادشاہ روم نے حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضہ کو حکم دیا کہ تم نصرانی بن جاؤ تو میں تمہیں اپنی سلطنت میں شریک کروں گا۔ حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضہ نے اس سے انکار کیا تو حکم دیا کہ ان کو سولی پر چڑھاؤ اور چاروں طرف سے ان پر تیر برساؤ۔ لوگوں نے تعمیل کی مگر حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضہ سولی پر چڑھتے ہوئے بھی بالکل مطمئن ہشاش بشاش نظر آئے گھبراہٹ پاس نہ تھی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو سولی سے اتارلو اور حکم دیا کہ ایک دیگ میں پانی کو خوب گرم کر کے پکالو۔ جب یہ پانی پوری طرح جوش مارنے لگا تو حکم دیا کہ ایک قیدی کو اس میں ڈال دو۔ وہ ڈالا گیا تو فوراً ہی اس کا گوشت گل کر پانی میں گر گیا اور اس کی ہڈیاں چمکتی نظر آنے لگیں۔ عبد اللہ بن حذافہ کو یہ منظر دکھلانے کے بعد حکم دیا کہ ان کو اسی دیگ میں ڈال دو۔ جب ان کو دیگ کے پاس لے گئے تو یہ رونے لگے۔ بادشاہ نے ان کو اپنے پاس واپس بلایا اور کہا کہ تمہارے رونے کی کیا وجہ ہے تو فرمایا کہ مجھے حسرت و افسوس اس پر ہے کہ میری ایک ہی جان ہے، وہ ایک دفعہ ان کھولتے ہوئے پانی میں پڑ کر ختم ہو جائے گی تو مجھے حسرت ہی رہ جائے گی، کاش میری سو جانیں ہوتیں اور ایک ایک کر کے اس پانی میں ڈالی جاتیں اور یہ پُر کیف سلسلہ کچھ دیر تک چلتا۔ بادشاہ روم پر حق تعالیٰ نے ان کی اس ثابت قدمی کا رعب ڈال دیا۔ وہ سخت تعجب میں پڑ گیا اور کہنے لگا کہ اچھا بس تم ایک کام کر لو کہ میرے سر کو بوسہ دے دو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضہ نے فرمایا کہ شرط یہ ہے کہ سب مسلمان قیدیوں کو آزاد کیا جائے۔ شاہ روم نے اس کو بھی مان لیا تو عبد اللہ بن حذافہ رضہ نے اس کے سر

کو بوسہ دے دیا کیوں کہ نہ وہ کوئی ذلت کی بات تھی نہ کوئی گناہ اور اپنی اور مسلمان قیدیوں
کی جان اس سے بچتی تھی۔ اس لئے قبول کرلیا، جس کے نتیجہ میں شاہ روم نے ان کو
مع سب مسلمان قیدیوں کے آزاد کردیا۔

جب یہ سب مسلمانوں کے ساتھ واپس حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں پہنچے
تو عمر بن خطابؓ کھڑے ہوگئے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

ابن عساکر نے اس قصہ کا ایک شاہد اور بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایت
سے بیان کیا ہے اور ہشام بن عثمان کے فوائد میں مرسل زہری سے نقل کیا ہے۔

۱۵ ——— طبقات ابن سعد ص ۲۰۳، ج ۶ میں عاصم بن ابی النجود کے
حالات میں حضرت ابووائل سے نقل کیا ہے کہ ابووائل کبھی کبھی گاؤں میں جاتے اور
چند روز غائب رہتے تھے جب واپس آکر حضرت عاصم سے ملتے تو اُن کے ہاتھ
کو بوسہ دیتے تھے۔

۱۶ ——— مستدرک حاکم باب معرفۃ الصحابہ ص ۲۵۷، ج ۳ میں
حضرت ابوسفیانؓ کے مناقب میں لکھا ہے کہ غزوہ حنین میں حضرت ابوسفیانؓ بھی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، حضرت عباسؓ نے آپ سے عرض کیا کہ یہ آپ
کا چچا زاد بھائی ابوسفیان بن حرب ہے، آپ ان سے [illegible] ہے۔ خوش ہوجائیے
کیونکہ فتح مکہ سے پہلے جتنے معرکے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف
ہوتے اُن سب میں ابوسفیان ہی کفار کے لشکر کی قیادت کرتے تھے فتح مکہ میں مسلمان
ہوگئے مگر حضرت عباسؓ کو یقین تھا کہ اس کے باوجود آپ کے قلب مبارک میں ان
کی طرف سے تکدر ہوگا، اسی لئے یہ درخواست کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ آپ کی سفارش قبول ہے میں ان سے خوش ہوگیا اللہ تعالیٰ ان کی ہر وہ عداوت جو
میرے خلاف کی ہے معاف فرمادے۔ پھر حضرت عباسؓ کی طرف توجہ فرما کر فرمایا کہ وہ
بیشک میرا بھائی ہے۔ حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کے قدم مبارک کو بوسہ
دیا جب کہ وہ گھوڑے کی رکاب میں تھا۔

روایاتِ مذکورہ بالا سے واضح ہوگیا کہ بزرگانِ دین کی دست بوسی وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین اور ائمہ دین میں بلانکیر و اختلاف ثابت ہے بعد کے علماء میں بھی یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

۱۷ ـــــــ ابن السنی نے عمل الیوم واللیلہ میں ابوبکر بن محمد بن عمر سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک روز حضرت ابوبکر بن مجاہد کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت شبلی اس مجلس میں تشریف لائے تو ابوبکر بن مجاہد کھڑے ہوئے اور ان سے معانقہ کیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرے سردار آپ شبلی کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں۔ ابوبکر بن مجاہد نے فرمایا کہ میں نے ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو میرے ایک خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ کیا تھا کہ شبلی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ شبلی کے ساتھ یہ معاملہ فرماتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ اپنی نماز کے بعد یہ آیت پڑھا کرتے ہیں لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم الآیۃ اور اس کے بعد مجھ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں۔

۱۸ ـــــــ حافظ ابو موسیٰ مدینی وغیرہ نے حضرت سفیان سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ایک مجلس میں بیان کیا کہ عالم اور سلطانِ عادل کی دست بوسی سنت ہے اس مجلس میں حضرت عبداللہ بن مبارک موجود تھے وہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دے کر کہا کہ اس سنت پر عمل کرنے کے لئے اس سے اچھا موقع کہاں ملے گا۔

۱۹ ـــــــ امام مسلم بن حجاج کا واقعہ جو امام بخاری کے ساتھ پیش آیا کہ امام مسلم نے امام بخاری کی پیشانی کو بوسہ دیا اور قدم بوسی کا ارادہ کیا یہ کتبِ حدیث و رجال میں معروف و مشہور ہے۔ مذکورہ روایات سے علماء امت کا باہم معاملہ تقبیل کا بغیر کسی نکیر و انکار کے ثابت ہوگیا۔ اور اس کی مزید تاکید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ کی طرف سے پیش آیا کہ جب

وہ جنازے پر پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو بوسہ دیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمٰن بن مظعون کے چہرہ پر ان کی موت کے بعد بوسہ دیا۔

ان تمام روایات واقعات سے ثابت ہوا کہ علماء و مشائخ اور دینی شرف رکھنے والے حضرات کی دست بوسی بلکہ قدم بوسی بھی نیز پیشانی وغیرہ پر بوسہ دینا سنت اور تعامل صحابہ و تابعین سے بلا کسی نکیر کے ثابت ہے انتہیٰ از رسالہ شیخ محمد عابد سندھی محررہ ۱۲۲۴ھ)۔

اقوالِ فقہاء

مبسوط شمس الائمہ سرخسی کتاب الاستحسان جلد عاشر ص ۱۴۹ میں لکھا ہے۔

۲۰ ——— روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبل فاطمۃ رضی ویقول اجد منہا ریح الجنۃ و قبل ابو بکر راس عائشۃ رضی وقال صلی اللہ علیہ وسلم من قبل رجل امہ فکانما قبل عتبۃ الجنۃ۔ (مبسوط)

روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی کی تقبیل فرماتے اور فرماتے تھے کہ مجھے اس میں سے جنت کی خوشبو آتی ہے اور صدیق اکبر رضہ نے حضرت عائشہ کے سر کو بوسہ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنی ماں کا پاؤں چوما گویا اس نے جنت کی چوکھٹ کو بوسہ دیا (مبسوط)

مبسوط شمس الائمہ ہی میں محمد بن المنکدر رح سے نقل کیا ہے کہ ایک رات میں اپنی والدہ کے پاؤں دباتا رہا اور میرا بھائی ابو بکر تمام رات نماز میں مشغول رہا اور مجھے ہرگز پسند نہیں کہ میں اپنی رات کو ان کی رات سے بدل لوں۔

عورتوں کی تقبیل اور ہاتھ سے چھونے کے متعلق ان روایات کو نقل کر کے شمس الائمہ نے فرمایا کہ یہ تقبیل اور بدن کو مس کرنا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب کہ

اپنے نفس سے شہوت کا خطرہ ہو نہ اُس عورت سے جس کی تقبیل کی جائے اگرچہ دونوں ہی میں سے ہو اور خواہ تقبیل بدن کے کسی حصہ پر ہو اور جب خطرہ شہوت کا اس کے لئے یا اپنے لئے ہو تو قطعاً جائز نہیں (مبسوط، ص ۱۴۹ ج ۱۰)

واما حكم المس فلا خلاف ان المصافحة حلال لقوله عليه السلام تصافحوا تحابوا وروي عنه صلى الله عليه وسلم انه قال اذا لقي المؤمن اخاه فصافحه تناثرت ذنوبه وان الناس يتصافحون في سائر الاعصار في العهود والمواثيق فكانت سنة متوارثة.

واختلف في القبلة والمعانقة قال ابو حنيفة رحمه الله يكره للرجل ان يقبل فم الرجل او يده او شيئا منه او يعانقه وروي عن ابي يوسف رحمه الله انه لا بأس بالتقبيل والمعانقة لما روي ان جعفر بن ابي طالب رضي الله عنه لما قدم من الحبشة عانقه سيدنا رسول الله صلى الله عليه وسلم وقبل بين عينيه وكذا روي ان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا اذا رجعوا من اسفارهم كان يقبل بعضهم بعضا ويعانق بعضهم بعضا واحتج بما روي انه سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم فقيل ايقبل بعضنا بعضا فقال لا فقيل ايعانق بعضنا بعضا فقال عليه الصلوة والسلام لا فقيل ايصافح بعضنا بعضا فقال عليه الصلوة والسلام نعم وذكر الشيخ ابو منصور ان المعانقة انما تكره اذا كانت شبيهة بما وضعت مشتهاة في حالة التجرد واما اذا قصد بها المبرة والاكرام فلا تكره وكذا التقبيل الموضوع لقضاء الوطر والشهوة هو المحرم فاذا زال تلك الحالة ابيح وعلى هذا الوجه الذي ذكره الشيخ يحمل الحديث الذي احتج به ابو يوسف.

(بدائع ص ۱۲۴، ج ۵ كتاب الاستحسان)

(ترجمہ) اور ہاتھ سے چھونے کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ مصافحہ

حلال ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپس میں مصافحہ کیا کرو تاکہ باہم محبت بڑھے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی مومن اپنے بھائی مومن سے ملے اور مصافحہ کرے تو اس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں اور اس لئے کہ مصافحہ کا رواج ہر زمانے میں معاہدات کے مواقع میں رہا ہے اس لئے یہ سنت متواترہ ہے اور بوسہ دینے اور معانقہ کے مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور محمد نے فرمایا کہ ایک مرد دوسرے مرد کے منہ پر یا ہاتھ پر یا اس کے کسی اور عضو پر بوسہ دے یا معانقہ کرے یہ مکروہ ہے اور ابو یوسف نے رخصت دی ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور دلیل اُن کی وہ روایت ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب حبشہ سے واپس ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معانقہ فرمایا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اسی طرح یہ روایت کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جب اپنے سفروں سے واپس آتے اور آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو بوسہ دیتے تھے اور معانقہ کرتے تھے۔ اور ابو حنیفہ اور محمد نے اس روایت سے استدلال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ہم آپس میں ملا کریں تو کیا ایک دوسرے کو بوسہ دیں؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا معانقہ کریں، آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ آپس میں مصافحہ کیا کریں تو فرمایا کہ ہاں۔ شیخ ابو منصور نے فرمایا معانقہ کی صورت میں کراہت ہے جب کہ اس طرز پر ہو جو شہوت کے ساتھ کیا جاتا ہے جب کہ دونوں پر کپڑے حائل نہ ہوں لیکن جب کہ اس سے حسن اکرام اور احسان مقصود ہو تو مکروہ نہیں یہی حکم بوسہ دینے کا ہے کہ جو بوسہ شہوت کے ساتھ دیا جاتا ہے اس کے مشابہ ہو تو جائز نہیں ورنہ جائز ہے۔ اور ابو یوسف نے جس حدیث سے جواز کا قول اختیار کیا وہ حدیث اسی صورت پر محمول ہے کہ اس میں شہوت کا کوئی خطرہ یا مشابہت نہ ہو۔

اور فتاوی قاضی خان کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے کہ:

ویکرہ ان یقبل الرجل فم الرجل او یدہ او شیئا منہ فی قول

ابی حنیفۃ و محمد ولا بأس بالمصافحۃ وقال ابویوسف لا باس بالتقبیل والمعانقۃ فی ازار واحد فان کانت المعانقۃ من فوق قمیص او جبۃ اوکانت القبلۃ علی وجہ المسرۃ دون الشھوۃ جاز عند الکل۔
(فتاوی قاضی خاں برحاشیہ عالمگیری ص ۴۴۴، ج ۲)

مکروہ ہے کہ ایک مرد دوسرے مرد کے منہ پر بوسہ دے یا اس کے ہاتھ کو یا کسی اور حصہ بدن کو ابوحنیفہؒ اور محمدؒ کے قول میں اور مصافحہ میں کوئی مضائقہ نہیں اور ابویوسف نے فرمایا کہ بوسہ دینے اور معانقہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور جب وہ کرتے اور جبہ کے اوپر سے اور بوسہ دینا بطور مسرت واکرام کے ہو شہوت سے نہ ہو تو سب کے نزدیک جائز ہے۔

فتاوی قاضی خاں کی آخری عبارت سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقبیل و معانقہ میں جو اختلاف امام ابوحنیفہ رح و محمد رح کا نقل کیا جاتا ہے وہ اس صورت میں ہے جس میں خطرہ شہوت کا یا مشابہت اس کی پائی جائے ورنہ معانقہ اور تقبیل تینوں آئمہ کے نزدیک جائز ہے۔ بدائع میں شیخ ابومنصور کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

فی الدر المختار طلب من عالم او زاھد ان یدفع الیہ قدمہ ویمکنہ من قدمہ لیقبلہ اجابہ وقیل لا یرخص فیہ وفی رد المحتار قولہ اجابہ لما اخرجہ الحاکم ان رجلا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ارنی شیئاً ازداد بہ یقیناً فقال اذھب الی تلک الشجرۃ فادعھا فذھب الیھا فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدعوک فجاءت حتی سلمت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لھا ارجعی فرجعت ثم اذن لہ فقبل راسہ ورجلیہ وقال لو کنت اٰمر احداً ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا وقال صحیح الاسناد اھ من رسالۃ الشرنبلالی (شامی ج ۵ ص ۳۷۸)

کسی عالم سے کوئی درخواست کرے کہ اپنے قدم ہمیں دیں کہ ہم ان کو بوسہ دیں تو

اس کے لئے جائز ہے کہ اس کی درخواست قبول کرے اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہیں۔ شامی نے اس کی شرح میں فرمایا کہ جواز پر دلیل وہ حدیث ہے کہ ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز دکھلا دیجئے جس سے میرا یقین ایمانی بڑھ جائے آپ نے کسی درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس کے پاس جاؤ اور میرے پاس بلا لاؤ، وہ گیا اور درخت سے کہا کہ تجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاتے ہیں۔ وہ درخت اسی وقت حاضر ہوا اور آپ کو سلام کیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اپنی جگہ واپس چلے جاؤ تو وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد اُس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپ کے سر مبارک اور دونوں قدموں کو بوسہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں اگر کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے۔ حاکم نے اس حدیث کی روایت کی اور فرمایا کہ صحیح الاسناد ہے۔

اور عالمگیری ص ۴۰،۴ جلد ۵ میں ہے۔

طلب من عالم او زاھد ان یدفع الیہ قدمہ لیقبلہ لا یرخص فیہ ولا یجیبہ الیٰ ذلک عند البعض و ذکر بعضھم یجیب الیٰ ذلک۔

اگر کسی عالم یا بزرگ زاہد سے درخواست کی جائے کہ اپنا قدم دیجئے کہ ہم بوسہ دیں تو اس شخص کے لئے جائز نہیں کہ یہ درخواست قبول کرے۔ بعض کے نزدیک اور بعض نے اجازت دی ہے۔

اور اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ:

"اگر یکے از عالم یا زاہد التماس پائے بوسی او کند باید کہ اجابت نکند و نگزارد کہ ببوسد و در قنیہ گفتہ لا باس بہ است۔"

اور مظاہر حق شرح مشکوٰۃ میں حدیث وفد عبد القیس نقل کرنے کے بعد فرمایا:

"ظاہر اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چومنا پاؤں کا جائز ہے مگر فقہاء اس کو منع کرتے ہیں۔ الخ"

اس مسئلہ میں ایک اختلاف ائمہ حنفیہ کا بدائع اور قاضی خان کے حوالہ سے اوپر ذکر کیا ہے، اس میں دست بوسی اور قدم بوسی کے ساتھ معانقہ بھی شامل ہے۔ اس اختلاف کا حاصل قاضی خان کی تحقیق کے مطابق یہ تھا کہ جس صورت میں یہ افعال ایسے طرز پر ہوں جس میں شہوت کا خطرہ اور اشتباہ ہو، اُس کو ابوحنیفہ رح و محمد رح نے مکروہ فرمایا ہے اور جہاں یہ صُورت نہ ہو وہ متفق علیہ جائز ہے۔

اور درمختار شامی اور عالمگیری وغیرہ کے حوالے سے جو اختلاف اوپر نقل کیا گیا ہے یہ اختلاف فقہاء متاخرین کا ہے اور اصل مسئلہ تقبیل و معانقہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ منشاء اختلاف کا یہ ہے کہ جس شخص کی قدم بوسی دست بوسی کی جائے کیا اس کے لئے بھی یہ جائز و درست ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں بڑھا کر لوگوں کو اس کا موقع دے۔

اور وجہ اختلاف کی بظاہر یہ ہے کہ اس صورت میں اگر حقیقۃً عجب و تکبر نہ بھی ہو تو صورۃً ایک متکبرانہ فعل ہے جس سے تکبر پیدا ہو جانے کا احتمال غالب ہے، اس لئے بعض فقہاء نے اس خطرہ کی بناء پر مکروہ قرار دیا بعض نے اصل فعل کے جواز پر نظر کر کے جائز فرما دیا۔

سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے سامنے یہ آخری سوال بعض لوگوں نے پیش کیا تو آپ نے اس کا جواب حسبِ ذیل تحریر فرمایا:۔

"تاویل بلا دلیل غیر مسموع ہے اور ظاہر سے بلا صارف عدول نہیں کیا جا سکتا پس صحیح جواز تقبیل قدم فی نفسہٖ ہے اور فقہاء کے منع کو عارض مفسدہ پر محمول کیا جائے گا" (امداد الفتاوٰی مبوّب جلد خامس ص ۲۴۵، مورخہ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ)

مذکورہ سوال کے ساتھ چند اور سوال بھی تھے جو اس معانقہ سے متعلق ہیں

ان کا نقل کرنا بھی مناسب معلوم ہوا۔

سوال دوم

"اگر قدم بوسی بلا کراہت جائز ہو تو سر جھکا کر اگرچہ بحد رکوع و سجود ہو تو جائز ہے یا نہیں؟ اس امر میں ہمارے دیار کے علماء کے درمیان اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ جب قدم بوسی جائز ہے تو اگرچہ بصورت رکوع و سجود انحناء راس سے ہو تب بھی جائز ہے اور ایک جم غفیر علماء کہتے ہیں کہ قدم بوسی اس صورت میں جائز ہے جب کہ انحناء راس بہیئت رکوع و سجود نہ ہو اور یہ لوگ اس بارے میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں جو مشکوٰۃ کے باب المصافحہ والمعانقہ میں ہے، عن انس قال قال رجل یا رسول اللہ الرجل منا یلقی اخاہ او صدیقہ اینحنی لہ قال لا، رواہ الترمذی مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد چہارم ص ۷۰ ۳ میں مرقوم ہے (اینحنی لہ) الانحناء وھو امالۃ الراس والظھر تواضعا وخدمۃ (قال لا) ای فانہ فی معنی الرکوع وھو کالسجود من عبادۃ اللہ تعالیٰ وفی شرح مسلم للنووی حنی الظھر مکروہ لحدیث الصحیح فی النھی عنہ و لا تعتبر کثرۃ من یفعلہ ممن ینسب الی علم وصلاح انتہی اشعۃ اللمعات ص ۲۴ ج ۴ وانحناء مائل گردانیدن سر و پشت است وطیبی از محی السنۃ نقل کردہ کہ انحناء ظہر مکروہ است، از جہت ورود حدیث صحیح در نہی ازاں اگرچہ بسیارے از انہا کہ منسوب بعلم وصلاح اند، آنرا می کنند اما اعتبار و اعتماد بداں نتواں کرد و در مطالب المومنین از شیخ ابو المنصور نقل کردہ کہ اگر بوسہ دہد کسے پیش یکے زمین را یا پشت دوتا کند یا سر نگوں گرداند بکفر نگردد بلکہ آثم است زیرا کہ مقصود تعظیم است

زعبادت ست، و بعضے مشائخ در منع ازاں تغلیظ و تشدید بسیار کردہ وگفتہ کاد الانحناء ان یکون کفرا انتھیٰ ۔ اسی طرح مظاہر حق کی جلد چہارم کے ص ۱۶۱ میں مذکور ہے اور مجمع الانہر ص ۲۲۰ ج ۲ میں ہے فی القہستانی الایماء فی السلام الی قریب الرکوع کالسجود فی العبادۃ ویکرہ الانحناء لانہ یشبہ فعل المجوس اور ملتقی الابحر میں ہے فی المجتبیٰ الایماء بالسلام الی قریب الرکوع کالسجود د الانحناء مکروہ ردالمحتار کتاب الکراہت میں ہے فی الزاھدی الایماء فی الاسلام الیٰ قریب الرکوع کالسجود وفی المحیط انہ یکرہ الانحناء للسلطان وغیرہ انتھیٰ ۔

ان عبارتوں سے ظاہر ہے کہ انحناء کے طور پر قدم بوسی ناجائز ہے اور عالمگیری کے تقبیل رجل میں جو یہ روایت ہے کہ طلب من عالم اوزاھد ان یدفع الیہ قدمہ لیقبلہ اور درمختار میں جو یہ روایت ہے طلب من عالم اوزاھد ان یدفع الیہ قدمہ ویمکنہ من قدمہ لیقبلہ اور غایت الاوطار کی جلد چہارم ص ۲۱۹ پر جو اس کا ترجمہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے عالم یا زاہد سے اس کی درخواست کی کہ اپنا قدم اس کی طرف بڑھادے اور اس کو چومنے دے ، یہ بآواز بلند بتاتی ہے کہ یہ قدم بوسی بطریق انحناء اور امالہ نہیں ہے ۔ اب کس فریق کا قول حق اور احق بالاتباع ہے ؟

الجواب : جو انحناء مقصوداً ہو وہ ناجائز ہے اور جو بضرورت تقبیل کے لازم آجائے وہ حکم میں تقبیل کے تابع ہے ۔

سوال سوم

تقبیل قدم کے کیا معنی ہیں ؟ قدم کو بوسہ دینا یا حجر اسود کی طرح ہاتھ سے قدم

کو مس کر کے ہاتھ کو بوسہ دینا یا عام معنی لئے جاویں۔

جواب

معنی اوّل ہی اس کا مدلول ہے اور ثانی بے اصل ہے (ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ)

خلاصۂ کلام

روایاتِ حدیث اور آثار صحابہ و تابعین اور اقوال ائمہ و فقہاء جن کی تفصیل آپ اوپر پڑھ چکے ہیں اُن سے "مسئلہ تقبیل" کے متعلق مندرجہ ذیل احکام حاصل ہوئے۔

۱ـــــــ تقبیل و معانقہ اگر شہوت کے ساتھ ہو وہ باتفاق امت اپنی بیوی یا زر خرید کنیز کے علاوہ کسی کے ساتھ جائز نہیں۔ اسی طرح جب اپنے نفس میں یا دوسری جانب میں شہوت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

۲ـــــــ اور جو تقبیل اور معانقہ چھوٹوں پر شفقت یا بزرگوں کی تعظیم واکرام کے لئے ہو وہ باتفاق جائز اور سنت سے ثابت ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی امر منکر یعنی ناجائز کام شامل نہ ہو جائے۔

۳ـــــــ اور جہاں تقبیل و معانقہ بلکہ مصافحہ میں بھی کچھ منکرات شامل ہو جائیں وہ باتفاق مکروہ ہے وہ منکرات جو ایسے مواقع میں شامل ہو جاتے ہیں کئی قسم کے ہیں اُن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ اُن سے بچ سکیں۔

تقبیل اور معانقہ و مصافحہ میں شامل ہونے والے منکرات

اوّل یہ کہ جس شخص کو ان امور سے اپنے نفس میں تکبر دِ اعجاب پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو درست نہیں کہ دوسرے لوگوں کو دست بوسی، قدم بوسی وغیرہ کا موقع دے۔

دوسرے یہ کہ جس صورت میں یہ خطرہ ہو کہ اس عمل سے دوسرے شخص کو ایذاد تکلیف پہنچے گی تو وہاں اُن امور میں سے کچھ یہاں تک کہ مصافحہ بھی جائز نہیں مثلاً جب دیکھے

کہ جس سے ملاقات کرنا ہے وہ مشغول ہے یا کسی ضروری کام میں ہے اُس وقت اس کے ساتھ معانقہ و تقبیل بلکہ مصافحہ کی کوشش کرنا بھی اس کی ایذا و تکلیف کا سبب ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس سے اجتناب چاہیئے۔

تیسرے یہ کہ جہاں یہ خطرہ ہو کہ جس کی دست بوسی کی جا رہی ہے یہ اس کے نفس میں تکبر و غرور پیدا کر دے گا تو اس سے اجتناب ضروری ہے خصوصاً دست بوسی اور قدم بوسی اگر کسی مجمع کے اندر ہو تو ایک مفسدہ تو یہی ہے کہ اس میں وقت بڑا خرچ ہو گا کام کی ضروری باتوں میں خلل آئے گا اور دوسرا بڑا مفسدہ یہ ہے کہ جس جگہ اس کی رسم اور عادت ہو جائے تو ہر آنے والا یا تو خواہی نخواہی دست بوسی اور قدم بوسی میں اہل مجلس کا اتباع کرے یا پھر سب سے مختلف ہونے کا گویا عیب کرے جس سے اور بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے جو واقعات آپ نے اس معاملہ میں ملاحظہ فرمائے ان کو اسی درجہ میں رکھنا ضروری ہے جس درجہ میں سنت اور تعامل سلف سے اس کا ثبوت ہوا ہے، ان تمام روایات و واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کام ہوئے مگر اتفاقی طور پر کسی ایک دو آدمی نے کر لئے نہ اس کی عادت تھی نہ سب مجمع کو یہ کام کرنا تھا نہ کوئی کسی کو اس کی دعوت دیتا تھا اور نہ کوئی کسی کی حرص کرتا تھا بس اسی سادگی اور عدم پابندی کے ساتھ جہاں ہوں جائز و درست بلکہ مستحب بھی ہو سکتا ہے، جہاں یہ سادگی نہ رہی پابندی آگئی یا عادت پڑ گئی تو وہ مفسدہ سے خالی نہیں اور فقہاء کا یہ ضابطہ معروف و مشہور ہے کہ اگر کسی مستحب کام میں کچھ منکرات شرعیہ شامل ہو جائیں تو اس مستحب کو بھی چھوڑ دینا واجب ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ سنن مقصودہ میں سے نہ ہو، جیسے جماعت نماز کے بعد کے مصافحہ کو بعض فقہاء نے اس لئے مکروہ قرار دیا کہ اس کو نماز کی ایک سنت جیسا قرار دے دینا خلاف شرع اور گناہ ہے۔

بس مختصر بات یہی ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ میں اس کی جو حد منقول ہے [illegible] پر رکھا جائے تو بلا شبہ دست بوسی، قدم بوسی [illegible]

مصافحہ سب جائز مگر سنت ومستحب ہیں اور جہاں اس میں غلو کا پہلو یا دوسروں کی ایذا شامل ہوجائے وہ گناہ ہے۔

میرا وہ خواب جو اس رسالہ کی وجہ تالیف ہوا ہے اس میں حضرت سیدی حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے یہی فرمایا تھا کہ اس وقت جو لوگوں میں دست بوسی کی عادت ہوگئی ہے میں اس کے محذورات ومنکرات بیان کیا کرتا ہوں وہ اسی طرح کے محذورات ہیں کہ سنت کو حد سنت سے بڑھا کر اس میں غلو کرنے سے یا دوسروں کی ایذا کا سبب بننے سے پیدا ہوتے ہیں۔

الحمد للہ کہ یہ رسالہ روز عید الاضحیٰ ۱۳۹۲ھ سے شروع ہو کر ۱۴ ذی الحجہ کو پانچ روز میں مکمل ہوا۔ واللہ ولی التوفیق۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

مروّجہ سیرت کمیٹی اور اس کی شرعی حیثیت

اشاعت اول ـــ دار الاشاعت دیوبند ۱۳۵۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارہ میں کہ آج کل ملک کے اندر سیرۃ کمیٹی اور یوم النبی کے نام سے ماہ ربیع الاول میں جو مجالس منعقد کی جاتی ہیں جس میں بہت سے امور شرعی حدود سے متجاوز اور منکر بھی خلط ہو جاتے ہیں، روایات کی نقل میں معتبر اور غیر معتبر کا کوئی معیار قائم نہیں رکھا جاتا۔

نیز سال بھر کے بارہ مہینوں میں محض ربیع الاول اور مہینے کے تیس دنوں میں سے صرف بارہ تاریخ کی خصوصیت اس کے لیے رکھی گئی ہے۔

نیز بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس سیرۃ کمیٹی کے پردہ میں قادیانی اثرات اور اس کی تحریک کی تبلیغ و اشاعت کی جاتی ہے اور مقصد بھی اس تحریک سے اشاعت مذہب قادیان ہے۔

لہٰذا عرض ہے کہ ان قیودات مروجہ اور تخصیصات کے ساتھ ان سیرۃ کمیٹیوں کا انعقاد از روئے شرع شریف کیا حیثیت رکھتا ہے بینوا توجروا۔

الجواب

سیرت کمیٹی کی تحریک ابتداء میں سخت تلبیس کے ساتھ اٹھائی گئی، اس کو منکرات اور رسوم بدعیہ سے پاک دکھلایا گیا اور ایسے دل فریب مقاصد و قواعد سطح پر رکھے گئے جن کو دیکھ کر ہر شخص موافقت پر مجبور ہو، کیونکہ بلا شبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور آپ کے حالات و مقالات کو سننا نوں تک خصوصاً اور تمام عالم میں عموماً

صحیح صورت میں شائع کر دینا اسلام اور مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے اور تمام مدارس و مکاتب اور تعلیم و تبلیغ کی روح یہی ہے، اس کی ضرورت کا احساس قلوب میں پہلے ہی سے تھا، اس تحریک نے اس کو عملی صورت میں آتے ہوئے دیکھ کر عام مسلمانوں نے اس آواز پر لبیک کہا لیکن اہل علم و فراست کو پہلے ہی سے یہ خطرہ تھا کہ مبادا یہ تحریک کوئی بدعت و ضلالت کی صورت اختیار کر لے اور اگرچہ اس وقت اس کو سادہ رنگ میں ظاہر کیا جاتا ہے لیکن عوام کی آمیزش خیال سے کچھ عرصہ کے بعد اس میں بھی وہی رسمی بدعات و خرافات شامل ہو جائیں جو عید میلاد النبی وغیرہ کی قدیم رسوم میں ہیں۔ اس لیے علمائے کرام کی بہت بڑی جماعت نے تو اسی وقت سے اس کی موافقت کسی عنوان سے نہیں کی اور بعض مقتدر حضرات علماء نے موافقت کی بھی تو ایسی قیود و شرائط لگا کر کہ جن کی وجہ سے کوئی بدعت اس میں شامل نہ ہو سکے، لیکن افسوس کہ بانیانِ تحریک نے اس میں خیانت سے کام لیا اور ان کی تحریرات میں سے قیود و شرائط کو حذف کر کے مطلقاً اپنی موافقت شائع کر دی، جس کا راز یہ تھا کہ ان کو ان قیودات و شرائط کو حذف کرنا اور اس تحریک کو مجموعہ بدعات بنانا تھا۔ چنانچہ تین سال کے قلیل عرصہ میں اس کی حقیقت کھل گئی اور یہ تحریک اصلی صورت میں دنیا کے سامنے آگئی تو معلوم ہوا یہ وہی مشہور بدعت ہے جس کو پہلے عید میلاد کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف امام حدیث و تفسیر علامہ شاطبی اپنی کتاب الاعتصام میں تحریر فرماتے ہیں: واما غیر العالم وھو الواضع لہا یعنی البدعۃ فانہ لا یمکن ان یعتقدھا بدعۃ بل ھی عندہ مما یلحق بالمشروعات کقول[1] من جعل یوم الاثنین یصام لانہ یوم مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجعل الثانی عشر من ربیع الاول ملحقا بایام الاعیاد لانہ علیہ السلام ولد فیہ۔ (اعتصام ص ۲۲ ج ۲)

[1] بدعات غیر مشروعہ کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں جیسے اس شخص کا قول جو یوں کہے کہ پیر کے روز روزہ رکھنا اس لیے ثواب ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے اور ۱۲ ربیع الاول کو عیدین کے ساتھ ملحق کر دے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں پیدا ہوئے ہیں ۱۲۔

اور ساتویں صدی ہجری کے مشہور و معروف بزرگ علامہ ابن الحاج رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مدخل میں اس بحث کو مستقل فصل میں بیان فرمایا، جس کے متفرق جملے درج ذیل ہیں۔

ومن جملة[۱] ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذلك من اكبر العبادات واظهار الشعائر ما يفعلونه في شهر ربيع الاول من المولد وقد احتوى على بدع ومحرمات الخ مدخل ص۲ ج۱۔

باقی رہے وہ موہوم منافع جن کو اس تحریک کا سنگ بنیاد بتلایا جاتا ہے، اول تو ان محرمات و منکرات کے ساتھ جو ان جلسوں میں مشاہد ہو رہے ہیں ان کا حصول ہی متصور نہیں، اگر بالفرض وہ منافع حاصل بھی ہوں مگر اتنی مستقل بدعت و ضلالت اور بہت سے معاصی کا ذخیرہ جمع کر کے حاصل ہوں تو کیا کوئی ان قلیل منافع کی وجہ سے اس مجموعہ منکرات کو جائز کہہ سکتا ہے اور اگر اس کو جائز کہا گیا تو پھر دنیا میں کوئی گناہ گناہ نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ کوئی بڑے سے بڑا گناہ اور معصیت ایسا نہیں جس میں کچھ نہ کچھ منافع و فوائد نہ ہوں ورنہ [illegible] کے پاس ہی کون جاتا۔ لیکن ان منافع کے موجود ہونے کے باوجود قرآن کریم کا فیصلہ ایسے امور میں یہی ہے کہ اثمهما[۲] اكبر من نفعهما۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے اور صرف سطحی اور وقتی چیزوں سے گذر کر اسلامی تاریخ کے مجموعہ حالات پر نظر ڈالی جائے تو بلا شبہ ہر آنکھوں والے پر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے کسی وقت اور کسی حال وہ طریقہ نافع نہیں ہو سکتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی سنت سے علیحدہ ہو۔

مسلمانوں کی دینی ترقیات و منافع تو اتباع پر موقوف ہیں ہی لیکن ساڑھے تیرہ سو برس

۱؎ منجملہ ان بدعات کے جو لوگوں نے نکالی ہیں وہ ہے جس کے ساتھ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ سب سے بڑی عبادت اور دین کی نشر و اشاعت ہے وہ بدعت ہے جو ربیع الاول میں مجلس مولد کے نام سے کی جاتی ہے حالانکہ یہ مجلس بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے۔ مدخل ۲؎ ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے ۱۲۔

کی اسلامی تاریخ کا تجربہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام دنیوی ترقیات بھی بحیثیت مجموعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت کے اتباع پر موقوف ہیں۔ اور اس کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس موجودہ تنزل وانحطاط کے بعد بھی اگر اس امت مرحومہ کے لیے کوئی ذریعہ سنبھلنے کا ہے تو وہی اور صرف وہی ذریعہ ہے جس نے ان کو اول مرتبہ تمام گمراہیوں اور ذلتوں کی اندھیریوں سے نکالا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت کا اتباع۔ امام دارالہجرۃ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے :۔

لا یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولھا۔	اس امت کی اصلاح صرف وہی طریقہ کر سکتا ہے جس نے اس امت کے متقدمین اور سلف کی اصلاح کی تھی۔

* * * *

اور ارشاد فرمایا ہے :۔

ما لم یکن یومئذٍ دینا لا یکون الیوم دینا۔ (اعتصام)	اور جو چیز اس وقت یعنی آنحضرت اور صحابہ کے زمانہ میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔

اور مسلمانوں کی اصلاح یا اسلام و تعلیمات اسلام کی اشاعت و تقویت کے لیے نئے نئے طریقے اور رسوم بدعت ایجاد کرنے کی ممانعت جو بے شمار آیات و احادیث میں وارد ہے۔ اس کا راز بھی امام مالکؒ نے خوب ظاہر فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

من ابتدع فی الاسلام بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالۃ لان اللہ تعالیٰ یقول الیوم اکملت لکم دینکم۔ فما لم یکن یومئذٍ دینا لا یکون الیوم دینا۔	جو شخص اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کرے جس کو وہ نیکی سمجھتا ہو گویا وہ اس کا دعی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے احکام امت کو پہنچانے میں خیانت کی کہ یہ نیکی ان کو نہیں بتلائی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے آج تمہارا دین کامل کر دیا ہے تو جو چیز اس دن دین میں داخل نہ تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی۔

(اعتصام شاطبی ص۲۸ ج۱)

خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ سیرت کمیٹی کی موجودہ تحریک ان موجودہ تعینات وتشخصات کے ساتھ خود بھی ایک بدعت سیئہ ہے جو اگر دوسرے منکرات پر مشتمل نہ ہو تو اس وقت بھی گناہ ہے اور بالخصوص اب تو اطراف ہندوستان سے ان جلسوں کی جو کیفیات موصول ہو رہی ہیں وہ ایک خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اور ذکر سیرت کی آڑ میں محرمات لہو و لعب اور تماشے کیے جاتے ہیں جن کے مقابلہ میں نصاریٰ کی رسم کرسمس ڈے بھی گرد ہوگئی۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس تحریک کی ابتدائی تلبیس کی وجہ سے جن حضرات علماء نے قیود و شرائط مناسبہ کے ساتھ اس میں شرکت کی اجازت دی تھی ان سے مکرر استفتاء کیا جائے۔ چنانچہ نائب شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ اس بارہ میں درج ذیل ہے جو کہ سیکرٹری خلافت کمیٹی کاندھلہ کے استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔

نائب شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہم صدر مدرس دارالعلوم کا

مکتوب گرامی

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سیرت کمیٹیوں کا انشاء اور اختراع قادیانیوں کی طرف سے تو نہیں ہوا مگر بعض اوقات میں اس سے قادیانیوں نے فائدہ ضرور اٹھانا چاہا۔ اور اٹھایا اس کا بیڑا اٹھانے والے شیخ عبدالمجید صاحب قریشی ساکن پٹی لاہور ہیں۔ قریشی صاحب نے ابتداءً میں اس کے متعلق مختلف مقامات سے رائے لی۔ چنانچہ میرے پاس اور مولانا کفایت اللہ صاحب کے پاس بھی ان کے خطوط آئے تھے۔ ہم دونوں کے جوابات تقریباً متفق تھے۔ خلاصہ یہ تھا کہ یہ امر نہایت مستحسن ہے بشرطیکہ اس کے لیے کوئی تاریخ اور مہینہ متعین نہ ہو۔ کبھی صفر میں ہو تو کبھی جمادی الاولیٰ میں، کبھی ربیع الاول میں ہو تو کبھی رجب میں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ بارہ یا پندرہ کی ہمیشہ کے لیے تعین نہ ہوا کرے۔ نیز سال میں صرف ایک دفعہ نہ ہوا کرے بلکہ دوسرے تیسرے مہینہ اور اگر اس سے زائد ممکن ہو تو زیادہ تر ہوا کرے۔ نیز سیرت کے متعلق بیان کرنے والے

کوئی واقف کار شخص ہوں جو کہ صحیح اور قوی روایتیں بیان کریں اور عوام کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل زندگی سے آگاہ کرتے رہیں۔ جب تک اس قسم کے بیانات عوام تک لگاتار اور کثرت سے نہ پہنچائے جائیں گے، کما ینبغی فائدہ نہ ہوگا۔ معترضین علی الاسلام کے زہر آلود پروپیگنڈوں سے عوام کو اسی طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ قریشی صاحب نے ہماری عبارت میں کانٹ چھانٹ کی اور اپنے مدعا کے موافق جملوں کو لے کر شائع کر دیا اور باقی کو حذف کر دیا مجھ سے اس کے بعد اسی زمانہ میں اخباروں میں اپنی تراشیدہ عبارت کو پھر چھپایا اگر وہ اپنے پروپیگنڈے سے باز نہیں آئے اور اب انھوں نے سالانہ ربیع الاول کو اس کی تحریک شروع کر دی اور اس کے استحسان میں ہمارے نام شائع کر رہے ہیں۔ ہم ہرگز تعیین تاریخ و ماہ سالانہ ایک جلسہ کو شرعی اور ملکی نقطہ نظر سے نہ مفید اور نہ ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اب تو یہ مثل عیسائی نصاریٰ برتھ ڈے، یوم پیدائش اور اس کی رسوم کے ایک رسم ہو رہی ہے کیونکہ عیسائی یوم ولادت عیسیٰ علیہ السلام مناتے ہیں اس کو دیکھ کر ہندو وغیرہ کے لوگ بھی اس قسم کی ابتداء کرنے کے لیے آمادہ ہو رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اخلاق و سیر لوگوں کے کانوں تک پہنچانے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہیں۔ مگر مذکورہ بالا طریق پر ہو تو مفید اور بہترین چیز ہے ورنہ اجتناب چاہیے۔ افسوس کہ سیرت کمیٹی اور اس کے کارپردازوں نے تمام امور مشروطہ کو ترک کر دیا۔ والسلام

از دار العلوم دیوبند۔ ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ۔

اس مفصل تحریر کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ عمل کرنے والوں کے لیے مسئلہ میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے گا اور معاندین کی بحث کا خاتمہ کسی حجت و دلیل سے غیر ممکن ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ ولی التوفیق وعلیہ التکلان۔

کتبہ احقر محمد شفیع غفرلہ خادم دار الافتاء دار العلوم دیوبند ۳ [illegible] ھ۔

الجواب صحیح

ننگ اسلاف حسین احمد صدر مدرس دار العلوم دیوبند

مروّجہ صلوٰۃ وسلام کی شرعی حیثیت

ایک استفتاء اور اس کا جواب

استفتاء

(الف) بعض مساجد میں کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جمعہ کی نماز یا دوسری نمازوں کے بعد امام کے ساتھ جماعت بنا کر اور کھڑے ہو کر آواز ملا کر مندرجہ ذیل سلام پڑھتے ہیں: یارسول سلام علیک، یا نبی سلام علیک وغیرہ وغیرہ۔

ان میں بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں تشریف لاتے ہیں، یا ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، اس لئے یہ سلام خود سنتے اور جواب دیتے ہیں۔ جو لوگ ان کے اس عمل میں شریک نہیں ہوتے ان کو مطعون کرتے اور طرح طرح سے بدنام کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اکثر مسجدوں میں نزاع اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور دریافت طلب یہ ہے کہ کیا اس طرح کا سلام پڑھنا بدعت ہے یا نہیں؟ اور متولیان مساجد کو اس کی اجازت دینا چاہیے یا نہیں؟

(ب) جہاں مذکورہ طریقہ پر صلوٰۃ و سلام پڑھا جاتا ہے وہاں

۱- رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس محفل میں تشریف لاتے ہیں۔ یا

۲- بغیر تشریف لائے سلام کو خود سن لیتے ہیں۔ یا

۳- اس طرح کے صلوٰۃ و سلام کو فرشتے آپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

(ج) طریقہ مندرجہ بالا پر صلوٰۃ و سلام پڑھنا قیام کے بغیر بیٹھ کر یا قیام کے ساتھ ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

(د) اندرونِ مسجد یہ صلوٰۃ وسلام کیا حکم رکھتا ہے اور مسجد کے باہر اس کا کیا حکم ہے؟
جواب با صواب تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

والسلام!

الجواب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سوالات کے جواب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام میں تمام عبادات نماز، روزہ، ذکر اللہ، تلاوت قرآن وغیرہ سب کے لئے کچھ آداب وشرائط اور حدود وقیود ہیں جن کی رعایت کے ساتھ یہ عبادات ادا کی جائیں تو بہت بڑا ثواب و فلاح دنیا وآخرت ہے اور ان حدود وقیود سے ہٹ کر کوئی دوسری صورت اختیار کی جائے تو ثواب کے بجائے عذاب اور گناہ ہے۔ نماز تمام عبادات میں افضل ہے لیکن طلوع وغروب کے وقت نماز پڑھنا حرام ہے۔ مقرر کردہ رکعات میں کوئی رکعت زائد کر دے تو حرام ہے۔ جماعت کی نماز سنت مؤکدہ ہے اور اس سے نماز کے ثواب میں ستائیس گنا اضافہ ہوجاتا ہے لیکن کوئی نفل نماز کی جماعت کرنے لگے تو ممنوع اور گناہ ہے۔ روزہ کتنی بڑی عظیم عبادت اور اس کا ثواب کتنا بڑا ہے مگر عیدین اور ایام نحر میں روزہ رکھنا حرام ہے، قرآن مجید کی تلاوت بہترین عبادت ہے لیکن رکوع وسجدہ کی حالت میں تلاوت ممنوع اور ایسے مقامات پر جہاں لوگ سننے کی طرف متوجہ نہ ہوں بلند آواز سے تلاوت ناجائز ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام افضل عبادات وموجب برکات اور سعادت دنیا وآخرت ہے مگر دوسری سب عبادات کی طرح اس کے بھی آداب وشرائط ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے سے ثواب کے بجائے گناہ لازم آتا ہے۔

(الف) جس ہیئت سے مساجد میں بطرز مذکور اجتماع والتزام کے ساتھ درود وسلام کے نام پر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے اس کو درود وسلام کی نمائش تو کہا جا سکتا ہے درود وسلام کہنا اس کا صحیح نہیں کیونکہ وہ بہت سے مفاسد کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مسجد پوری مسلمان قوم کی مشترک عبادت گاہ ہے اس میں کسی فرد یا جماعت کو فرائض وواجبات کے سوا کسی ایسے عمل کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی جو دوسرے لوگوں کی انفرادی عبادت نماز۔ تسبیح۔ درود۔ تلاوت قرآن وغیرہ میں خلل انداز ہو۔ اگرچہ وہ عمل سب کے نزدیک بالکل جائز اور مستحسن ہی کیوں نہ ہو فقہاء رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ مسجد میں بآواز بلند تلاوت قرآن یا ذکر جہری جس سے دوسرے لوگوں کی نماز یا تسبیح وتلاوت میں خلل آتا ہو، ناجائز ہے (شامی خلاصۃ الفتاویٰ) ظاہر ہے کہ جب قرآن اور ذکر اللہ کو بآواز بلند مسجد میں پڑھنے کی اجازت نہیں تو درود و سلام کے لئے کیسے اجازت ہوسکتی ہے۔

(۲) کسی نماز کے بعد اجتماع والتزام کے ساتھ بلند آواز سے درود وسلام پڑھنا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ صحابہ وتابعین سے اور نہ ائمہ مجتہدین اور علماء سلف میں کسی سے اگر یہ عمل اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک محمود ومستحسن ہوتا تو صحابہ وتابعین اور ائمہ دین اس کو پوری پابندی کے ساتھ کرتے۔ حالانکہ ان کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ درود وسلام کے لئے اجتماع اور التزام کو یہ حضرات بدعت وناجائز سمجھتے تھے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح بخاری ومسلم میں بروایت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا منقول ہے من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد۔ یعنی جس شخص نے ہمارے دین میں کوئی نئی چیز نکالی جو اس میں داخل نہ تھی تو وہ مردود ہے۔ اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ وارد ہے۔ و شر الامور محدثاتھا و کل بدعۃ ضلالۃ یعنی بدترین عمل وہ نئی چیزیں ہیں جو خود ایجاد کی جائیں اور ہر نو ایجاد عبادت گمراہی ہے۔ عبادت کے نام پر دین میں کسی نئی چیز کا اضافہ تعلیمات رسول کو ناقص قرار دینے کا مرادف اور بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریف دین کا راستہ ہے۔ اسی لئے حضرات صحابہ وتابعین نے اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کل عبادۃ لم یتعبدھا اصحاب رسول اللّٰہ

صلی اللہ علیہ وسلم فلا تعبّدوھا (الی) وخذوا الطریق من کان قبلکم۔
یعنی جس طرح کی عبادت صحابہ کرام نے نہیں کی تم بھی اُس کو عبادت نہ سمجھو بلکہ پہلے بزرگ صحابہ کا طریق اختیار کرو (کتاب الاعتصام للشاطبی ص ۳۱۱ ج ۲)

اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا فقد کفیتم
یعنی تم لوگ ہمارے (صحابہ کرام کے) آثار کا اتباع کرو اور نئی نئی عبادتیں نہ گھڑو کیونکہ تم سے پہلے عبادت کا تعین ہو چکا ہے۔

تنبیہ

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سب کلام انفرادی درود وسلام کے بارے میں نہیں کیونکہ انفرادی طور پر درود کی کثرت کے فضائل حدیث وقرآن میں مذکور اور صحابہ وتابعین کا معمول ہے نہ اُس کے لیے کوئی وقت مقرر ہے نہ تعداد جتنا کسی سے ہو سکے اختیار کرے اور سعادت دارین حاصل کرے۔ کلام صرف اُس کی مروجہ اجتماعی صورت میں ہے۔
اسلام میں نماز سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں مگر اُس کی بھی نفلوں کی جماعت کو باتفاق فقہاء وائمہ مکروہ کہا گیا ہے تو کسی دوسری چیز کی جماعت بنا کر دوام والتزام سے کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے خصوصاً جب کہ کرنے والوں کو اُس پر ایسا اصرار ہو جیسے فرض وواجب پر بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں اُن پر طعن وتشنیع کی جائے۔ جو کسی حال جائز نہیں۔ کیونکہ اگر بالفرض یہ عمل بدعت بھی نہ ہوتا تب بھی زیادہ سے زیادہ ایک نفلی عمل ہوتا جس پر فرض وواجب کی طرح اصرار کرنے اور دوسروں کو مجبور کرنے کا کسی کو حق نہیں۔
جس کام پر اللہ ورسول نے کسی کو مجبور نہیں کیا کسی دوسرے کو اس پر مجبور کرنے کا کیا حق ہے اور نہ کرنے کی صورت میں اُس پر طعن وتشنیع کرنا ایک مستقل کبیرہ گناہ ہے جس میں یہ حضرات ناواقفیت سے مبتلا ہوتے ہیں اور اُس پر غور نہیں کرتے کہ خود ان کے نزدیک بھی یہ عمل زیادہ سے زیادہ مستحب اور نفل ہے ایک نفل کو فرض کی طرح بنا دینا

میں مبتلا ہونا کونسی دانشمندی ہے

(۳) خطاب کے الفاظ یا رسول، یا نبی اگر اس عقیدہ سے ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر زمان و مکان میں موجود اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے کائنات کی ہر آواز کو سنتا اور ہر حرکت کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح (معاذ اللہ) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان خدائی صفات میں شریک ہیں تو یہ کھلا ہوا شرک اور نصاریٰ کی طرح رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے۔ اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں تشریف لاتے ہیں تو گو بصورت معجزہ ایسا ہونا ممکن ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن یا حدیث سے اس کا ثبوت ہو۔ حالانکہ کسی آیت یا حدیث میں تعلق اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اور بغیر ثبوت و دلیل کے اپنی طرف سے کوئی معجزہ گھڑ لینا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء ہے جس کے بارہ میں آپ نے فرمایا ہے:۔

من کذب علیّ متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار یعنی جو شخص میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے اس کو چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں سمجھ لے اور اگر اس طرح کا کوئی بھی غلط عقیدہ نہ ہو تب بھی موہم الفاظ ہیں جن میں اس عقیدۂ فاسدہ کو راہ ملتی ہے اس لئے بھی ان سے اجتناب ضروری ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام کو یا عبدی کہہ کر پکارنے سے اسی لئے منع فرمایا کہ یہ الفاظ موہم شرک ہیں:

البتہ روضۂ اقدس کے سامنے الفاظ خطاب کیساتھ سلام پڑھنا سنت سے ثابت اور مستحب ہے کیونکہ وہاں براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام سننا اور جواب دینا روایات حدیث سے ثابت ہے۔

الغرض روضۂ اقدس کے علاوہ دوسرے مقامات میں اگر ان الفاظ خطاب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ ہے تو کھلا ہوا شرک ہے۔ اور مجلس میں تشریف لانے کا عقیدہ ہے تو رسول کریم [illegible]

علیہ وسلم پر افترا اور بہتان ہے اور دونوں میں سے کوئی غلط عقیدہ نہیں تو بھی موہم شرک ہونے کی وجہ سے ایسے الفاظ ممنوع ہیں پھر اس ناجائز عمل پر اصرار کرنا دوسرا[۲] گناہ ہے، اور فرض وواجب کی طرح اس کو ضروری سمجھنا تیسرا[۳] گناہ ہے اور اس میں شریک نہ ہونے والے بے گناہ مسلمانوں کو برا بھلا کہنا اور مطعون کرنا چوتھا[۴] گناہ ہے اور مساجد میں بآواز بلند کہہ کر دوسرے مشغول لوگوں کے شغل میں خلل انداز ہونا پانچواں[۵] گناہ ہے۔

افسوس ہے کہ بہت سے نیک دل مسلمان قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ناواقف ہونے کے سبب اس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کا نشان سمجھ کر اس میں شریک ہوتے ہیں یہ جذبہ محبت وعظمت بلاشبہ قابلِ قدر ومبارکباد ہے مگر اس کا بے جا استعمال ایسا ہی ہے جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کی محبت میں مغرب کی نماز تین کے بجائے چار رکعت پڑھے اور اپنے دل میں یہ حساب لگائے کہ ایک رکعت زیادہ پڑھی ہے تو مجھے ثواب اوروں سے زیادہ ملے گا حالانکہ وہ کمبخت اپنی تین رکعتوں کا ثواب بھی کھو بیٹھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتماع اور التزام کے ساتھ کھڑے ہو کر بآواز بلند مسجد ول میں درود وسلام پڑھنے کا مروجہ طریقہ سراسر خلاف شرع اور باہم نزاع وجدال اور مسجدوں کو اختلافات کا مرکز بنانے کا سبب ہے اس لئے متولیان مسجد اور اربابِ حکومت پر لازم ہے کہ مسجدوں میں اس کی ہرگز اجازت نہ دیں

اگر کسی کو کرنا ہے تو اپنے گھر میں کرے تاکہ کم از کم مسجدیں تو شور و شغب اور نزاع و جدال سے محفوظ رہیں۔

(ب) سوال الف کے جواب میں واضح ہو چکا ہے کہ اس مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس امر کا فیصلہ خود ایک حدیث میں اس طرح فرمایا ہے:۔

من صلی علیّ عند قبری سمعته ومن صلی علیّ نائیا ابلغته (مشکوٰۃ از بیہقی) یعنی جو شخص میری قبر کے پاس درود وسلام پڑھتا ہے اُسے میں خود سنتا ہوں اور جو دُور سے درود وسلام بھیجتا ہے وہ (فرشتوں کے ذریعہ) مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

(ج) جس طرح ذکر اللہ تلاوت قرآن کھڑے ہو کر بیٹھ کر یا لیٹ کر بھی ہر طرح جائز ہے اسی طرح درود شریف بھی ہر طرح جائز ہے ہاں اگر کوئی کھڑے ہو کر پڑھنے کو ضروری اور اُس کے خلاف کو بے ادبی سمجھے تو یہ ایک غیر واجب کو اپنی طرف سے واجب قرار دینے کی وجہ سے ناجائز ہے خصوصًا جب کہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درود شریف کو بیٹھ کر پڑھنے کی سنت جاری فرمائی ہے تو بیٹھ کر درود وسلام پڑھنے کو خلاف ادب کہنا اس حکم ربانی اور تعلیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ قرآن کو صرف کھڑے ہو کر پڑھنا چاہیئے۔ بیٹھ کر پڑھنا بے ادبی ہے۔

(د) جواب الف میں واضح ہو چکا ہے کہ بطرز مذکور رسم پڑھنے کے لئے اجتماع والتزام تو بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے جو مسجد میں بھی ناجائز ہے اور مسجد سے باہر بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسجد میں اگر کوئی بیٹھ کر مسنون درود وسلام کے الفاظ کو بھی باواز بلند اس طرح پڑھے جس سے دوسرے حاضرین مسجد کے شغل میں خلل آتا ہو تو وہ بھی ناجائز

ہے۔ اور مسجد سے باہر اس کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ہمدردانہ مشورہ

ہر شخص کو اپنی قبر میں سونا اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور ان معاملات میں گروہ بندی اور قدیم آبائی رسوم پر ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سمجھنا چاہیئے اور یہ غور کرنا چاہیئے کہ دنیا کے تو تمام معاملات میں ہمارے جھگڑے چلتے ہی رہتے ہیں کم از کم اللہ کے گھر اور عبادت نماز کو تو ہر طرح کے جھگڑے فساد سے محفوظ رکھا جائے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

دار العلوم ۔ کراچی

۱۲/۱۱/۹۱ھ

مساجد کی نئی شکلیں اور اُن کے مفاسد

☆☆☆☆☆☆☆☆

مقامِ تصنیف : ———— دار العلوم کراچی

تاریخِ تصنیف : ———— ۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ

مغربی تہذیب نے مسلمانوں کی معاشرت کو فیشن پرستی اور جدت پسندی کے جس راستہ پر ڈال دیا ہے اس کی تباہ کاریاں وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں اور اس نے مسلمانوں کو صحت و دولت ہر اعتبار سے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اب یہ ذوق معاشرت سے نکل کر عبادات اور عبادت گاہوں میں بھی ظاہر ہونے لگا ہے جو معابد و مساجد کے بالکل ہی منافیِ شان اور دینی شعائر سے رفتہ رفتہ محرومی کا سبب ہے۔ اب بعض لوگوں کا میلان اس طرف ہونے لگا ہے کہ مسجد کی تعمیر میں بھی جدید ترین فیشن کا لحاظ رکھا جائے اس سلسلہ میں لاہور سے ایک استفتاء آیا تھا پیشِ نظر صفحات میں یہی سوال و جواب مذکور ہیں۔
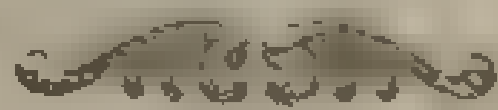
استفتاء

ہمارے شہر لاہور کی ایک مشہور شارع عام پر یادگار شہداء ایک مسجد مسلمانوں کے چندے سے تعمیر ہو رہی ہے جس کے قریب میں ایک عظیم الشان گرجا کی تعمیر پہلے سے موجود ہے۔

(الف) مسجد شعائر اسلام میں سے ہے اور دنیا میں ہزار تنوع کے باوجود اس کی ایک ممتاز ہیئت متعین ہے جس کو دور سے دیکھ کر ہر مسلم و غیر مسلم واقف و ناواقف مسجد سمجھتا ہے لیکن اس مسجد کی تعمیر کا انتظام جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے انھوں نے اس مسجد کا ڈیزائن دنیا کی سب مسجدوں سے مختلف رکھا ہے کہ جب تک کوئی بتلائے نہیں اس کو دیکھنے والا مسجد نہیں سمجھ سکتا بلکہ اس کا ایک علیحدہ مینار گرجا کے مشابہ ہے اور پوری چھت کا محیط اور پست گنبد صومعہ سے مشابہت رکھتا ہے۔

(ب) مسجد سات (مسبع) پہلو سطح پر بنائی گئی ہے جب کہ مسبع کے ایک کونے کو محراب کی جگہ دی ہے اور آج تک مسلمانوں نے اس سطح پر مسجد کبھی تعمیر نہیں کی جس کی وجہ سے اول تو مسجد میں داخل ہونے والے کے لئے کوئی سمت قبلہ متعین نظر نہیں آتی، دوسرے جو سمت قبلہ ہے اس میں بھی دیوار قبلہ کے بجائے کئی محراب نما در بنا دیئے گئے ہیں جس کی وجہ سے باہر کے لوگوں کی آمد و رفت اور سب چیزیں نظر آکر نماز میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ تیسرے اس کی پہلی صف جو سب سے افضل ہے وہی سب سے چھوٹی صف ہے، صف اول کی فضیلت بہت کم لوگ حاصل کر سکتے ہیں اور اکثریت فضیلت سے محروم رہ جاتی ہے اس لئے سوال یہ ہے کہ:

(۱) جو مسجد بلا ضرورت کے دنیا کی عام مساجد کی ممتاز ہیئت و صورت کے خلاف اس طرح بنائی جائے کیا وہ مسجد شرعی ہے؟ اور اس میں نماز جائز ہے اور اس کے تمام

مسجد شرعی کے احکام ہیں؟

(۲) اور اگر اس کو مسجد کا حکم دیا بھی جائے تو کیا منتظمین مسجد کے لیے یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں کے چندہ سے تعمیر ہونے والی مسجد کی شکل وصورت بگاڑ کر اس کو گرجا گھر یا دوسری عمارتوں کے مشابہ بنا دیں؟ اور مساجد کا اسلامی امتیاز ختم کر دیں؟

(۳) اور کسی فرد یا جماعت نے غفلت یا ناواقفیت سے ایسی شکل کی مسجد بنا دی ہے تو کیا شرعاً یہ واجب نہیں کہ اس کی اصلاح کر کے عام اسلامی مساجد کے مشابہ بنایا جائے؟

(۴) مسجد پہلو ہونے کی وجہ سے، نیز دیوار قبلہ نہ ہونے کی وجہ سے جو شرعی عیوب پیدا ہو گئے ہیں کیا تعمیر میں اس کی اصلاح و ترمیم ضروری نہیں؟ سائل

محمد عبداللہ چغتائی

دار الیف، گلبرگ (D) نزد مارکیٹ لاہور

الجواب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱) جہاں تک مسجد کے شرعی ہونے کا معاملہ ہے اس میں تو کسی دیوار اور چھت کی بھی ضرورت نہیں کوئی فرد یا جماعت اپنی مملوکہ زمین کو مسجد کے لیے وقف کر دے اور عام مسلمانوں کو اس میں نماز کی اجازت دے دے اور مسلمان اس میں نماز باجماعت ادا کرنے لگیں تو وہ کھلی زمین بھی مسجد شرعی ہو جاتی ہے، اس کے لئے نہ کوئی عمارت شرط ہے، اور نہ کوئی ڈیزائن مقرر ہے، اس میں مسجد ہی کا ثواب ملتا ہے، اُس کے تمام احکام مسجد ہی کے احکام ہو جاتے ہیں جیسا کہ عام کتب فقہ میں تصریحات موجود ہیں اس لئے مذکور فی السوال مسجد کے مسجد شرعی ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۲) ——— دوسرا معاملہ مسجد کی تعمیر اس کی ہیئت اور شکل کا ہے اس
میں یہ بات تو سب سے اہم اور ضروری ہے کہ اُس کی تعمیر غیر مسلموں کے معبد کے
مشابہ نہ ہو جائے۔ شریعتِ اسلام نے معاشرتی امور، لباس و طعام وغیرہ میں بھی غیر مسلموں
کی مخصوص صورت اختیار کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ قرآن وسنت کی بے شمار نصوص
اس پر شاہد ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار
تم ظالموں یعنی کافروں کی طرف میلان نہ رکھو کہ اگر ایسا کیا گیا تو تم کو بھی جہنم کی آگ پہنچے
گی اور حدیث میں ارشاد ہے من تشبہ بقوم فھو منھم ۔ او کما قال علیہ السلام
جس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص کسی قوم کی مخصوص چیزوں میں ان کی نقل اتارتا ہے
وہ اسی قوم میں داخل سمجھا جائے گا، یہ کس قدر وعید شدید ہے اور معاشرتی امور میں تشبہ
کا یہ حکم ہے تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عبادات اور معابد کے معاملہ میں تشبہ

با کفار سے اجتناب کرنا کس قدر اہم اور ضروری ہوگا۔ کسی مسجد کی تعمیر، مندر،
گرجا، صومعہ کی مخصوص شکل یا اس کا مشابہ صورت میں کرنا بالکل حرام ہے جو مسجد
بنا دی گئی ہو اس کو توڑ کر اس مشابہت کو دور کرنا واجب ہے اگر بنانے والے
نے عام مسلمانوں کی اجازت و مشورہ کے بغیر ایسا کیا ہے تو مصارف کی ذمہ داری
بنانے والوں پر ہوگی۔
دوسری صورت ڈیزائن بدلنے کی یہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کے معابد کے مشابہ تو نہیں
مگر مساجدِ دنیا کی خصوصیات اور ہیئت و صورت سے مختلف دوسری عمارتوں کی شکل میں
ہے جس کو عام لوگ دور سے دیکھ کر مسجد نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صورت اگرچہ تشبہ بالکفار
سے تو نکل گئی مگر مساجد کی تعمیر میں بلا کسی شدید مجبوری کے ایسی ہیئت و شکل اختیار کرنا
بھی بہت سے دینی مفاسد کی وجہ سے مکروہ و مذموم ہے اور اصل تعمیر کو توڑے بغیر جس
قدر اُس کو مساجد دنیا کے ہم شکل بنایا جا سکتا ہے وہ اصلاح ضروری ہے۔
اس معاملے میں سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہر قوم دنیا میں اپنی خصوصیات اور

مخصوص شعائر سے زندہ رہتی ہے جو قوم اپنے خصوصی امتیازات اور شعائر کو فنا کر دے اُس کو کسی مستقل قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جاتا۔

اسلام چونکہ مسلمانوں کو تمام اقوام عالم سے ممتاز ایک مستقل قوم بنانے کا داعی ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تعلیمات میں مسلمانوں کی سیرت و صورت لباس اور وضع قطع کھانے پینے اور رہن سہن کے تمام طریقوں میں ایسی ہدایات دی ہیں کہ وہ ان سب چیزوں میں دوسری اقوام سے ممتاز رہیں۔

مدینہ طیبہ کے یہود داڑھی بھی بڑھاتے اور مونچھیں بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے وہاں پہنچے تو مسلمانوں کو حکم دیا کہ داڑھی تو خود شعار اسلام ہے تم اپنی مونچھیں ترشوا دیا کرو تاکہ یہود سے تمہاری شکل ممتاز ہو کر دور سے پہچانی جائے۔ اسی طرح لباس اور کھانے پینے کے جو طریقے کسریٰ و قیصر اور عجم میں رائج تھے اُن سے جدا اسلوب اور پاکیزہ طریقوں کی تعلیم دی۔ مسلمانوں کا یہ امتیاز خود کفر و اسلام میں ایک حد فاصل اور دوسری قوموں کے لئے رشک و حسد کا موجب تھی کہ دنیا میں مشرق و مغرب کے مسلمان اپنی ان امتیازی خصوصیات میں یکساں اور متحد نظر آتے تھے۔

یہ تو معاشرتی امور کا معاملہ تھا، عبادات میں تو اسلام نے یہاں تک احتیاط کام لیا کہ طلوع آفتاب، غروب آفتاب، نصف النہار کے جو اوقات مشرکین کی عبادت کے اوقات تھے ان اوقات میں ہر قسم کی نماز بلکہ سجدہ تک کو حرام قرار دے دیا۔

اقوام یورپ جب تبلیغی جنگوں میں مسلمانوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں تو انھوں نے بڑی گہری سازش سے زبردست منصوبے مسلم قوم کے لئے تیار کئے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان پر مغربی معاشرت، مغربی فیشن مسلط کر دیا جائے جس کو یہ محض ایک دنیوی اور معاشی چیز سمجھ کر اختیار کر لیں گے مگر معاشرت بدلنے کے بعد خیالات و عقائد و اخلاق بدلنے کا راستہ آسان ہو جائے گا اس کا یہ فریب ہم پر چل گیا جس کا نتیجہ آج ہم اس شکل میں دیکھ رہے ہیں کہ وہ قوم جو شعائر اسلام بلکہ اسلام کی یادگاروں پر جان دینے والی تھی وہ خود ان کو ایک ایک کر کے رخصت کر رہی ہے۔

غور کیا جائے تو ہماری نئی نسل کی فیشن اور جدت پسندی کا یہ درجہ کہ مساجد و معابد کو بھی نئے فیشن میں دیکھنا چاہتے ہیں، غیر شعوری طور پر انگریزوں کی اس مسلسل کوشش کا نتیجہ ہے جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کے ذہن کو اسلامی خصوصیات سے نہ صرف بیگانہ بلکہ بیزار بنانا چاہتے تھے۔

اس کی کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم اور ان کی تاریخ تعمیری ترقیات میں بھی کوئی مفلس قوم نہیں۔ دنیا میں ان کی مساجد کیسی کیسی عالی شان حسین اور خوبصورت موجود ہیں، اگر کسی کو اپنے تعمیری ذوق ہی کو پورا کرنا ہے تو مساجد عالم میں اچھی سے اچھی مسجدیں موجود ہیں ان سب کو چھوڑ کر نئے فیشن اختیار کرنے کو غیر شعوری طور پر اسلام بیزاری کے سوا کیا کہا جائے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ مفسدہ بھی کچھ کم نہیں کہ مساجد کی ممتاز شکل و صورت اس کے منارے اور گنبد دور سے مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دینے کا کام بھی کرتے ہیں، ہر ناواقف، نووارد یہ علامات دیکھ کر نماز کے وقت اُن کی طرف دوڑتا ہے جب یہ نہ رہا تو اجنبی لوگوں کو وہاں تک پہنچنا مشکل ہوگا اس کے علاوہ مسلمانوں کی تعمیری ترقیات کے دور میں مساجد کی یہ مخصوص ہیئت عملی طور پر اسلام کی شان و شوکت کا مظاہرہ بھی ہے ہر آنے والا اُس کو دیکھ کر محسوس کر لیتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا شہر ہے یہ جدت پسندی شہر کو اس سے بھی محروم کر دیتی ہے۔

اسی مغربی ذہن نے آج کل ہماری قوم کو قدامت پسند اور جدت پسند کے دو فرقوں یا جماعتوں میں بانٹ دیا ہے اگر اسلامی تعلیمات سے پہلے صرف عقل ہی سے دیکھا جائے تو یہ تفرقہ ہی بے عقلی پر مبنی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نہ ہر نئی چیز مفید ہی ہوتی ہے اور نہ ہر پرانی چیز خراب یا مضر ہی۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ انسان کو نہ قدامت پسند ہونا چاہیے نہ جدت پسند بلکہ حقیقت پسند ہونا چاہیے جو چیزیں پرانی اچھی ہیں ان کو نہ چھوڑے جو چیزیں نئی اچھی ونافع و مفید ہیں ان کو اختیار کرے۔

سب سے آخر میں ایک اہم بات قابلِ نظر یہ ہے کہ اسی فیشن پرستی اور جدت پسندی کے دور میں خود اُن قوموں نے جو فیشن اور جدت پسندی کی داعی ہیں اپنے معاشرتی امور میں تو فیشن اور جدت اختیار کرلی ہے مگر انکے معابد اور گرجاؤں میں وہی قدامت پسندی ہر جگہ دیکھی جاتی ہے۔

اس فیشن پرستی اور جدت پسندی سے نہ ہندوؤں نے اپنے مندروں کے ڈیزائن بدلے نہ نصاریٰ نے گرجاؤں کے نہ یہود نے صوامع کے کس قدر افسوس ہے کہ ہم مسلمان کہلانے والے ہی اس کے شکار ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس لئے مندرجہ سوال ہفت پہلو مسجد چونکہ بن چکی ہے اب اس کی تعمیر کو بنیاد سے توڑ کر نقشہ بدلنا تو مسلمانوں کی بڑی رقم کو ضائع کرنا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اندر سمت قبلہ میں مکمل دیوار کردی جائے جس سے باہر کی چیزیں نمازی کے سامنے آکر خلل نماز کا سبب نہ بنیں۔ سمت قبلہ کو محراب معروف کی شکل دی جائے اُس میں ممبر قائم کیا جائے اور باہر سے مینار وغیرہ کے ذریعہ جس قدر اس کو عام مساجد کے ہم شکل بنایا جاسکتا ہے بنا دیا جائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد شفیع
دارالعلوم کراچی ۱۴
۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ
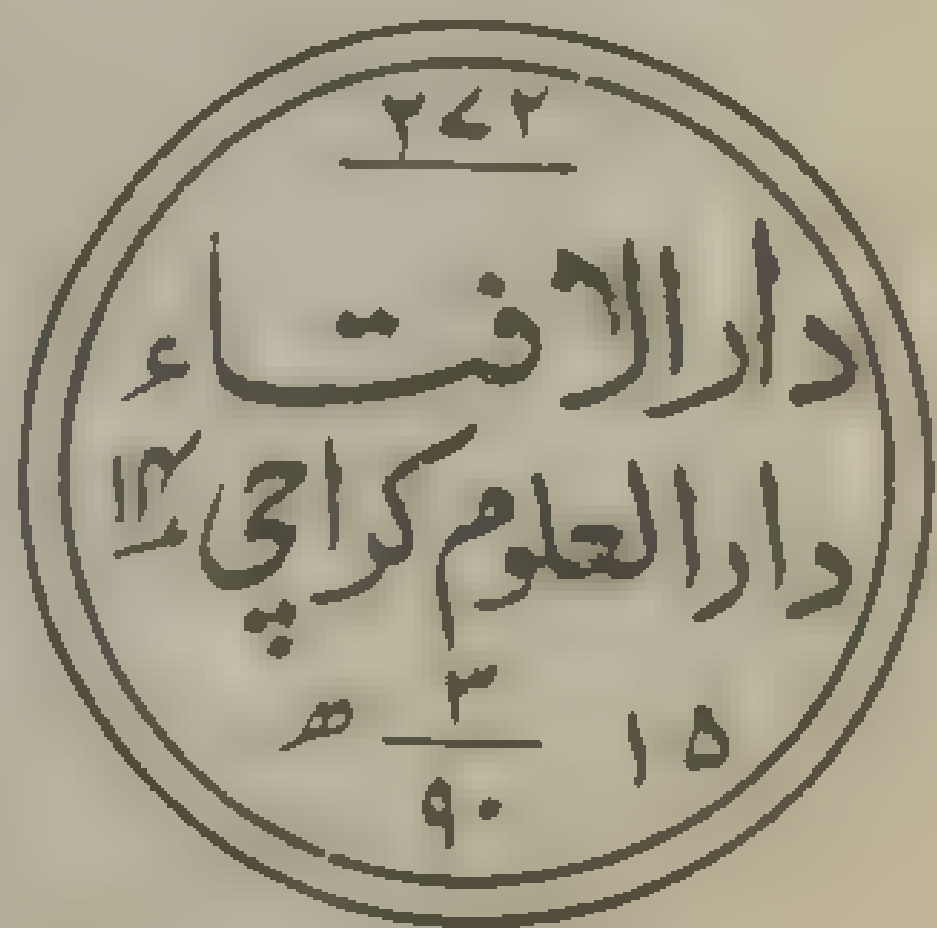
تنقیح المقال
فی
تصحیح الاستقبال

سمتِ قبلہ

سمتِ قبلہ کی شرعی حیثیت اور سمت معلوم کرنے کے طریقے

جس میں کعبہ شریف کا رُخ معلوم کرنے کے اصول، شریعت، سائنس اور علمِ ہیئت کی تحقیق کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں.

اس کے علاوہ
تعمیرِ مساجد کے رُخ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ بتلایا گیا ہے.

تاریخ تالیف ـــــــــــ ۳ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ

مدت تالیف ـــــــــــ آٹھ گھنٹے

مقام تالیف ـــــــــــ دیوبند

طبع اوّل ـــــــــــ ۱۳۶۰ھ

طبع دوم ـــــــــــ بحیثیت فتاویٰ دارالعلوم

ص ۲۶۲ ج ۲

"قائد خاکسار مشرقی صاحب نے حسابات کے ذریعہ سمتِ قبلہ متعین کر کے اعلان کیا کہ جو مسجدیں اس کے خلاف بنی ہیں ان میں نماز نہیں ہوتی، یہ مقالہ اس کی تردید میں لکھا گیا جس سے قبلہ رُخ ہونے کی شرعی حیثیت اور اس کا فقہی مفہوم واضح کیا گیا اس مقالے کو بھی حضرت تھانوی رح کی نظر ثانی کا شرف حاصل ہے اور عربی نام بھی انہی کا تجویز کردہ ہے۔"

(از جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔اے، سابق وزیر تعلیمات ریاست جوناگڈھ)

"اہل نظر" بقول مرزا غالب عہ "قبلہ کو قبلہ نما کہتے ہیں"۔ لیکن اہل دل اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ط عہ کا جلوہ دیکھتے ہوئے جدھر حکم ہوتا ہے اوسی سمت سر تسلیم خم کرتے ہیں مشرق و مغرب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مقصود اصلی رضائے مولیٰ ہے، اسی لیے اون کے قبلہ کو قبلہ نما کے بجائے رضا نما کہنا چاہیے۔ اور حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ ط عہ کی تعمیل سمجھنا چاہیے۔ اب آئیے اسی رضا نما کا ایک کرشمہ آج کل کے دور انقلاب میں دیکھیے۔

اودھ کے ضلع بارہ بنکی میں جہانگیر آباد ایک چھوٹا سا اسلامی راج ہے۔ جس کے فرمانروا عالی جناب راجہ سر محمد اعجاز رسول خاں صاحب کے۔ ٹی، کے۔ سی، آئی۔ ای۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ ہیں۔ ممدوح جو بڑے بیدار مغز، مدبر، اور روشن دماغ ہیں۔ نہ صرف گورنمنٹ میں معزز و مقتدر ہیں، بلکہ برادرانِ ملت اور ابنائے وطن میں بھی محترم اور معتبر ہیں۔ اور آپ کے چشمۂ فیض سے یگانہ و بیگانہ سبھی سیراب ہو رہے ہیں۔

موصوف کو عمارات کا شوق ہے جو نہ صرف حظِ نفس ہے۔ خلق و ملت کی خدمت بھی ہے۔ لکھنؤ میں حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پرانوار کے متصل جو عالی شان مسجد ہے وہ آپ ہی کی احساسِ ملی کا ایک پائدار نقش ہے۔ دو سال کا

عہ غالب کا پورا مصرعہ یوں ہے "قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں" ۱۲ وصل۔

عہ ترجمہ:۔ تم لوگ جس طرف بھی رخ کرو، اللہ کا رخ ہے۔ ۱۲۔

عہ ترجمہ:۔ تم لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو، اپنے چہرں کو اوسی طرف کیا کرو۔ ۱۲۔

عرصہ گزرتا ہے جب ممدوح نے جہانگیر آباد میں ایک وسیع مسجد جامع کی بنیاد ڈالی۔ سمتِ قبلہ ایک ماہرِ سائنس دکتور نے علوم جدیدہ کی روشنی میں نکالی اور کام شروع ہو گیا، کئی ماہ میں جب بنیاد مستحکم ہو کر بھر گئی تو ممدوح کو عالم رؤیا میں دکھایا گیا کہ "جیسے آپ جدید بنیاد پر کھڑے ہیں اور سامنے قلعہ کی مسجد ہے (جس کا سنگِ بنیاد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا تھا) اور کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ نئی مسجد کیوں بناتے ہو؟" جب آنکھ کھلی تو یہ تعبیر ذہن میں آئی کہ شاید سمتِ قبلہ میں جو جدت کی گئی ہے، وہ درست نہیں، اب علماء سے تحقیق شروع ہوئی اور کام ملتوی کر دیا گیا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہٗ جو اس زمانے میں ایک مشہور عالمِ باعمل اور مفتیِ دین ہیں، ان کی خدمت میں مکرمی جناب وصل صاحب بلگرامی بھیجے گئے۔ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ پہلے ایسے علمائے اسلام سے جو علمِ ہیئت سے بھی واقف ہوں رجوع کیا جائے تاکہ وہ بتائیں کہ سمتِ قبلہ میں انحرافِ قلیل ہوا ہے یا کثیر؟ اس کے بعد فتویٰ دیا جا سکے گا، تب جناب وصلؔ نے ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) اور لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب مولوی سید علی صاحب زینبی سے سمتِ قبلہ کے استخراج کے قواعد دریافت کر کے ثبت کئے پھر سر راجہ صاحب نے ایک دن مقرر کر کے جملہ حضرات کو انجینیر صاحب کی موجودگی میں جہانگیر آباد مدعو کیا اور صبح سے دوپہر تک اپنے سامنے دونوں فریق سے سمتِ قبلہ کی جانچ کرائی۔ معلوم ہوا کہ علوم جدیدہ کے حساب سے جہانگیر آباد کا سمتِ قبلہ مائل بجنوب نکالا گیا ہے۔ لیکن مولانا زینبی کے حساب سے مائل بشمال نکلتا ہے اور چند درجوں کا فرق ہے۔ صورتِ موجودہ کو بشکل استفتاء لکھ کر جناب وصلؔ نے دیوبند سے جواب مفصل حاصل کیا۔ پھر حضرت مولینا اشرف علی صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں مع چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے پیش کیا۔ حضرت مولانا مدظلہٗ نے فیصلہ فرمایا کہ بحالت موجودہ سمتِ قبلہ میں قلیل انحراف واقع ہوا ہے۔ اس لیے نماز تو جائز ہو گی، لیکن اولیٰ یہ ہے کہ قدیم مساجد سے سمتِ قبلہ درست کر لی جائے

سر راجہ صاحب نے جس وقت یہ فیصلہ پڑھا تو فرمایا کہ میں رخصتِ شرعیہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترکِ ادب گوارا نہیں کر سکتا، خواہ اس میں مالی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ اب انجینیر صاحب حیران ہوئے کہ یہ گہری مستحکم بنیاد جس میں کئی ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے اور گویا لوہے کی دیوار ہے، کیونکر کھودی جائے گی اور کس طرح پیوند لگا کر سمت درست ہوگی؟ اس مشکل کو سر راجہ صاحب نے یوں حل فرمایا کہ جس قدر اوپر تعمیر ہو چکی تھی وہ منہدم کرا کے بنیاد کے متصل صحنِ مسجد کی جانب دوسری نئی بنیاد کھودے جانے کا حکم دیا۔ پھر جناب وصلؔ سے فرمایا کہ حضرت مولانا سے میری طرف سے عرض کریں کہ ایک کھوری اینٹ دستِ مبارک سے مس کر کے بنیاد میں رکھنے کے لیے عطا فرمادیں جو بذریعہ پارسل روانہ کر دی جائے چنانچہ مولانائے ممدوح نے بنیاد کعبہ کی دعائے ابراہیمی اور آیاتِ مسجد قبا کو ایک اینٹ پر دم کر کے اور محترم بانیِ مسجد کے حق میں دعائے خیر فرما کر روانہ کرنے کے لیے مع ایک صحیفۂ گرامی کے جناب وصلؔ کے حوالہ فرمادی۔ اور یہ پارسل مع گرامی صحیفۂ مذکورہ کے سر راجہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اب نئی بنیاد کھد رہی ہے اور کام شروع ہو گیا ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ اس دورِ فتنہ میں جبکہ علومِ جدیدہ کی جدت آفرینیوں نے تشکیک اباحت اور بے راہ روی کے خیالاتِ فاسدہ پیدا کر دیے ہیں۔ اور وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا۔ کی عملی تعلیم اور اتحادِ یک جہتی کو جو دینِ یسیر کا خاصہ ہے، لوگ بھول رہے ہیں آئندہ نسلوں کے لیے اسوۂ حسنہ کے طور پر ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ واقعہ کو حیطۂ تحریر میں لایا جائے اور تحقیق سمتِ قبلہ کے موضوع پر یہ رسالہ جس کو جناب وصلؔ نے مرتب کیا اور اپنا مقدمہ جس میں چند ضروری مکاتیب بھی شامل ہیں درج کیا جس کو سمت قبلہ کے نام سے موسوم کیا اور اس کا تاریخی نام قبلہ کے سمت کی پاکیزہ تحقیق (۱۳۶۰ھ)

---

۵ ترجمہ: اور ہر شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ منہ کرتا رہا ہے، سو تم نیک کاموں میں تگاپو کرو۔ تم خواہ کہیں ہوگے، اللہ تعالیٰ تم سب کو حاضر کر دیں گے۔ ۱۲۔

یعنی الملقب بلقب تاریخی "سمت قبلہ کے لاجواب شرعی احکام" رکھا، شائع کیا جائے۔
۱۳۶۰ھ
اللہ تعالیٰ اس عجالۂ نافعہ کو قبول فرمائے اور سر راجہ صاحب دام اقبالہ اور جن جن
حضرات نے اس میں سعی فرمائی ہے، اون سب کو اجرِ عظیم عطا کرے۔ آمین یا الٰہ
العالمین بحرمت سید المرسلین وآلہ واصحابہ اجمعین۔

نواب علی

لکھنؤ۔ یکم جون ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ حبیبہ الکریمؐ

مقدمہ

از وصل بلگرامی

حضرت نبی آخر الزمان علیہ التحیۃ والثنا کے ظہور پُرنور کے بعد سے اسلام کی بنیاد پڑی، اسلام کے نام لیوا پیدا ہوئے۔ اور ایک زمانے تک خدا کے فضل سے روزافزوں اور حیرت انگیز ترقی کرتے رہے۔ زمانہ سدِ راہ ہوا۔ دنیا نے اون کو قابو میں لانے کی کوشش کی۔ مگر وہ فدائیان اسلام دنیا اور زمانے کو نیچا دکھاتے ہوئے شاہراہِ اسلام پر برابر گامزن رہے اور اس طرح نہ معلوم کتنے منزلِ مقصود پر پہونچ گئے۔ اب جتنا زمانہ گزر رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں مسلمانوں کے دلوں میں وہ اسلامی جوش، وہ خروش، وہ ولولہ نہیں ہے۔ دین کی طرف سے لاپروائی۔ احکامِ شرع کی طرف اعتنا نہیں، نہ دین کی دل میں سچی محبت، نہ علماء کی قدر، نہ بزرگانِ دین کا وقار باقی ہے۔ اس کا باعث موجودہ زمانے اور موجودہ روش کا اثر۔ موجودہ تعلیم اور موجودہ معاشرت میں انہماک ہے۔ خاص کر اصحابِ دول کی حالت زیادہ قابلِ افسوس ہے۔ خدا ہر مسلمان کی حالت پر رحم فرمائے اور اعمالِ نیک کی توفیق عطا کرے۔

لیکن باوجود اس قدر زاید تغیر و انقلاب کے اب بھی ایسی ہستیاں ہیں اور خدا کرے وہ قائم رہیں اور پختہ مسلمان ہو جائیں، جن میں باوجود تمول کے دینی خدمات کا جذبہ موجود ہے، وہ دین کے نام پر اپنا مال، اپنی دولت لٹانے کو تیار ہیں، وہ اسلام پر اپنی جان تک فدا کرنے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

انھیں معتنم ہستیوں میں عالی جناب راجہ سر محمد اعجاز رسول خاں صاحب بالقابہٗ وخطابہٗ دام اقبالہ و اعزازہٗ کی ذاتِ والا صفات بھی ہے جو امورِ دینیہ اور نیک کاموں

کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے کبھی دریغ نہیں فرماتے۔ آپ کی یہ خدمات نام و نمایش یا شہرت و نمود کے لیے نہیں ہوتیں، بلکہ صرف اللہ اور اس کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہیں، نہ معلوم کتنے اس طرح امداد پا رہے ہیں۔ جس کی کسی دوسرے کو خبر نہیں۔

ابھی تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے۔ آپ کو محسوس ہوا کہ قصبہ جہانگیر آباد میں ایک مسجد جامع کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنے اسلامی جذبات اور عالی ہمتی سے ارادہ کر لیا کہ وہاں کے لحاظ سے ایک وسیع مسجد بنائی جائے۔ اس کا نقشہ باقاعدہ بنوایا۔ علوم جدیدہ کے ذریعے سے سمتِ قبلہ کی تحقیقات ہوئی (جس کا مفصل تذکرہ تمہید رسالۂ ہذا میں موجود ہے) اور اسی کے مطابق نئی مسجد کی بنیاد رکھ دی گئی۔ جب مسجد کی بنیادیں بھر گئیں اور ان پر عمارت بننا شروع ہو گئی، اس وقت سننے میں آیا کہ جس رُخ پر مسجد بن رہی ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اس بنا پر جناب سر راجہ صاحب بہادر نے ذاتی طور پر بہت کچھ تحقیقات فرمائی اور جب کامل اطمینان نہ ہوا تو حضرتِ حکیم الامتہ مدظلہم العالی کی طرف رجوع کیا اور حسبِ ذیل تحریر میرے پاس تھانہ بھون روانہ فرمائی:-

"مکرمی و حقی صاحب زاد عنایتکم! تسلیم .... میں جہانگیر آباد میں ایک مسجد بنوا رہا ہوں۔ جس کے رخ کے متعلق کچھ اختلاف رائے ہے۔ میری خواہش ہے کہ جناب مولانا حضرت مولوی اشرف علی صاحب سے بھی مشورہ حاصل کروں، لہٰذا اگر آپ ایک روز کے لیے جہانگیر آباد چلے آویں تو میں آپ کو سمجھا دوں۔ اور آپ کے ہمراہ اوور سیئر کر دوں تاکہ جو کچھ حضرت قبلہ ارشاد فرما دیں آپ اس کو سمجھا دیجیے، دوبارہ آپ کو آنے کی زحمت نہ ہو گی .... تاریخ اور وقت سے اطلاع دیجیے تاکہ اسٹیشن جہانگیر آباد پر سواری بھیجی جاوے۔ جناب مولانا صاحب قبلہ کی خدمت میں بصد تعظیم میرا سلام عرض کر دیجیے گا۔ فقط۔

نیاز مند .... (راجہ سر) اعجاز رسول (بالقلم)

حال معلوم ہونے پر لکھنؤ سے میں نے جناب راجہ صاحب بہادر سے ملنے سے قبل حضرت اقدس مدظلہم العالی کی خدمت گرامی میں ایک درخواست بھیجی، جس کا خلاصہ یہ ہے :-

"جناب سر راجہ صاحب بہادر جہانگیر آباد حضرت اقدس مدظلہم العالی سے ایک شرعی مسئلہ میں کچھ امداد لینا چاہتے ہیں۔ اور مجھے ارقام فرمایا ہے کہ میں ممدوح سے مل کر اون کے اوورسیئر کو ساتھ لے جاؤں اور حضرت اقدس سے اس کا جواب لے کر اوورسیئر صاحب کو سمجھا دوں۔ چنانچہ میرا ارادہ جہانگیر آباد جانے کا ہے۔ لیکن اب حضور سے اس کی اجازت درکار ہے کہ میں سر راجہ صاحب بہادر کے منشاء کے مطابق اون کے اوورسیئر کو ساتھ لے کر وہاں حاضر ہوں اور حضرت اقدس کے حضور میں ممدوح کا استفتاء پیش کروں اور جو حضور ارشاد فرمائیں، وہ اوورسیئر صاحب کو سمجھا دوں۔

یہ میں جناب سر راجہ صاحب بہادر سے کل کی ملاقات میں عرض کر دوں گا کہ میں نے اجازت طلب کی ہے۔ اجازت کے بعد جو جناب ارشاد فرمائیں گے، تعمیل کروں گا۔ جناب سر راجہ صاحب بہادر کا منشاء زبانی سمجھنے سمجھانے کا ہے۔ اب جو حکم ہو تعمیل کی جائے۔ جناب سر راجہ صاحب بہادر کے نامۂ نامی کی نقل ارسال خدمت اقدس ہے (جو یہاں اس عریضہ سے پہلے درج ہو چکی ہے)"

۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء - ۹ قیصر باغ لکھنؤ۔

حضرتِ اقدس مدظلہم العالی نے حسب ذیل جواب ارقام فرمایا :-

"یہ مسئلہ سمت قبلہ کا ہیئت کا ہے۔ میں ہیئت کا ماہر نہیں میرے خیال میں ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے ذریعہ سے کسی ماہر ہیئت سے تحقیق فرمانا مناسب ہے۔ پھر اون کی تحقیق سے مجھ کو اطلاع دی جائے۔ میں روایات فقہیہ سے

منطبق کر کے جواب عرض کروں گا۔

(۱۸ اپریل ۱۹۴۱ء)

اسی کے ساتھ ایک اور تحریر منسلک فرمادی، جس کی نقل ذیل میں درج ہے:۔

تحقیق اجمالی سمتِ قبلہ۔

"چونکہ اہل ہند کا قبلہ مغرب میں ہے۔ اس لیے استقبالِ قبلہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک خط جو کعبہ سے گزرتا ہوا جنوب وشمال میں منتہی ہو جائے اور نمازی کی وسط جبہہ سے ایک خط مغرب کی طرف نکل کر اس پہلے خط سے اس طرح تقاطع کرے کہ اس سے موقع تقاطع پر۔ دو زاویہ قائمہ پیدا ہو جائیں وہ قبلۂ مستقیم ہے اور اگر نمازی اتنا منحرف ہو کہ وسط جبہہ سے نکلنے والا خط تقاطع کر کے زاویۂ حادہ و منفرجہ پیدا کرے لیکن وسط جبہہ کو چھوڑ کر طرفین جبہہ کے کسی طرف سے نکلنے والا خط زاویۂ قائمہ پیدا کرے۔ وہ انحرافِ قلیل ہے۔ اس سے نماز صحیح ہو جاوے گی اور اگر جبہہ کے کسی طرف سے بھی زاویۂ قائمہ پیدا نہ ہو، وہ انحرافِ کثیر ہے۔ اس سے نماز نہ ہو گی"

اور اس قاعدۂ مذکورہ کی تطبیق میں اگر کچھ تکلف ہو تو سہل طریق اس کی معرفت کا یہ ہے کہ:۔

"موسم گرما کے سب سے بڑے دن میں (یعنی ۲۲ جون کو، اور اسی طرح موسم سرما کے سب سے چھوٹے دن میں (یعنی ۲۲ دسمبر کو) غروب شمس کا موقع دیکھا جاوے۔ قبلہ ان دونوں موقع کے درمیان میں ہوگا۔ یعنی ان دونوں موقع کے درمیان درمیان جس نقطہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جاوے گی۔ صحیح ہو جاوے گی۔

کما فی رسالۃ بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب تحت الامر الخامس

جیسے رسالہ بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب میں خاتمہ کے امر پنجم کے ماتحت تنقیح طلب امور میں

من الخاتمۃ فی الامور المنقحۃ صفحہ ۱۴۳- بعد بحث طویل- مانصہ فان الفساد بالخروج من جہۃ الربع متعین بالاتفاق اما قول الفقہاء الکرام ان مابین المغربین قبلۃ ای ان الکعبۃ واقعۃ بین مغرب اقصی^ع (یعنی اطول) یوم الصیف وھو اول یوم السرطان وبین مغرب اقصی یوم الشتاء وھو اول الجدی جمیع ما بینھما قبلۃ سمرقند و بخارا وترمذ ونسف و مرو و سرخس وما والاھا لجمیع بلاد الھند مع رجبھا وقولھم ذلک ذکرہ فی التجنیس والملتقط وامالی الفتاوی و البنایۃ شرح الھدایۃ من قول ابی منصور الماتریدی- انتھیٰ-

صفحہ ۱۴۳ پر ایک طویل بحث کے بعد ہے۔ اس کے لفظ یہ ہیں کہ فساد نماز ربع دائرہ کی جہت سے نکل جانے سے ہے، بالاتفاق اور فقہائے کرام کا قول ہے کہ دونوں مغربوں کے درمیان قبلہ ہے۔ یعنی کعبہ مکرمہ گرمی کے سب سے بڑے دن یوم السرطان کے مقام غروب اور سردیوں کے سب سے چھوٹے دن اول جدی کے مقام غروب کے درمیان واقع ہے۔ ان دونوں کے درمیان کا سب حصہ سمرقند و بخارا اور ترمذ و نسف و مرو و سرخس اور ان کے قرب و جوار اور ہندوستان کے وسیع ممالک کا قبلہ ہے فقہاء کے اس قول کو تجنیس، ملتقط، امالی الفتاوی اور عینی شرح ہدایہ میں ابو منصور ماتریدی کے قول سے نقل کیا ہے۔

فقط

کتبہٗ اشرف علی عفی عنہ۔ من نصف ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

مرقومۂ بالا قدسی صحیفہ اور اس تحریر کو لے کر میں جناب سر راجہ صاحب بہادر کی خدمت میں جہانگیر آباد پیلس لکھنؤ میں حاضر ہوا۔ اس وقت جناب انجینیر صاحب بھی تشریف

ع یہاں نسخہ مطبوعہ میں غلطی سے اقصر لکھا گیا مگر اول تو خود بغیہ کے صفحہ ۱۲۵ پر اقصیٰ کا لفظ موجود ہے دوسرے بحر و شامی نے جو ابو منصور کا قول نقل کیا ہے اس میں الطول موجود ہے نیز ظاہر ہے کہ یوم سرطان اطول ہی ہوتا ہے ۱۲ منہ۔ اس کے بعد خود مصنف بغیۃ الاریب سے اس کی تحقیق کی گئی۔ ان کا جو جواب آیا ہے اس میں تصریح ہے کہ اصل میں اقصر تحریف ہے اقصیٰ کی جو یقیناً طباعت کی ہے ۱۲ منہ۔

رکھتے تھے اور جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔ اے سابق وزیر تعلیمات ریاست جوناگڑھ وحال متوسل جناب سر راجہ صاحب بہادر جہانگیر آباد (جن کی تمہید رسالۂ ہذا کے اس مقدمہ سے پہلے ناظرین نے ملاحظہ کی ہوگی) بھی موجود تھے۔ تحریر اقدس سنائی، آخر متفقہ رائے یہ ہوئی کہ جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے ذریعے سے کسی عالم ماہر ہیئت سے اس کی عقدہ کشائی کی جائے۔ اتفاق سے جناب مولوی عبدالباری صاحب ندوی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) لکھنؤ میں موجود تھے، میں اور جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب دونوں جناب مولوی عبدالباری صاحب کی کوٹھی پر گئے۔ اون سے یہ سب واقعات بیان کیے اور سب ہم رائے ہوکر جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے پاس آئے اور مفصل تذکرہ کیا۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جناب مولوی سید علی زینبی صاحب جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں، اون سے بہتر یہاں علماء میں عملی طور سے ہیئت کا کوئی اور ماہر شاید نہیں ہے، لہذا اون سے اس کام کے لیے کہنا چاہیے۔ چنانچہ میں اور جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب دونوں جناب مولوی سید علی زینبی صاحب سے جاکر ملے اور حالات بیان کیے، انھوں نے باوجود عدیم الفرصتی کے وعدہ فرمایا کہ فلاں دن میں جہانگیر آباد چل کر جو کچھ مجھ سے ہوسکے گا، خدمت بجالاؤں گا، جناب سر راجہ صاحب بہادر کو اس کی اطلاع کردی گئی۔ ممدوح نے تین موٹر بھیج دیے، ایک پر جناب انجینیر صاحب مع ضروری اسٹاف اور ضروری سامان اور باقی دو موٹروں پر جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب، جناب پروفیسر مولوی عبدالباری صاحب، جناب مولوی مسعود علی صاحب ندوی، جناب حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلی صاحب، جناب مولوی مصطفی حسین صاحب علوی کاکوروی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی تھے۔ اور ان سب حضرات کے ہمراہ میں۔ وہاں پہونچنے پر جناب سر راجہ صاحب بہادر کی طرف سے جس قدر تواضع، خاطر مدارات اور مہمان نوازی کی گئی وہ ممدوح کی شان کے شایان تھی۔ ناشتے اور چائے کے بعد سب لوگ موقعِ مسجدِ مذکورہ پر گئے۔ جناب مولوی

سید علی زینبی صاحب نے جناب انجینیر صاحب کی امداد سے پیمایش کی، حساب لگائے اور ہر طرح سے جانچا اور فرمایا کہ میں اپنا حساب لگا لایا ہوں۔ اور اس وقت موقع پر جانچنے کے بعد بھی میں اپنے حساب کو صحیح پاتا ہوں۔ میرے حساب سے جہانگیر آباد کا سمت قبلہ قطب سے جانب مغرب ۳۲ دقیقہ — ۸۹ درجہ ہے۔

جناب مولوی سید علی زینبی صاحب نے جن کتابوں سے مدد لی وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) THE WHERE IS IT REFERENCE INDEX PART 2ND

PREPARED BY THE,

SURVEY OF INDIA,

PUBLISHED BY,

BRIGADIER E.A. TANOY R.E

SURVEYOR · GENERAL OF INDIA

1928.

جس کے صفحہ ۲ میں بارہ بنکی کا عرض بلد ۹ دقیقہ — ۲۶ درجہ
اور طول بلد ۱ — ۸۱ درج ہے۔
اور صفحہ ۲۷ میں جہانگیر آباد کا عرض بلد ۰ — ۲۷
اور طول بلد ۲ — ۸۱ درج ہے۔

(۲) THE OXFORD INDIAN SCHOOL ATLAS,

BY,

JHON BARTHOLOMAW

میں مکہ معظمہ کا عرض بلد ۲۰ دقیقہ — ۲۱ درجہ
اور طول بلد ۱۴ — ۴۰ درج ہے

انھیں عرض البلد اور طول البلد کو کام میں لا کر جناب مولانا زینبی صاحب نے

جہانگیر آباد کا سمتِ قبلہ قطب سے جانب مغرب ۸۹ درجہ ۳۲ دقیقہ نکالا۔

نتیجہ یہ معلوم ہوا کہ جناب مولانا زینبی صاحب کے نکالے ہوئے سمت قبلہ میں اختلاف ہے، علاوہ اس کے جناب انجینیر صاحب مائل بجنوب بتلاتے ہیں۔ اور جناب مولانا زینبی صاحب مائل بشمال، ان حسابات سے جناب سر راجہ صاحب بہادر کی کسی طرح تسکین نہیں ہوئی بلکہ اس اختلاف سے اور بھی بے اطمینانی پیدا ہو گئی کیونکہ اب بھی اس امر کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس حساب کو صحیح اور قطعی مان لیا جائے اور جب ممدوح کو اپنے اس خواب کا (جس کو جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب نے اپنی تمہید میں نقل فرمایا ہے) خیال آیا تو اور بھی اضطراب پیدا ہوا۔ ان سب حالات پر نظر فرما کر مجھ سے فرمایا کہ میں حضرت اقدس مدظلہم العالی کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور کل حالات کو بیان کر کے جو وہاں سے ارشاد ہو لکھوا کر لے آؤں۔ چنانچہ میں تھانہ بھون حاضر ہوا اور مفصل حالات عرض کیے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ اس طرف علماء کی جماعت میں اگر کوئی صاحب ماہر ہیئت ہوں، اُن سے بھی دریافت کر لیا جائے۔ چنانچہ میں حضرت اقدس مدظلہم العالی کا مکتوب گرامی لے کر مخدومی جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب دام مجدہم مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف نے فرمایا کہ میں ہیئت جانتا تو ہوں اور پڑھاتا بھی ہوں۔ مگر عملی طریق سے واقف نہیں اور جناب مولوی اسعد اللہ صاحب نے بھی یہی فرمایا اور یہ رائے دی کہ میں محترمی جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دار العلوم دیوبند کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مشکل کو حل کراؤں۔ اس رائے کے بعد میں دیوبند گیا اور جناب مفتی صاحب سے کل واقعات بیان کیے۔ جناب موصوف نے فرمایا کہ ہیئت کی طرف زیادہ پڑھنا اور حساباتِ ریاضیہ میں زیادہ کاوش کرنا نہایت غیر ضروری امر ہے۔ میں اس مسئلہ میں فقہائے سلف کے اقوال لکھے دیتا ہوں۔ یہ حضرت اقدس مدظلہم العالی کے حضور میں پیش کر دیے جائیں اور وہاں سے جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے۔ جناب مفتی صاحب نے میری ضرورت کو دیکھ کر مجھ سے استفتاء لکھوایا اور اپنا نہایت قیمتی

وقت اور اس دینی کام میں صرف فرما کر ممنونِ منت بنایا، نہ معلوم کتنی کتابیں منگائیں، کتنی دیکھیں، کتنوں کے حوالے درج فرمائے۔ اور نہایت قلیل وقت میں ایک اچھا خاصہ رسالہ تحریر فرما کر دستخط و مہر سے مزین کر کے مجھے عطا فرما دیا۔ میں اس کو لے کر حضرت اقدس کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا اور وہ فتویٰ پیش کیا حضرت اقدس نے اس کو لفظ بہ لفظ ملاحظہ فرمایا اور چند سطور اس کے آخر میں اپنے قلم مبارک سے تحریر فرما کر اور بھی اس کو مستحکم فرما دیا۔ وہ سطور فتوے کے بعد منقول ہیں۔ اس کے بعد جو استفتاء جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) نے اپنے قلم سے لکھ کر اپنے خط کے ساتھ حضرت اقدس مدظلہم العالی کے حضور میں پیش کرنے کے لیے دیا تھا، اس پر حضرت اقدس نے جواب تحریر فرما کر مجھے عطا فرمایا۔ اس خط کی نقل مع استفتاء و جواب استفتاء ذیل میں درج ہے :-

● ——— نقل خط جناب مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ بعالی خدمت حضرت حکیم امت مدظلہم العالی

مخدوم محترم متعنا اللہ بحیاتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ جناب والا بخیریت و عافیت ہوں گے۔ میں نے سمتِ قبلہ مولانا سید علی صاحب سابق مدرس ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نکلوایا ہے۔ ندوۃ العلماء کا سمت قبلہ بھی موصوف ہی نے نکالا تھا۔ فنِ ہیئت میں مہارت رکھتے ہیں۔ انجینیر صاحب نے جو سمت نکالا ہے، اس سے یہ بہت مختلف ہے۔ انجینیر صاحب سے میں نے پوچھا کہ یہ کس اصول سے نکالا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ولی محمد صاحب سے سمجھ کر مجھے بتائیں گے۔ مگر کئی روز گزر چکے ہیں وہ ابھی سمجھ کر مجھے بتانے نہیں آئے۔ استفتاء مرسل خدمت ہے جواب ارسال فرمائیے۔ مزاج والا کی کیفیت سے مطلع فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ جناب والا کو عرصۂ دراز تک بعافیت رکھے۔ آمین۔

خاکسار، عبدالعلی ۲۷ر اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ قصبۂ جہانگیر آباد ضلع بارہ بنکی میں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے جس کا سمتِ قبلہ ایک انجینیر صاحب نے نقطۂ مغرب سے دش درجہ جانب جنوب قرار دیا ہے، ایک دوسرے عالمِ دین ماہر ہیئت نے سمت قبلہ نقطۂ مغرب سے ۲۸ دقیقہ جانب شمال نکالا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جہاز رانی میں شہروں کی سمت بھی اسی قاعدے سے معلوم کی جاتی ہے۔ مسجد کا طول ۷۹ فیٹ ہے اور اس اختلاف کی بنا پر ۳ فیٹ ۹ انچ کا فرق نکلتا ہے۔ اس حالت میں جو حکم شرع شریف کا ہو۔ اس سے مطلع فرمایا جائے۔ بیّنوا توجروا۔

الجواب

علمائے امت و فقہائے ملت نے قاطبۃً بلا اختلاف تصریح فرمائی ہے کہ سمتِ قبلہ کا مدار آلاتِ رصدیہ و حساباتِ ریاضیہ پر نہیں بلکہ اوس میں مساجد قدیمہ کا اتباع و توافق کافی ہے، جن کی بناد امارات و علامات عرفیہ پر ہے۔ اگرچہ قواعد ہیئت کی رُو سے اون میں سمتِ حقیقی سے کچھ انحراف بھی ہو۔ جس میں اصل قاعدے سے ربع[عہ] دائرہ (۹۰ درجہ) کے قریب تک یعنی دونوں جانب ثمن ثمن

عہ اور حدیث ما بین المشرق والمغرب قبلۃ میں ایک سہل عنوان سے یہی بتانا مقصود ہے کہ پوری جہت جنوب قبلہ ہے اصطلاحِ ریاضی پر نقطہ مشرق و مغرب کی درمیانی قوس مراد نہیں جس سے نصف دائرے کا شبہ ہو سکے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا ہمارے بلاد میں تفہیم عوام کے لیے کہا جاوے کہ شمال و جنوب کے درمیان قبلہ ہے یعنی پوری جہت مغرب ۱۲ منہ

دائرے تک (۴۵-۴۵ درجہ) اور بنابر احتیاط بین المغربین یعنی
ہر طرف ۲۴ درجہ مجموعہ ۴۸ درجہ تک گنجائش ہے عہ اس بنا پر دونوں

عہ وذلک لما فی رد المحتار ممزوجا بالشرح زاد الفقیر وفی بعض الکتب المعتمدۃ فی استقبال القبلۃ الی الجہۃ اقاویل کثیرۃ واقربہا قولان الاول ان ینظر فی مغرب الصیف فی اطول ایامہ ومغرب الشتاء فی اقصر ایامہ فلیدع الثلثین فی الجانب الایمن والثلث فی الایسر والقبلۃ عند ذلک ولو لم یفعل ھکذا وصلی فیما بین المغربین یجوز (الی ان قال) فعلم ان الانحراف الیسیر لا یضر وھو الذی یبقی معہ الوجہ او شیٔ من جوانبہ مسامتا لعین الکعبۃ او لھوائھا (ثم قال) وعلی ما قررنا یحمل ما فی الفتح والبحر عن الفتاوی من ان الانحراف المفسد ان یجاوز المشارق الی المغارب اھ (شامی ص ۲۹۹/ج۱) وقال الشامی فی حاشیۃ البحر تحت قولہ وفی الفتاوی الانحراف المفسد ان یجاوز المشارق الی المغارب ما نصہ کذا نقلہ فی فتح القدیر وھو مشکل فان مقتضاہ ان الانحراف اذا لم یوصلہ الی ھذا القدر لا یفسد وعبارۃ التجنیس التی نقلہا المؤلف بعدہ اعم من ذلک فانہ جعل المفسد انحراف الصدر فیصدق بما دون ذلک ای بان ینحرف بصدرہ بحیث لا یصل الی استقبال المشرق والمغرب ویؤیدہ ما فی منیۃ المصلی عن امالی الفتاوی ونصہ وذکر فی امالی الفتاوی حد القبلۃ فی بلادنا یعنی سمرقند ما بین المغربین مغرب الشتاء ومغرب الصیف فان صلی الی جہۃ خرجت من المغربین فسدت صلوتہ اھ (الی قولہ) وقال ابو منصور ینظر الی اقصر یوم فی الشتاء والی اطول یوم فی الصیف فیعرف مغربیہا ثم یترک الثلثین عن یمینہ والثلث عن یسارہ ویصلی فیما بین ذلک وھذا استحباب والاول للجواز ومشی علی الاول الرستغفنی وجعل فی مجموع النوازل ما ذکرہ ابو منصور ھو المختار (حاشیۃ البحر ص ۲۵۵/ج۱)

قلت فتحصل من ھذہ العبارات ان ھہنا قولان مصححان احدھما ان الانحراف المفسد ان یجاوز المشارق الی المغارب وقدرہ فی الخیریۃ بربع الدائرۃ اعنی خمسا واربعین درجۃ من کل جانب یمینا ویسارا کما سیأتی فی الرسالۃ الملحقۃ الملقبۃ بتنقیح المقال نصہ والثانی ان المفسد من الانحراف اذا خرج من المغربین ومقدار المغربین علی

انحراف مذکور فی السوال کے ہوتے ہوئے بھی نماز صحیح ہو جائے گی لیکن
اولیٰ یہ ہے کہ دوسری مساجد قدیمہ خواہ اس بستی میں ہوں یا قرب وجوار
میں ہوں، اون کے موافق اس مسجد کو درست کرالیا جاوے۔
ان سب احکام کے دلائل دارالعلوم دیوبند کے فتوے میں منقول ہیں
جس سے میں حرفاً حرفاً متفق ہوں۔

کتبہ: اشرف علی عفی عنہ۔ ۴ ربیع الاول ۶۰ھ

جناب ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے استفتاء پر حضرت اقدس مدظلہم العالی کا گرامی فتویٰ اور اپنے استفتاء پر جناب مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کا جواب باصواب لے کر ۳ مئی ۱۹۴۱ء کو لکھنؤ آیا۔ جناب سر راجہ صاحب بہادر کو بمقام جہانگیر آباد اپنے آنے کی اطلاع کر دی اور محترمی جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب سے مل کر اُن کو وہ سب تحریریں دکھائیں۔ اس کے بعد ۹ مئی ۱۹۴۱ء کو جناب سر راجہ صاحب بہادر نے موٹروں کا انتظام فرما دیا۔ ایک پر جناب انجنیئر صاحب مع اسٹاف کے تشریف لے گئے اور دوسرے پر میں اور جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب مع اپنے ایک عزیز دوست جناب سید زاہد حسین صاحب گورنمنٹ پنشنر کے ایک ساتھ جہانگیر آباد گئے۔

(بقیۃ الحاشیۃ ص۱۵) قواعد الهندسة ثمان واربعون درجة كما فی شرح الجغمینی ان نهاية ميل دائرة البروج عن معدل النهار مقدارها كجلہ ای ثلث وعشرون جزءاً خمس وثلثون دقيقة على ما وجد بالرصد المامونی ثم قال بعد ذكر الاقوال المختلفة فيه، لكن اكثر ما وجد وه لم يزد على اربعة وعشرين جزءاً (شرح جغمینی باب رابع ص۶۲) فعلى هذا القول يكون الانحراف الجائز فی كل جانب من اليمين واليسار اربع وعشرون درجة ومجموع الجهة ثمان واربعون درجة وعلى القول الاول فقدر الجائز خمس واربعون درجة فی كل جانب ومجموع الجهة تسعون درجة وهو ربع الدائرة۔ واختار الشامی وغيره القول الثانی لما فيه من الاحتياط وكلا الحاشيتين من المولوی محمد شفيع الديوبندی سلمه ۲ منہ

جناب سید نواب علی صاحب نے جناب سر راجہ صاحب بہادر کو حضرت اقدس مدظلہم العالی کا ارشاد گرامی اور جناب مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے فتوے کا خلاصہ سنایا اور جو حضرت اقدس مدظلہم العالی کے ارشاد کا منشاء تھا وہ ظاہر کیا۔ جناب سر راجہ صاحب بہادر نے نہایت خوشی و انبساط سے منظور فرمایا کہ حضرت اقدس نے جو طریقۂ اولیٰ کی طرف توجہ دلائی ہے میں اوس پر عملدرآمد کے لیے دل و جان سے تیار ہوں۔ اور اسی وقت انجینیر صاحب وغیرہ سب کو لے کر جہاں نئی مسجد بن رہی تھی تشریف لے گئے اور اُس مسجد کی سمتِ قبلہ کے مطابق جو قلعۂ جہانگیر آباد میں واقع ہے اور جس کی بنیاد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی اور جس کو جناب سر راجہ صاحب نے خواب میں بھی دیکھا تھا کہ میں اس نئی مسجد کی بنیاد پر کھڑا ہوں۔ اور قلعہ والی مسجد میرے سامنے ہے۔ نشان ڈلوا دیا اور حکم دے دیا کہ یہیں سے بنیاد قائم کی جائے اور جو عمارت بن چکی تھی، اوس کو گرا دینے کے لیے حکم دے دیا۔ اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ کہ کس قدر صرف ہو چکا ہے۔ کس قدر نقصان ہوگا۔ بس یہ چاہا کہ شرع شریف میں جو طریق اولیٰ ہے اوس کے سامنے سر جھکا دیں اور اوس کی تعمیل نہایت خوشی و مسرت سے کریں خدا کرے اس کا اجرِ عظیم راجہ صاحب بہادر کو ملے اور اون کا ہر کام خدا کی مرضی کے لیے ہو۔ اوس کے بعد فرمایا کہ یہ فتاویٰ وغیرہ سب مرتب کر لیے جائیں۔ اور طبع ہو جائیں تاکہ دوسروں کے لیے مفید و کارآمد ثابت ہوں۔ اسی کے ساتھ حضرت اقدس مدظلہم العالی کی خدمت گرامی میں پیش کرنے کے لیے ایک خط بھی دے کر مجھے رخصت فرمایا۔ وہ خط یہ ہے:۔

جہانگیر آباد پیلس

۱۱ رمئی ۱۹۴۱ء

جناب محترم دام برکاتہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مسجد جہانگیر آباد کے سمت قبلہ کے مسئلہ میں جس قدر جناب والا نے توجہ فرمائی اور اوس کو واضح فرمادیا

اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ جناب کو بعد
تکلیف ہوئی، معافی کا طالب ہوں۔ اب جناب والا کے فتوے کے مطابق
میں نے مسجد ٹیلہ لکھنؤ جو بعہد شاہ عالمگیر بنی تھی اوس کے حساب سے نیز
مسجد قلعہ جہانگیر آباد جس کی بنیاد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب
رحمۃ اللہ علیہ گنج مرادآبادی نے رکھی تھی۔ اوس کے حساب سے اس
نئی مسجد کی بنیاد از سر نو رکھوادی ہے۔ خدائے پاک قبول فرمائے۔
باادب ایک استدعا ہے کہ ایک لکھوری اینٹ اپنے دستِ مبارک
سے مس کر کے عطا فرمائیں۔ جس کو جناب وصی صاحب بھیجدیں گے اور
وہی بنیاد میں رکھ دی جاوے گی۔ اور اس طرح اس مسجد کی بنیاد جناب
والا کی رکھی ہوئی باعثِ برکت ہوگی۔ جو فتوےٰ اور کاغذات اس کے
متعلق ہیں وہ میں نے جناب وصی صاحب کو دے دیے ہیں تاکہ وہ
جناب کے ملاحظہ سے گزران کر بصورت ایک رسالہ مرتب کریں اور قلمی
مسودہ پہلے مجھے بھیج دیں تاکہ آئندہ اوس کے طبع کا انتظام ہو سکے۔

فقط والسلام مع الاکرام

عریضہ۔ محمد اعجاز رسول عفی عنہ

اس کا جواب حضرت اقدس مدظلہم العالی نے اپنے دستِ مبارک سے تحریر
فرما کر مع ایک لکھوری اینٹ کے جس پر بنائے کعبہ کی دعائے ابراہیمی واسمٰعیلی اور
مسجد قبا کی آیتیں دم فرما کر عطا فرمائی۔ تاکہ میں بذریعۂ پارسل جہانگیر آباد بھیج دوں۔
چنانچہ میں نے دونوں چیزیں جہانگیر آباد روانہ کر دیں، اس جواب کی نقل یہ ہے:-

از ناکارہ اشرف علی عفی عنہ۔ بگرامی خدمت محترم و محتشم زیدت مدارجہم دولت مدارہم
السلام علیکم و رحمۃ اللہ الطاف نامہ نے ممنونِ یاد آوری فرمایا جو کچھ جنابِ
والا نے از راہ قدردانی تحریر فرمایا ہے، یہ سب آپ کی عنایتیں اور حسنِ
اخلاق ہے۔ ورنہ اس دینی خدمت میں جو کچھ میں نے حصہ لیا واقعی میں تو

اپنے فرض منصبی کا حق بھی ادا نہ کر سکا اور اگر فرضاً ادا بھی کر سکتا تب بھی اپنی آخرت کو درست کرتا۔ نہ کسی پر احسان تھا۔ نہ کسی کے شکریہ کا مستحق تھا۔ بلکہ ایک درجہ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ مجھ کو باوجود میری نااہلیت کے ایک جزو میں علمی شرکت کا موقع عطا فرمایا۔ اور سب سے زیادہ اس سے ممنون ہوں کہ اس محروم و مہجور کی علمی شرکت کی ایک خاص صورت تجویز فرمائی اگرچہ وہ صورت اصلی شرکت سے بدرجہا متاخر ہے۔ لیکن میری لیاقت سے بدرجہا فوق ہے۔ جس کا صلہ بجز دعا کے میں کیا پیش کر سکتا ہوں۔ اس تجویز کی بنا پر بامید قبول درگاہ الٰہی ایک اینٹ اپنے ہاتھ میں لے کر اس پر بنائے کعبہ کی دعائے ابراہیمی و اسمٰعیلی او بنائے مسجد قبا کی آیتیں دم کر کے وصّی صاحب کے سپرد کرتا ہوں۔ شاید خریدارانِ یوسفی کی فہرست میں اس سُوت والی بڑھیا کے نام کے نیچے اس ناکارہ بوڑھے کا نام درج ہو جائے۔ اس کا خاص اثر میرے قلب پر ہے کہ آپ نے احتیاط کا پہلو پیش نظر کر کے مکرر صَرف کا بار بخوشی گوارا فرمایا اللہ تعالیٰ قبول فرماوے اور عالی ہمتی میں ترقی فرمائے۔ ترتیب رسالہ کی خدمت سے بھی عذر نہیں گو اس کی لیاقت نہیں لیکن میں دفعتاً بیمار ہو گیا اس لیے اس میں کسی قدر مہلت کی اجازت کا مستدعی ہوں۔

والسلام

اس کا جواب جو سر راجہ صاحب بہادر کی طرف سے آیا وہ درج ذیل ہے:۔

جہانگیر آباد راج۔ اودھ

۲۶ر مئی ۱۹۴۱ء

حضرت محترم دام فیضکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ صحیفۂ گرامی دستِ مبارک سے لکھا ہوا مع ایک خشت پختہ آیاتِ قرآنی دم کی ہوئی بنیان مرصوص کے لیے شرف صدور فرما کر باعث صد افتخار ہوا۔ حقیقتاً یہ ایک دینی خدمت

تھی. جس کو جناب والا نے باحسن وجوہ خالصاً لوجہ اللہ انجام دی۔ اب علی
کارروائی کے اجر سے بھی بمصداق الدال علی الخیر کفاعلہ ذات گرامی فائز
ہوگی اور طفیل میں یہ خادم علمائے راسخین شریعت غرا شرف اندوز اور
ماجور ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس توجہ خاص اور عنایت بے غایت کے اظہار تشکر کے لیے زبان وقلم
قاصر ہے۔ پس خاموشی حد تشکر ہے امید ہے مزاج اقدس بخیر ہوگا۔

فقط والسلام مع الاکرام

طالب دعا۔ محمد اعجاز رسول عفی عنہ

اس کا جواب بھی حضرت اقدس مدظلہم العالی نے روانہ فرمایا جس کی نقل ملاحظہ ہو:۔

از احقر اشرف علی عفی عنہ۔ بگرامی خدمت عالی درجت مجمع الحسنات و منبع
البرکات دامت محاسنہم ومعالیہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ صحیفہ گرامی میں احقر کی محض لفظی خدمت و
شرکت کو نظر خوردبین خاصیت سے ملاحظہ فرما کر اس کا درجہ بڑھایا گیا تھا۔
ممنون یادآوری فرمایا۔ اول تو خدمت ہی کیا تھی۔ پھر اس کے بادی بھی جناب
والا ہی تھے۔ جب اس کو شمار میں لایا گیا تو جناب کی جو حقیقی خدمت ہے یعنی
بقعۂ معظمہ مبارکہ کی تکمیل۔ مجھ پر بدرجۂ اولیٰ حق ہے کہ اس کی مقبولیت و
نافعیت اور باقیات صالحات میں ممتاز جگہ پانے کی دل سے دعا کرتا
رہوں۔ اور اس دعا کو بھی اپنی سعادت میں اضافہ سمجھوں۔

والسلام۔ خیر ختام۔

از تھانہ بھون۔ یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۶۰ھ

یہ وہ ضروری واقعات تھے جو میں نے بیان کر دیے اور جو ضروری مکتوبات
تھے وہ درج کر دیے۔ اب آخر میں ایک ضروری مکتوب اور درج کرتا ہوں جو معظمی
جناب مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی زید مجدہم کا ہے جس میں سمت قبلہ معلوم

کرنے کا ایک سہل ترین طریقہ مندرج ہے امید ہے کہ اس سے عام فائدہ پہنچے، اور لوگ اس سے مستفیض ہوں۔ وہ مکتوب یہ ہے:۔

مکرم و محترم بندہ جناب وصل صاحب زاد الطافکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اب تک احقر کی طبیعت درست نہیں ہوئی، سابقہ عارضہ کے بعد دوبارہ اختلاج کی شدت ہوگئی تھی۔ آج قدرے سکون ہونے پر گرامی نامہ کا جواب معروضۂ خدمت ہے اور ان شاء اللہ اسی جمعہ تک حاضری خانقاہ کا ارادہ ہے اگر یہ معروض ناکافی ہو تو اس وقت زبانی عرض کروں گا۔

سمت قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ

(جس کو صاحب تصریح نے سہل ترین قرار دیا ہے۔)

اُن مقامات کے لیے جو مکہ معظمہ سے نوے درجے سے کم فاصلے پر مشرق[عہ] میں واقع ہیں (یہ طریقہ صرف ۲۹ رمئی اور ۱۴ر جولائی[عسہ] کو کارآمد ہے دو ایک یوم کی تقدیم تاخیر کا مضائقہ نہیں کہ تفاوت قلیل ہے۔

جس جگہ کا سمتِ قبلہ معلوم کرنا چاہیں وہاں کے طول البلد کو غیاث اللغات وغیرہ یا کسی اٹلس سے معلوم کرکے ۴۰ درجہ کو (جو طول البلد ہے مکہ مکرمہ کا) اوس میں سے تفریق کر دیں، اور باقی کو ۴ میں ضرب دے کر حاصل ضرب

عہ مغرب میں بھی یہی طریقہ کام دے سکتا ہے۔ مگر مشرق میں نصف النہار۔ کہ مؤخر ہوگا اور مغرب میں مقدم اور جن مقامات کا بُعد مکہ معظمہ سے نوے درجہ یا اوس سے زاید ہو وہاں نصف النہار مکہ کے وقت رات ہوگی اور وہاں کے لیے مقاطر مکہ سے حساب کیا جاتا ہے۔ عدم ضرورت کے سبب یہاں نہیں لکھا گیا ۱۲ منہ

عسہ یہ دونوں تاریخیں جغمینی کے قول کے مطابق ہیں موجودہ ماہرینِ فن کے قول میں اور بھی ہیں مثلاً ۲۰ رمئی اور ۱۶ یا ۱۷ جولائی لیکن یہ تفاوتِ قلیل قابلِ التفات نہیں، ان تاریخوں میں سے جس تاریخ میں بھی دیکھا جاوے گا۔ سمتِ قبلہ صحیح ہو جائے گی۔ ۱۲ منہ

کو ۶۰ پر تقسیم کر کے گھنٹے منٹ بنالیں۔ یہ فرق وقت ہوگا مقامی نصف النہار اور نصف النہار مکہ مکرمہ میں مثلاً

	درجہ
جہانگیر آباد	۸۱
مکۂ مکرمہ	۴۰
	۴۱
	۴
	۱۶۴

۶۰) ۱۶۴ (۲
۱۲۰
۴۴

پس ۲ گھنٹے ۴۴ منٹ فرقِ وقت ہوا۔ یہ ۲۹ مئی یا ۱۴ جولائی کو ایک فٹ یا کم وبیش مربع زمین کی سطح خوب ہموار کر کے اس کے درمیان ایک کیل بالکل سیدھی نصب کی جاوے۔ (وہ کیل تخمینی ۳ انچ ہو) اور مقامی[عہ] دھوپ گھڑی سے ۱۲ بجے وقت ملالیں بعد ازاں فرقِ وقت کے مطابق یعنی جہانگیر آباد میں ۲ بج کر ۴۴ منٹ پر اس کیل کے سایہ کے منتہیٰ پر ایک نقطہ لگادیں اور اس نقطہ سے کیل کے سر پر ڈورا رکھ کر صحیح خط کشید کریں۔ اس خط کے مطابق مسجد کی جنوبی یا شمالی دیوار قائم ہوگی۔ والسلام

احقر عبد الکریم گمتھلوی عفی عنہ۔ از مدرسہ قدسیہ شاہ آباد ضلع کرنال مورخہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ

عہ اور اگر وہاں دھوپ گھڑی موجود نہ ہو تو اس کیل کے گرد ایک فٹ کا دائرہ بنا کر اس سے دھوپ گھڑی کا کام لیا جا سکتا ہے تاریخ مذکور سے ایک دو دن پہلے صبح کے وقت دیکھیں کہ کیل کا سایہ دائرے میں کس جگہ داخل ہوتا ہے وہاں پر بہت احتیاط سے ایک نقطہ لگادیں (یہ مدخل ظل ہے)، پھر شام کے وقت اس جگہ ایک نقطہ لگائیں جہاں سے کیل کا سایہ دائرہ سے باہر نکلے (یہ مخرجِ ظل ہے)، پھر مدخلِ ظل اور مخرجِ ظل کے درمیان ایک خط کھینچ کر اس کے نصف پر ایک نقطہ لگائیں اور مدخل و مخرج کے درمیان جو دائرے کا حصہ آیا ہے اس کے نصف پر بھی ایک نقطہ لگائیں اور پھر ان دونوں نقطوں پر سے گزرتا ہوا ایک خط کیل تک کھینچ دیں یہ خط نصف النہار ہو جائے گا۔ اب ۲۹ مئی یا ۱۴ جولائی کو جب کیل کا سایہ نصف النہار پر پڑے اس وقت گھڑی میں ۱۲ بجا لیے جاویں ۱۲ منہ

اب میں اپنے مقدمہ کو ختم کرتا ہوں۔ اس کے بعد اول اصل فتویٰ بصورت رسالہ شروع ہوتا ہے جو روح ہے اس مجموعہ کی جس کا نام حضرت اقدس مدظلہم العالی نے **تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال** تجویز فرمایا ہے۔ اور آخر میں ایک بڑے نئے فتنہ کے انسداد کے لیے مولانا محمد ظفرالدین صاحب قادری رضوی استاذ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا ایک محققانہ مضمون "مشرقی اور سمتِ قبلہ" رسالہ معارف اعظم گڑھ سے بجنسہ نقل کرتا ہوں۔ جس میں سمتِ قبلہ کے متعلق مشرقی کے بے اصل شبہات و اعتراضات کا شافی کافی جواب دیا گیا ہے۔

اس مکمل مجموعہ کو حضرت اقدس مدظلہم العالی نے تحقیق سمتِ قبلۃ البلاد لسعی رئیس جہانگیر آباد کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ لوح کی کل عربی عبارت حضرت اقدس مدظلہم العالی کی ہے۔ اس سے پہلے ایک اور سرورق ہے جس کا نام میں نے عوام کے سمجھنے کے لیے سمتِ قبلہ اور تاریخی نام قبلہ کے سمت کی پاکیزہ تحقیق ۱۳۶۰ھ اور لقب تاریخی سمتِ قبلہ کے لاجواب شرعی احکام ۱۳۶۰ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو مقبول فرمائیں۔ جن جن علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین نے اس میں امداد فرمائی ہے اس کا ان کو نیک صلہ ملے اور اس مجموعہ کا ہر لفظ مسلمانوں کے لیے مفید اور سمتِ قبلہ کے دریافت کرنے والوں کے لیے کارآمد ثابت ہو اور جناب سر راجہ صاحب بہادر جہانگیر آباد بالقابہ کی عالی ہمتی، سعی بلیغ، جذبۂ اسلامی اور جوشِ ملی کا بہتر سے بہتر اجر اور اپنے اور اپنے حبیب حضرت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر چلنے کی توفیق نیک عطا ہو، عمر و اقبال اور دولت و اجلال میں ترقی ہو۔

این دعا از من و از جملہ جہان آمین باد!

اس سلسلے میں اگر میں اپنے محترم جناب پروفیسر سید نواب علی صاحب ام اے کی مخلصانہ توجہات کا شکریہ ادا نہ کروں تو کمال ناشکرگزاری ہوگی۔ آپ نے اس کارِ خیر میں جس قدر امداد فرمائی، میری ہمت افزائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے مجھے سرفراز کیا اس کا میں شکریہ ادا ہی نہیں کر سکتا، بجز اس کے کہ یہ کہوں۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ ادر

۱۵ جون ۱۹۴۱ء — احقر وصی بلگرامی

از

جناب مولانا مولوی محمد شفیع صاحب زید مجدہم. مفتی دار العلوم دیوبند (سہارنپور)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ قصبہ جہانگیر آباد ضلع بارہ بنکی میں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے جس کا سمتِ قبلہ ایک انجینیر صاحب نے ایک انگریزی ماہر ہیئت کے ذریعے سے دس درجہ جانبِ جنوب قرار دیا ہے، ایک دوسرے عالم دین ماہر ہیئت نے سمتِ قبلہ اٹھائیس دقیقہ جانبِ شمال نکالا ہے۔ اس حالت میں جو حکم شرع شریف کا ہو، اوس سے مطلع کیا جاوے اور عام طور سے مسجد کی تعمیر کے لیے سمتِ قبلہ کس طرح معلوم کی جائے اس کا شرعی طریقہ کیا ہے؟

الجواب

سمتِ قبلہ کی تعیین اور بنائے مسجد میں سنتِ سلف صحابہ و تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین سے آج تک یہ ہے کہ جس بلدہ میں مساجد قدیمہ مسلمانوں کی تعمیر کردہ موجود ہوں اون کا اتباع کیا جائے۔ ایسے مقامات میں آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ کی تدقیق میں پڑنا سنت کے خلاف اور نامناسب و باعثِ تشویش ہے۔ ہاں جنگلات او ایسی نو آبادیات میں جن میں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں قواعدِ ریاضیہ سے مدد لی

جاوے تو مضائقہ نہیں۔ گر اُن سے مدد لینا ضروری وہاں بھی نہیں، بلکہ وہاں بھی تحری، اور تخمین قریبی آبادیوں کی مسجد کا کافی ہے اور اگر مساجد بلدہ کی سمتیں کچھ باہم متخالف ہوں تو بظنِ غالب، یا تجربہ کار مسلمانوں کے اندازہ سے جو اُن میں زیادہ اقرب معلوم ہوں۔ اوس کا اتباع کر لیا جائے۔ البتہ اگر کسی بلدہ کی عام مساجد کے متعلق قوی شبہ ہو جائے کہ وہ سمتِ قبلہ سے اس درجہ منحرف ہیں کہ نماز ہی درست نہ ہوگی تو ایسی صورت میں اُن کا اتباع نہ کیا جاوے بلکہ قواعد ریاضیہ سے سمتِ قبلہ کا استخراج کیا جاوے۔ یا اس بلدہ کے قریب کی کسی مسجد سے تخمینہ کر کے سمتِ قبلہ متعین کیا جاوے۔ لہٰذا صورتِ مندرجۂ سوال میں انجینیر صاحب اور دوسرے ماہر ہیئت صاحب نے جو متخالف سمتیں نکالی ہیں دونوں کو نظرانداز کر کے مساجد قدیمہ کے مطابق مسجد تعمیر کی جاوے۔ اصل سوال کا جواب اتنا ہی ہے جو مقتضاء ادلۂ شرعیہ کا ہے۔ باقی مسئلہ سمتِ قبلہ کی تحقیق اور اس کے دلائل پر اجمالی نظر کے لیے سطور ذیل لکھی جاتی ہیں:۔

اس مسئلہ میں اصل قابلِ نظر دو چیزیں ہیں۔

(۱) استقبال قبلہ جو نماز میں فرض ہے اس کی حد ضروری کیا ہے؟

(۲) بلاد بعیدہ میں اس ضروری سمتِ قبلہ کے معلوم کرنے کا شرعی طریق کیا ہے۔ یہ دونوں مسئلہ جُدا جُدا سمجھ لیے جاویں تو مسئلہ زیر بحث خود بخود حل ہو جائے گا۔

پہلے مسئلہ کے متعلق مذہب مختار حنفیہؒ کا یہ ہے کہ جو شخص بیت اللہ شریف کے سامنے ہو۔ اوس کے لیے عین کعبہ کا استقبال فرض ہے اور جو اوس سے غائب ہے اوس کے ذمہ جہتِ کعبہ کا استقبال ہے، عین کعبہ کا نہیں۔ کما فی البدائع۔ و تعتبر الجهة دون العین کذا ذکر الکرخی والرازی وهو قول عامة مشایخنا بما وراء النهر بدائع ص۱۱۸ ومثله فی الهدایة وعامة المتون والشروح۔ جیسے کہ بدائع میں ہے کہ اعتبار جہتِ کعبہ کا کیا جاتا ہے۔ نہ کہ عین کعبہ کا۔ ایسے ہی امام کرخی اور امام رازی نے بیان کیا ہے اور یہی ماوراء النہر کے ہمارے عام مشائخ کا قول ہے بدائع جلد اول ص۱۱۸

اور ایسے ہی ہدایہ اور عام متون وشروح میں ہے۔

پھر جہتِ قبلہ کے استقبال کے معنی یہ ہیں کہ ایک خط جو کعبہ پر گزرتا ہوا جنوب و شمال پر منتہی ہو جائے اور نمازی کے وسط جبہہ سے ایک خط مستقیم نکل کر اوس پہلے خط سے اس طرح تقاطع کرے کہ اوس سے موقع تقاطع پر دو زاویۂ قائمہ پیدا ہو جاویں وہ قبلۂ مستقیم ہے۔ اور اگر نمازی اتنا منحرف ہو کہ وسط جبہہ سے نکلنے والا خط تقاطع کر کے زاویۂ قائمہ پیدا نہ کرے، بلکہ حادہ یا منفرجہ پیدا کرے لیکن وسط جبہہ کو چھوڑ کر پیشانی کے اطراف میں کسی طرف سے نکلنے والا خط زاویۂ قائمہ پیدا کر دے، تو وہ انحرافِ قلیل ہے، اوس سے نماز صحیح ہو جاوے گی۔ اور اگر پیشانی کی کسی طرف سے بھی ایسا خط نہ نکل سکے جو خط مذکور پر زاویۂ قائمہ پیدا کر دے تو وہ انحرافِ کثیر ہے اوس سے نماز نہ ہوگی، اور علمائے ہیئت و ریاضی نے انحرافِ قلیل وکثیر کی تعیین اس طرح کی ہے کہ پینتالیس ۴۵ درجہ تک انحراف ہو تو قلیل ہے، اوس سے زاید ہو تو کثیر، مفسدِ صلوٰۃ ہے (کما سیاتی عن الخیریۃ) چنانچہ عنقریب فتاویٰ خیریہ سے نقل ہو کر آتا ہے۔ انحراف قلیل وکثیر کی تعیین میں فقہائے کرام کا ایک دوسرا قول بھی ہے جس میں اس سے کم گنجائش ہے یعنی مابین المغربین وہ احتیاط پر مبنی ہے۔ جیسا کہ آئندہ (نمبر ۹ کے حاشیہ میں) آتا ہے۔ اور علمائے ہیئت کے اور بھی اقوال ہیں جن میں سے بعض اس سے زیادہ وسعت کو چاہتے ہیں اور بعض میں اس سے کم گنجائش نکلتی ہے۔ اس جگہ ہم نے بنظرِ احتیاط اوسط سمجھ کر اس قول کو اختیار کیا ہے۔ قول اول کی دلیل عباراتِ ذیل ہیں:۔

فی ردالمحتار: بل المفهوم مما قدمناه عن المعراج والدرر من التقييد بحصول زاويتين قائمتين عند انتقال المستقبل لعين الكعبة يمينا اويسارا انه لايصح لوكانت احدهما	شامی میں لکھا ہے بلکہ اوس عبارت سے جس کو ہم نے پہلے معراج اور دُرر سے نقل کیا ہے کہ استقبال کرنے والے کے منتقل ہونے کے وقت عین کعبہ پر دو زاویۂ قائمہ حاصل ہونے کی قید ہے، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر

حادة والاخرى منفرجة (الى ان قال) فعلم ان الانحراف اليسير لا يضر وهو الذي يبقى معه الوجه او شئ من جوانبه مسامتا لعين الكعبة او لهوائها بان يخرج الخط من الوجه او من بعض جوانبه ويمر على الكعبة او هوائها مستقيما ولا يلزم ان يكون الخط الخارج على استقامته خارجا من جبهة المصلى بل منها او من جوانبها (شامى هندى ص۲۸۹) ويؤيده ما فى الفتاوى الخيرية وعن ابى حنيفةؒ المشرق قبلة اهل المغرب والمغرب قبلة اهل المشرق والجنوب قبلة اهل الشمال والشمال قبلة اهل الجنوب وعليه فالانحراف القليل لا يضره (خيرية ص۷) وايضا يؤيده ما فى البحر فلو فرض مثلا خط من تلقاء وجه المستقبل للكعبة على التحقيق فى بعض البلاد و خط آخر يقطعه على زاويتين قائمتين من جانب يمين المستقبل وشماله ولا يزول تلك المقابلة بالانتقال الى اليمين والشمال على ذلك الخط

ایک حادہ اور دوسرا منفرجہ ہوگا تو نماز صحیح نہ ہوگی (یہاں تک کہ) اس سے معلوم ہوا کہ انحرافِ قلیل مضر نہیں اور وہ وہ ہے جس کے وقت چہرہ یا اوس کے ہر دو جانب عین کعبہ، یا فضائے کعبہ کی سمت میں رہیں، اس طرح کہ چہرہ یا اوس کی کسی جانب سے اگر ایک خطِ مستقیم نکالا جائے تو وہ کعبہ یا فضائے کعبہ پر گزر جائے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ خارج ہونے والا خط مستقیم نمازی کی پیشانی سے نکلے بلکہ پیشانی سے یا اوس کی ہر دو جانب سے (شامی ج ۱ ص۲۸۹) اور فتاویٰ خیریہ کی یہ عبارت بھی اس کی موید ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سے روایت ہے کہ مشرق اہل مغرب کا قبلہ ہے۔ اور مغرب اہل مشرق کا، اور جنوب اہل شمال کا اور شمال اہل جنوب کا۔ دراس کلام سے ثابت ہوا کہ انحرافِ قلیل مضر نہیں (خیریہ ج ۱ ص۷) اور بحر الرائق کی یہ عبارت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً کسی شہر میں ایک شخص صحیح طور سے کعبہ کا استقبال کیے ہوئے ہے اوس کے چہرہ سے ایک خط نکلتا ہوا فرض کریں ایک دوسرا خط اس کا قاطع فرض کریں کہ وہ پہلے خط کو قطع کرتا ہوا دائیں بائیں جانب دو زاویہ قائمہ بنائے (اس صورت میں جہتہ کعبہ کا) مقابلہ زائل نہ ہوگا۔ اگرچہ وہ شخص اسی

بفراسخ كثيرة ولذا وضع العلماء
قبلة بلد وبلدين و بلاد على
سمت واحد (بحر ص۳۰۱ ج۱) ومثله
فى رد المحتار عن الفتح وشرح المنية
وزاد الفقير وغيره۔

وفى الخيرية تحت قوله (سئل)
ومن القواعد الفلكية اذا كان
الانحراف عن مقتضى الادلة اكثر
من خمس واربعين درجةٓ يمنة
او يسرة يكون ذلك الانحراف
خارجا عن جهة الربع الذى فيه
مكة المشرفة من غير اشكال (الى)
فهل هذه المحاريب التى
انحرافها كثير فاحش يجب الانحراف
فيها يسرة الى جهة مقتضى الادلة
والحالة ما ذكرنا ام لا. واذا قلتم
يجب فهل اذا عاند شخص وصلى
فى هذه المحاريب بعد اثبات ما
ذكرنا تكون صلوته فاسدة الخ
(اجاب) حيث زالت بالانحراف
المذكور المقابلة بالكلية بحيث لم
يبق شئ من سطح الوجه مسامتا

خط پر میلوں دائیں بائیں جانب ہٹتا جاتا ہے اور جگہ بدلتا ہے
اسی لیے علماء نے ایک شہر اور دو شہر اور کئی شہروں
کے قبلے ایک سمت پر قائم کیے ہیں (بحر ج۱ ص۳۰۱)
ایسے ہی فتح القدیر و شرح منیۃ المصلی اور زاد الفقیر
وغیرہ سے شامی میں نقل ہے۔

اور فتاویٰ خیریہ میں قول سُئل کے تحت
میں ہے اور قواعد فلکیہ سے یہ بھی ثابت ہوتا
ہے کہ دائیں بائیں جانب کا انحراف (قبلہ سے،
بلحاظ دلائل فلکیہ) ۴۵ درجہ سے زائد ہو تو
یہ انحراف بغیر اشکال مکہ مکرمہ کی جہت ربع
سے باہر ہوگا۔ (یعنی قبلہ کا استقبال نہ ہوگا)
(یہاں تک کہ) یعنی درمیانی عبارت چھوڑ کر،
حالات مذکورہ میں وہ مساجد جن کا انحراف (قبلہ
سے) حد سے زیادہ ہو تو کیا اون میں واجب ہوگا
کہ قواعد ریاضیہ کی رُو سے جو سمت نکلے، اوس
طرف مائل ہو جاویں یا نہیں۔ اگر انحراف کو واجب
کہتے ہو، اس صورت میں اگر کوئی معاند بعد ثبوت
دلائل ان محاریب (منحرفہ) کی طرف نماز پڑھے۔ کیا
اوس کی نماز فاسد ہوگی۔ جواب۔ جب انحراف
مذکورہ سے اس طور پر کہ مقابلہ کعبہ بالکلیہ زائل
ہو گیا کہ چہرہ کے سامنے کا کوئی حصہ کعبہ کے
مقابل باقی نہ رہے، استقبال قبلہ مشروط صحت

ف تيسير مجموعه ۱۶ قسمت تسعون درجة وهو ربع الدائرة ۱۲- محمد شفيع عفا عنه -

للکعبۃ عدم لاستقبال الشرط الصحۃ	کیونکہ جب نہ پایا گیا جب شرط (یعنی
الصلوۃ بالاجماع واذا عدم الشرط	استقبال قبلہ) نہ پایا گیا مشروط (یعنی نماز)
عدم المشروط (خیریۃ ص ۱۰۲)	بھی نہ ہوگی

عبارات مذکورہ سے سمتِ قبلہ اور استقبالِ قبلہ کی جو حد معلوم ہوتی ہے اس کا حاصل سہل اور عامیانہ عبارت میں یہ ہے کہ انسان کے چہرہ کا کوئی ذرا سا ادنیٰ حصہ خواہ وسطِ چہرہ کا ہو یا داہنی بائیں جانب کا، بیت اللہ شریف کے کسی ذرا سے حصے کے ساتھ مقابل ہو جاوے۔ اور فن ریاضی کی اصطلاحی عبارت میں یہ ہے کہ عین کعبہ سے پینتالیس ۴۵ درجہ تک بھی انحراف ہو جاوے تو استقبال فوت نہیں ہوتا اور نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ اس سے زائد انحراف ہو تو استقبال فوت ہو کر نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انحرافِ قلیل جو عام طور پر کہیں جنوباً کہیں شمالاً واقع ہو جاتا ہے۔ یہ ناقابل التفات ہے۔ اس کی وجہ سے نہ کسی مسجد کی جہت بدلنے کی ضرورت ہے نہ اس کو قائم رکھتے ہوئے کسی طرف مائل ہونے کی ضرورت ہے۔

دوسرا مسئلہ[عـــہ] یہ ہے کہ بلادِ بعیدہ میں سمت قبلہ اور جہت استقبال معلوم کرنے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اس میں تعامل کس طرح ہے؟ اور یہ کہ قواعد ریاضیہ کا استعمال اس کام کے لیے جائز و معتبر ہے یا نہیں اور ہے تو کس درجہ میں؟

اس بارے میں پہلے ایک مقدمہ یہ سمجھ لینا مناسب ہے کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے تمام احکام کی بنیاد یُسر و سہولت اور سادگی و بے تکلفی پر ہے۔ فلسفیانہ تدقیقات پر نہیں۔ کیونکہ از روئے حکمت اس شریعت کا تعلق تمام بحر و بر، اسود و احمر، شہری و دیہاتی آبادیوں اور ان کے ساکنوں پر حاوی ہے، اس لئے فرقِ نفس

[عـــہ] اس مسئلہ کی ایک مزید مفید توضیح خود حضرت مؤلف کی لکھی ہوئی حصول سمت قبلہ اور استقبال قبلہ رسالہ ہذا کے صفحہ ۲۰ ... پر ملحق ہے جو داخل طبع ہے ۱۲ منہ

نماز روزہ وغیرہ جس طرح شہریوں اور تعلیم یافتہ طبقات پر عائد ہیں۔ اسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑ کے دروں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ و ناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں اور جو احکام اس درجہ عام ہوں، ان میں مقتضا عقل و حکمت و رحمت کا یہی ہے کہ ان کو تدقیقات اور قواعد ریاضیہ یا آلاتِ رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے۔ تاکہ ہر عام و خاص، خواندہ و ناخواندہ بآسانی اپنے فرائض انجام دے سکے۔ شریعتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام اسی نظریہ کے ماتحت بالکل آسان اور سادہ طریق پر آئے۔ روزہ رمضان کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا ہے، حسابات ریاضیہ پر نہیں مہینے قمری رکھے گئے ہیں جن کا مدار رویت ہلال پر ہے۔ شمسی مہینے جن کا مدار خاص حسابِ ریاضیہ پر ہے، عام احکام شرعیہ میں ان کو نہیں لیا گیا۔ اسی طرح احکام اسلامیہ کے تتبع سے بکثرت اس کے نظائر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

اس مختصر مقدمہ کے بعد مسئلہ زیر بحث میں یہ فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا کہ سمتِ قبلہ اور استقبال قبلہ جس کا ہر مسلمان دن میں پانچ مرتبہ مامور ہے، اس کے لیے شریعت نے ضرور کوئی آسان اور بالکل سادہ طریقہ اختیار کیا ہوگا جس کو ہر شہری و دیہاتی بآسانی عمل میں لا سکے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس کے متعلق یہ ہے۔ ما بین المشرق والمغرب قبلۃ رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃ۔ یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے (اس کو ابوہریرہؓ سے ترمذی میں روایت کیا) یہ ارشاد اگرچہ تمام عالم کے لیے نہیں بلکہ خاص اہل مدینہ اور اس کے قرب و جوار کے لیے ہے۔ لیکن اتنی بات اس میں عام ہے کہ سمتِ قبلہ کی تعیین میں زیادہ تدقیق کا مکلف نہیں بتایا بلکہ بین المشرق والمغرب (مشرق و مغرب کے درمیان) فرما کر پوری جہت جنوب کو قبلہ قرار دے دیا اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس حدیث میں بین المشرق والمغرب سے اصطلاح ریاضی پر نقطہ مغرب و مشرق کی درمیانی قوس یعنی نصف دائرہ مراد نہیں جس سے ربع دائرہ کا قول جو بحوالہ خیر یہ ذکر کیا گیا ہے، اس کے مخالف حدیث ہونے کا شبہ ہو سکے، بلکہ مراد اس سے مطلقاً پوری جہت جنوب کا بتلانا مقصود ہے

توجس طرح مدینہ طیبہ میں مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے، اسی طرح ہندوستان میں جنوب وشمال کے درمیان قبلہ کہا جا سکتا ہے یعنی پوری جہتِ مغرب۔

وقد نص علیہ احمد بن خالد بان قول عمر ما بین المشرق والمغرب قبلۃ قالہ بالمدینۃ فمن کانت قبلتہ مثل قبلۃ المدینۃ فھو فی سعۃ مما بین المشرق والمغرب ولسائر البلدان من السعۃ فی القبلۃ من ذلک بین الجنوب والشمال وقال ابو عمر بن عبد البر لاخلاف بین اھل العلم فیہ (کتاب الخطط ص ۲۵۸ ج ۱)

اور احمد بن خالد نے تصریح فرمائی ہے کہ حضرت عمر نے "ما بین المشرق والمغرب قبلۃ" مدینہ منورہ میں فرمایا تھا۔ لہٰذا جس کا قبلہ مدینہ کے قبلہ کی طرح ہو، اوس کو مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ کی گنجایش ہے، باقی شہروں میں جنوب و شمال کے درمیان کی وسعت ہوگی۔ ابو عمر بن عبد البر مالکی فرماتے ہیں کہ اہل علم اس بارے میں اختلاف نہیں رکھتے (یعنی سب متفق ہیں)۔ کتاب الخطط ج ۱ ص ۲۵۸۔

پھر حضرات صحابہ وتابعین اور اون کے بعد عامۂ مسلمین کے تعامل نے اوس کو بالکل واضح کردیا کہ بلادِ بعیدہ میں جہاں کہیں حضرات صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں، یا آپ کے بعد پہونچے ہیں، وہاں نمازیں ادا کرنے اور مستقل قیام کی صورت میں مساجد بنانے میں ان حضرات سے کہیں منقول نہیں کہ آلاتِ رصدیہ سے کام لے کر سمتِ قبلہ متعین کی ہو، بلکہ موٹے موٹے آثار ونشانات اور اور شمس وقمر اور قطب وغیرہ مشہور ومعروف ستاروں کی پہچان سے ایک اندازہ قائم کرکے محض تحری وتخمینہ سے سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے۔ علامہ مقریزی نے کتاب الخطط میں نہایت کافی تفصیل ووضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرات صحابہؓ نے مصر اور دوسرے بلاد میں اسی طرح موٹے موٹے آثار ونشانات کے ذریعہ اندازہ وتحری سے کام لے کر مساجد بنائی ہیں، اور عام مسلمانوں نے اُن کا اتباع کیا ہے۔ اور احمد بن طولون نے جب مصر میں اپنی مسجد کی بناڈالی تو مدینۂ طیبہ آدمی بھیج کر مسجد نبوی کی سمتِ قبلہ خاص طریق پر دریافت کرائی اور اوس کے موافق

مسجد بنائی جو جامع عمرو بن عاص فاتح مصر سے کسی قدر منحرف ہے۔ لیکن علماء نے
جامع عمرو بن عاص کے اتباع کو ہی اولیٰ قرار دیا ہے اور مصر و اطراف مصر کی مساجد
اسی کے مطابق ہیں۔ کتاب الخطط کی بقدر ضرورت عبارت یہ ہے کہ:-

قال الکندی وقال یزید بن ابی حبیب
سمعت اشیاخنا ممن حضر مسجد
الفتح (یعنی جامع عمرو بن العاص)
یقولون وقف علی اقامة قبلة
المسجد الجامع ثمانون رجلا من اصحاب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
منهم الزبیر بن العوام والمقداد و
عبادة بن الصامت وابو الدرداء و
فضالة بن عبید وعقبة بن عامر و
فی روایة اسس مسجدنا هذا اربعة
من الصحابة ابوذر وابو بصیرة ومحمئة
بن جزء الزبیدی ونبیه بن صواب
قال عبد اللہ بن ابی جعفر اقام
محرابنا هذا عبادة بن الصامت و
رافع بن مالک وهما نقیبان عہ وقال
داؤد بن عقبة ان عمرو بن العاص

کندی کا قول ہے کہ یزید بن حبیب فرماتے ہیں کہ ہم
نے اپنے اون شیوخ (واساتذہ) سے جو مسجد
الفتح (یعنی جامع عمرو بن عاص کے تعمیر کے
وقت موجود تھے۔ یہ سنا ہے کہ جامع مسجد کے
قبلہ کی تصحیح کے واسطے اسی صحابہؓ مقرر کیے
گئے تھے اون میں حضرت زبیر بن العوام، مقداد،
عبادہ بن الصامت، ابو درداء، فضالہ بن عبید
عقبہ بن عامرؓ تھے۔ اور ایک روایت میں ہے
کہ ہماری اس مسجد کی بنیاد چار صحابہؓ نے رکھی۔
ابوذر و ابو بصیرہ و محمئہ بن جز الزبیدی و نبیہ
بن صواب۔ نیز عبداللہ ابن ابی جعفر فرماتے
ہیں کہ ہماری اس محراب کو عبادہ بن الصامت
رافع بن مالک نے قائم فرمایا۔ اور یہ دونوں
نقیب تھے۔ داؤد بن عقبہ فرماتے ہیں کہ حضرت
عمرو بن العاص نے ربیعہ بن شرجیل بن حسنہ اور
عمرو بن علقمہ قرشی عدوی کو قبلہ کے قائم کرنے کے

عہ قال فی مجمع البحار وکان ای عبادة من النقباء هو جمع نقیب وهو کالعریف علی
القوم المقدم علیهم یتعرف اخبارهم وینقب عن احوالهم ای یفتش اھ ص۳۸۶ (حضرت عبادہ
نقباء میں سے تھے۔ نقباء جمع نقیب کی ہے۔ نقیب عریف قوم کے اس سردار کو کہتے ہیں جو ان کے حالات
سے باخبر رہے اور ان کے دقائق کی تفتیش کرے ۱۲ منہ

بعث ربیعة بن شرحبیل بن حسنة وعمرو بن علقمة القرشی ثم العدوی یقیمان القبلة وقال لهما قوما اذا زالت الشمس او قال انتصفت الشمس فاجعلاها علی حاجبیکما ففعلا۔ وقال اللیث ان عمرو بن العاص کان یمد الحبال حتی اقیمت قبلة المسجد۔ وقال عمرو بن العاص شرقوا القبلة تصیبوا الحرم۔ قال فشرقت جداً الخ۔

کتاب الخطط للمقریزی ج ۲ ص ۲۴۶، ۲۴۷

واسطے بھیجا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ وہاں کھڑے رہو جب سورج ڈھلے یا یہ فرمایا کہ نصف النہار پر پہنچے تو سورج کو حاجبین (بھوؤں) پر لینا۔ ہر دو نے ایسا ہی کیا اور (امام) لیث فرماتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص نے رسی تان کر (پھیلا کر) قبلہ مسجد کو قائم فرمایا اور حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا کہ قبلہ مشرق کی طرف رکھو تو حرم کعبہ کا صحیح استقبال ہوگا۔ (لیث نے) فرمایا کہ اسی لیے ہم نے (قبلہ کو) مشرق کی طرف زیادہ مائل کر دیا۔

کتاب الخطط للمقریزی ج ۲ ص ۲۴۶، ۲۴۷

روایات مذکورہ میں اگرچہ بظاہر قدرے اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن اول تو غور کرنے کے بعد یہ تعارض رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت کی شرکت میں یہ کام ہوا، روایت کرنے والوں نے اپنے اپنے علم کے مطابق خاص خاص صحابہؓ کی طرف منسوب کیا جس میں دوسروں کی نفی نہیں ہے ثانیاً یہ سب روایات اتنی بات پر متفق ہیں کہ سمتِ قبلہ کی تعیین میں آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ سے کام نہیں لیا گیا۔ حالانکہ مصر جیسا شہر اس کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ محض تحری و تخمین سے سمتِ قبلہ مقرر کی گئی وہو المراد۔ اور اسی لیے صاحب بحر الرائق فرماتے ہیں:۔

لا عذر لاحد فی الجهل بالادلة الظاهرة المعتادة کالشمس والقمر وغیر ذلک اما دقایق علم الهیئة وصور النجوم الثوابت

دلائل ظاہرہ عادیہ مثل سورج چاند وغیرہ سے جہل کی معذوری کسی شخص کی بھی قابل قبول نہیں۔ (البتہ) علم ہیئت اور صور ستارگان غیر سیارہ کے دقائق جاننا عذر صحیح ہے۔

فهو معذور فی الجهل بها (الی ان قال) و محاریب الدنیا کلها نصبت بالتحری حتی منیٰ و لم یزد علیه شئ و هذا خلاف ما نقل عن ابی بکر الرازی فی محراب المدینة انه مقطوع به فانما نصبه رسول الله صلی الله علیه وسلم بالوحی بخلاف سائر البقاع حتی قیل ان محراب منیً نصبت بالتحری و العلامات و هو اقرب المواضع الی مکة (بحر ص ٣٠٢ ج ١) و مثله فی رد المحتار۔

(یہ بھی کہا، کہ دنیا کی مساجد کے تمام محرابیں یہاں تک کہ (مسجد) منیٰ کی بھی تحری (اندازے) سے قائم کی گئی ہیں۔ تحری کے علاوہ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ (یعنی آلاتِ رصدیہ سے کام نہیں لیا گیا)۔ (البتہ) اس عموم سے وہ مستثنیٰ ہے جو کہ ابوبکر رازی سے منقول ہے کہ محراب مدینہ قطعی اور یقینی ہے (تخمینی نہیں) کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے ذریعہ قائم فرمایا ہے۔ بخلاف باقی شہروں کے اکہ تحری و علامات سے ہوئے، محراب منیٰ جو خانۂ کعبہ سے قریب تر ہے وہ بھی تحری و علامات پر قائم کی گئی۔ (بحر ص ٣٠٢ ج ١) اور شامی میں بھی اسی طرح بیان ہے۔

اور ملک العلماء صاحبِ بدائع فرماتے ہیں:۔

و ان کان نائیا عن الکعبة غائبا عنها یجب علیه التوجه الی جهتها و هی المحاریب المنصوبة بالامارات الدالة علیها لا الی عینها (ثم قال) اما اذا جعلت قبلة الجهة و هی المحاریب المنصوبة لا یتصور ظهور الخطاء فنزلت الجهة فی هذه الحالة منزلة عین الکعبة فی حال المشاهدة و لله

اگر (مصلی) کعبہ سے دور اور اوس سے غائب ہو، اوس وقت جہت کعبہ کی طرف توجہ کرنا واجب ہے۔ نہ عین کعبہ کی طرف اور جہت کعبہ وہ محرابیں ہیں جو علامات دالہ سے قائم کی گئی ہیں۔ (پھر فرماتے ہیں) کہ جب نمازی کا قبلہ محراب ہائے قائمہ مقرر کر دی گئی ہیں، اوس میں خطا و غلطی ظاہر نہ ہوگی۔ کیونکہ جہت قبلہ اس وقت بمنزلۂ عین کعبہ کے قرار دے دی

تعالیٰ ان یجعل ای جهة شاء
قبلة لعبادہ علی اختلاف
الاحوال و الیه وقعت
الاشارۃ فی قوله تعالیٰ سیقول
السفهاء من الناس ما
ولّٰهم عن قبلتهم التی
کانوا علیها قل لله المشرق
والمغرب یهدی من
یشآء الی صراط مستقیم
ولانهم جعلوا عین
الکعبة قبلة فی هذہ
الحالة بالتحری وانه
مبنی علی مجرد شهادۃ
القلب من غیر امارۃ و
الجهة صارت قبلة باجتهادهم
المبنی علی الامارات الدالة
علیها من النجوم والشمس
والقمر وغیر ذلك فکان
فوق الاجتهاد بالتحری و
لهذا من دخل بلدۃ و
عاین المحاریب المنصوبة
فیها یجب علیه التوجه الیها
ولا یجوز له التحری الخ بدائع

گئی۔ حالت کے بدلنے میں حق تعالیٰ کو اختیار
ہے کہ بندوں کے واسطے جس چیز کو
رچاہیں، قبلۂ توجہ بنادیں۔ حق تعالیٰ شانہ
کے اس قول میں اشارہ اسی طرف ہے۔
اب تو یہ بے وقوف ضرور کہیں ہی گے
کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت)
قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا، جس طرف
پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے۔ کس (بات) نے
بدل دیا۔ آپ فرمادیجیے کہ سب مشرق؛ اور
مغرب اللہ ہی کی ملک میں ہیں جس کو خدا ہی
چاہیں رہ، سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں (دوسری وجہ
یہ ہے کہ کعبہ سے دور ہونے کی صورت میں
عین کعبہ کو تحری و اندازہ سے قبلہ بنایا گیا
ہے اور تحری کا مدار عین شہادت قلب پر
ہے (جس میں علامات سے استدلال کا دخل
نہیں) اور جہت کعبہ کو قبلہ بنانے کا مدار
شمس و قمر وغیرہ علامات دالہ سے استدلال
پر ہے اسی لیے بذریعہ امارات و علامات جہت
کو قبلہ قرار دینا اوس سے بہتر ہے کہ محض
تحری و اندازہ سے عین کعبہ کی طرف
استقبال کیا جاوے۔ اسی لیے جو شخص کسی
شہر میں داخل ہو اور وہاں کی قائم شدہ محرابیں
دیکھے اوس کو نماز کے واسطے اسی طرف توجہ

صح ۱۱ج ۱ ؛ وفی فتاوی قاضی خان وجهة الكعبة تعرف بالدليل والدليل فی الامصار والقری المحاريب التی نصبها الصحابة والتابعون فعلينا اتباعهم فی استقبال المحاريب المنصوبة فان لم تكن فالسوال من الاهل اھ۔

واجب ہے تحری واجتہاد جائز نہیں۔ انتہ (بدائع ج۱ ص۱۱۸) اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ جہت کعبہ دلیل سے معلوم کی جاتی ہے اور شہر اور آبادی میں دلیل قبلہ، وہ محرابین ہیں جن کو صحابہؓ وتابعینؒ نے قائم فرمایا ہے۔ اس لیے ہمارے ذمہ واجب ہے کہ محرابہائے قائمہ میں اُنھیں کا اتباع کریں ہاں اگر کسی جگہ ایسی محرابین موجود نہ ہوں اوس وقت جو اس کے اہل ہوں اون سے دریافت کیا جائے۔

عباراتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ بلاد بعیدہ میں سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہوں ان کا اتباع کیا جائے۔ کیونکہ اکثر بلاد میں تو خود حضراتِ صحابہؓ وتابعین نے مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ اور سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے اور پھر اُنھیں کو دیکھ کر دوسری بستیوں میں مسلمانوں نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔ اس لیے یہ سب مساجد مسلمین سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لیے کافی ووافی ہیں ان میں بلاوجہ شبہات فلسفیہ نکالنا شرعاً محمود نہیں۔ بلکہ مذموم اور موجب تشویش ہے۔ بلکہ بسا اوقات ان تشویشات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہؓ وتابعین اور عامۃ المسلمین پر بدگمانی ہوجاتی ہے کہ ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں۔ حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور ومعروف عالم ابن رجب حنبلی اسی بناء پر سمتِ قبلہ میں آلاتِ رصدیہ اور تدقیقاتِ ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں ولفظہ :-

واما علم التسيير فاذا تعلم منه ما يحتاج اليه للاستهداء ومعرفة القبلة والطرق كان جائزاً عند الجمهور و ما زاد عليه فلا حاجة اليه وهو يشغل عما هو اهم منه وربما ادى التدقيق فيه الى اساءة الظن بمحاريب المسلمين فى امصارهم كما وقع فى ذلك كثير من اهل هذا العلم قديما وحديثا و ذلك يفضى الى اعتقاد خطاء الصحابة والتابعين فى صلوتهم فى كثير من

لیکن علم تسییر[1] سو اوس کو اس قدر حاصل کرنا جمہور کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ اور راستوں کی شناخت ہو سکے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ (یعنی زیادہ سیکھنا) امور ضروریہ سے غافل کر دے گا۔ اور بعض مرتبہ تدقیقات فلکیہ میں پڑنا عامۂ بلاد اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں۔ اون کے متعلق بدگمانی پیدا کر دیتا ہے اس فن میں مشغول ہونے والوں کو ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں اس سے یہ بھی اعتقاد پیدا ہوگا کہ بہت سے شہروں میں صحابہؓ و تابعین کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں۔ اور یہ بالکل لغو و باطل ہے۔ امام احمدؒ نے (ستارہ) جدی (جس کو ہمارے بلاد میں قطب کہتے ہیں) سمتِ قبلہ میں اس سے بھی استدلال کرنے کو منع کیا اور فرمایا

[1] علم تسییر فن نجوم کے ایک خاص عمل سے متعلق ہے جس کی توضیح قاضی محمد اعلیٰ صاحب تھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون میں اس طرح کی ہے اعلم انہم یحرکون دلائل الطالع من درجة الطالع والعاشر وغيرها اى يعتبرون حركتها فى السنة الشمسية بمقدار درجة واحدة من المعدل ويسمون هذا العمل تسييرا واذا بلغ التسيير كد كوكب ما من الخمسة المتحيرة يسمى موضعه بدرجة القسمة (ص ۲۸۵ ج ۱) (یہ عبارت چونکہ فن نجوم کے مخصوص عمل سے متعلق ہے۔ ترجمہ ہونے کے بعد بھی عوام نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے ترجمہ نہیں کیا گیا۔)

الامصار وھو باطل وقد انکر الامام احمد الاستدلال بالجدی وقال انما ورد ما بین المشرق والمغرب قبلة۔ (ص۱۲)	کہ حدیث شریف میں الرف، ما بین المشرق والمغرب قبلۃ آیا ہے یعنی مشرق و مغرب کی درمیانی پوری جہت قبلہ ہے

اور جن جنگلات یا نو آبادیات وغیرہ میں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سنت صحابہؓ وتابعین سے ثابت ہے یہ ہے کہ شمس وقمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمتِ قبلہ متعین کر لی جاوے اگر اس میں معمولی میلان وانحراف بھی رہے تو اوس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ حسب تصریح صاحب بدائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے اور اسی پر احکام دائر ہیں۔ جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروج ریح کا قرار دے کر اسی پر نقض وضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا قرار دے کہ مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں حقیقۃً مشقت ہو یا نہ ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات وعلامات کے ذریعہ جو سمت قبلہ تحری واندازہ سے قائم کی جائے گی، وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کی ہو گی۔

علامہ بحر العلوم نے رسائل الارکان میں اسی مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:۔

والشرط وقوع المسامتة على حسب ما يرى المصلي ونحن غير مامورين بالمسامتة على ما يحكم به الآلات الرصدية ولهذا افتوا ان الانحراف المفسد ان يتجاوز المشارق المغارب	اور استقبال قبلہ میں شرط و ضروری صرف یہ ہے کہ نمازی کی رائے اور اندازہ کے موافق کعبہ کے ساتھ مسامتت (محاذات) واقع ہو جاوے اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ مسامتت و محاذات کا پیدا کریں۔ جو آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے اسی لیے تمام علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ انحراف مفسد صلوٰۃ وہ ہے

(رسائل الارکان ص۱۵۳) جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جاوے۔

(رسائل الارکان ص۱۵۵)

اور بلادِ ہندوستان میں سہل[1] اور احوط طریق سمتِ قبلہ معلوم ہونے کا یہ ہے کہ موسم گرما کے سب سے بڑے دن (یعنی ۲۲ جون) اور اسی طرح موسم سرما کے سب سے چھوٹے دن (یعنی ۲۲ دسمبر) میں غروبِ شمس کا موقع دیکھا جاوے۔ قبلہ ان دونوں موقعوں کے درمیان ہوگا۔ یعنی ان دونوں موقعوں کے درمیان درمیان جس نقطہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاوے گی صحیح ہو جاوے گی۔ افادہ سیدی حکیم الامۃ التھانوی متعنا اللہ تعالیٰ ببرکاتہ نقلا عن رسالۃ بغیۃ الاریب وھو الذی صرح بہ الشامی فی مواضع وذکرہ فی البحر وغیرہ۔ سیدی حکیم الامۃ التھانوی نے (ہم کو اللہ تعالیٰ آپ کے برکات سے نفع پہونچائے) اس کو بغیۃ الاریب سے نقل کر کے ارشاد فرمایا ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کی علامہ شامی نے چند مواضع میں تصریح فرمائی ہے اور بحر وغیرہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہاں تک تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ سمتِ قبلہ میں آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ سے کام لینا سلف کا طریقہ نہیں تھا۔ اور نہ شریعت نے اس کا امر کیا ہے۔ اور نہ کسی حال میں اس کی ضرورت ہے بلکہ طریقۂ معروفہ سلف کا یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہوں ان کا اتباع کیا جاوے۔ جہاں نہ ہوں وہاں مشہور و معروف ستاروں اور دوسرے آثار جلیہ سے کام لے کر اندازہ قائم کر کے جہت متعین کر لی جاوے۔ بڑی وجہ ان آلات و حسابات کے استعمال نہ

---

[1] رسائل الارکان کی مذکورہ عبارت سے نیز فتاویٰ خیریہ کی عبارت سابقہ سے ہر دو جانب سے ۴۵، ۴۵ درجہ تک انحراف کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اور بین المغربین کے قول پر صرف ۲۴، ۲۴ درجہ تک انحراف ہر دو جانب میں جائز معلوم ہوتا ہے۔ قول اول اوسع اور ثانی احوط ہے کما فی حاشیۃ البحر للشامی بعد نقل القولین وھذا استحباب والاول للجواز حاشیہ بحر ص۲۹۵ ۱۲۔ محمد شفیع عفا عنہ۔

کرنے کی تو یہی ہے کہ یہ چیزیں اتنی عام نہیں ہیں کہ ہر شخص کو ہر جگہ میسر آسکیں دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ درجہ ان آلات وحسابات کا بھی تخمینہ وتحری . اور اندازہ اور اٹکل سے زائد نہیں. جس طرح تحری واندازہ میں خطا ہو سکتی ہے. ان آلات وحسابات میں بھی خطا ہو جانا ممکن بلکہ واقع ہے. جیساکہ خود واقعۂ مندرجۂ سوال میں دو ماہرین ہیئت کے اتنے عظیم اختلاف سے ظاہر ہے کہ ایک دس درجہ مائل بجنوب قرار دیتے ہیں اور دوسرے کچھ دقیقہ مائل بشمال بتلاتے ہیں۔
اور ان دونوں حضرات کا یہ اختلاف بھی کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ اون سے پہلے ارباب تصنیف میں بھی اس قسم کے اختلافات واقع ہوئے ہیں. میرے سامنے اس وقت دو رسالہ اس موضوع کے موجود ہیں. ایک رسالہ قلمی جناب بشیرالدین صاحب کاکوروی کا ہے. جس کا ماخذ ایک قدیم مہندس کا رسالہ ہے ، جو عہد شاہجہان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کی سمت قبلہ کو نقطہ مغرب سے سات درجہ گیارہ دقیقہ مائل بجنوب قرار دیا ہے اور دوسرا رسالہ ضوابط سمت ہے۔ اس میں لکھنؤ کی سمتِ قبلہ کو نقطۂ مغرب سے ۹ درجہ ۲۵ دقیقہ مائل بشمال بتلایا ہے.
اور دونوں قواعد ریاضیہ سے استدلال کر رہے ہیں. الغرض جبکہ حساباتِ ریاضیہ اور آلاتِ رصدیہ کا انجام وہی غلبۂ ظن بامارات وعلامات ہے اور احتمال خطاو صواب اوس میں بھی یکساں تو سادہ وسہل طریقۂ سلف کو کیوں چھوڑا جائے۔
اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ سے اگر اس میں کام لے لیا جاوے تو جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور جو جہت ان حسابات کے ذریعہ متعین کی جاوے وہ شرعاً معتبر ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق فیصلہ علامہ شامی کا یہ ہے کہ جس جگہ مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں. وہاں تو باتفاق علماء ان آلات وحسابات سے کام لینا جائز ہے. بلکہ جس شخص کو یہ فن آتا ہو، اس کے لیے ایسے مواقع میں جہاں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں، ضروری ہے کہ بجائے دوسری علامات ونشانات کے ان آلات وحسابات سے کام لے کیونکہ محض تحری وتخمینہ سے

زیادہ مفید ظن غالب ہیں۔ اور جس جگہ مساجد قدیمہ موجود ہوں وہاں آلات وحسابات کے ذریعہ سمتِ قبلہ نکالنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض جائز قرار دیتے ہیں۔ بعض ناجائز۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا قول عدم جواز کا اسی تحریر میں گزر چکا ہے۔

افاد فی النھر ان دلائل النجوم معتبرة عند قوم وعند آخرین لیست معتبرة قال وعلیه اطلاق عامة المتون اھ۔ اقول لم ار فی المتون ما یدل علی عدم اعتبارها ولنا تعلم ما نهتدی به علی القبلة من النجوم وقال تعالیٰ والنجوم لتهتدوا بها علی ان محاریب الدنیا کلها نصبت بالتحری حتی منیٰ کما نقله فی البحر ولا یخفی ان اقوی الادلة النجوم والظاهر ان الخلاف فی عدم اعتبارها انما هو عند وجود المحاریب القدیمة اذ لا یجوز التحری معها کما

نہرالفائق (نام کتاب) میں بیان کیا ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک دلائل نجوم معتبر ہیں۔ اور دوسروں کے نزدیک معتبر نہیں۔ اسی (عدم اعتبار) پر عام متون ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے متون میں ایسی کوئی عبارت نہیں دیکھی جس سے دلائل نجوم کے عدم اعتبار پر دلالت ہو۔ ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم نجوم سے وہ چیزیں حاصل کریں جن سے قبلہ کی رہنمائی ہو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ستاروں کو پیدا کیا تاکہ اون کے ذریعہ سے ہدایت پاؤ۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ جس قدر دنیا کی محرابیں ہیں۔ یہاں تک کہ منی کی بھی، وہ سب بذریعہ اجتہاد وتحری رکھی گئی ہیں۔ جیساکہ بحرالرائق میں نقل کیا ہے۔ یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اجتہاد وتحری کے لیے امارات وعلامات دالہ میں سب سے زیادہ قوی اور ظاہر وہ ستارے ہیں جن سے سمتوں پر استدلال کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ علامات اور نجوم سے استدلال میں خلاف اس

قدمناه لئلا يلزم تخطئة السلف الصالح وجماهير المسلمين بخلاف ما اذا كان فى المفازة فينبغى وجوب اعتبار النجوم ونحوها فى المفازة لتصريح علمائنا وغيرهم لكونها علامة معتبرة فينبغى الاعتماد فى اوقات الصلوة وفى القبلة على ما ذكره العلماء الثقات فى كتب المواقيت وعلى ما وضعوه لها من الآلات كالزيج والاصطرلاب فانها ان لم تفد اليقين تفيد غلبة الظن للعالم بها وغلبة الظن كافٍ فى ذلك (شامى ص ۳۱۹ ج ۱ طبع ہند)

وفى الفتاوى الخيرية بعد قوله ولا يجوز العمل بقول الفلكى المذكور والحاصل ان المسئلة خلافية فمذهب الحنفية يعمل بالمحاريب المذكورة

صورت میں ہے جبکہ محاریب قدیمہ موجود ہوں کیونکہ اون کے ہوتے ہوئے تحری و تخمینہ لگانے کی اجازت نہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے تاکہ اس سے سلف صالحین و جمہور مسلمین کا تخطیہ لازم نہ آئے۔ بخلاف جنگل و میدان کے کہ اوس میں نجوم وغیرہ کا اعتبار حسب تصریح علمائے حنفیہ وغیر حنفیہ واجب ہے لہذا ایسے مواقع میں جہاں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں اوقات صلوۃ و قبلہ میں اوس تحقیق پر اعتماد کرنا چاہیے جو کتب مواقیت میں قابل اعتماد علماء نے ذکر کی ہے نیز ایسے جنگلات وغیرہ میں اون قواعد پر بھی اعتماد چاہیے جو علماء نے زیج و اصطرلاب وغیرہ آلات رصدیہ کے وضع و مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ یقین کا فائدہ نہ دے سکیں تو اُس فن کے جاننے والے کے لیے غلبۂ ظن کو تو ضرور مفید ہوں گے۔ اور اس میں غلبۂ ظن کافی ہے۔

(شامی ص ۲۹۹ ج ۱ طبع ہند)

فتاوی خیریہ میں اس قول کے بعد کہ فلکی مذکور کے قول پر عمل جائز نہیں (یہ بیان کیا ہے)، خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ محاریب مذکور پر عمل کیا جائے گا۔ فلکی مذکور کا کوئی اعتبار نہ ہوگا

ولا يلتفت للطعن المذكور ومذهب الشافعية يلتفت اليه ويعمل به اذا كان من عالم بصير ثقة ولا خفاء ان مذهبنا سمح سهل حنيفي ميسر غير معسر فان الطاعة بحسب الطاقة وفي تعيين عين الكعبة حرج وهو مرفوع عنا بالنص الشريف (ج ۱۔ ص)

اور شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر وہ کسی عالم ماہر ثقہ کی طرف سے ہو تو اوس کی طرف التفات اور اس کے قول پر عمل کیا جائے اور اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا (حنفیہ کا) مذہب نرم وسہل وصاف ہے جس میں کچھ دشواری نہیں کیونکہ طاعت بقدر طاقت ہے۔ اور عین قبلہ کی تعیین میں تنگی ہے۔ جو کہ بتصریح شارع علیہ السلام ہم سے دور کیا گیا۔

(ج ۱۔ ص)

هذا آخر ما اردت جمعه في هذه العجالة لعل الله تعالى ينفع بها المسلمين ويجنبهم عن طرق التعمق والتكلف في امور الدين والله سبحانه وتعالى اعلم بالصواب واليه المرجع في كل باب۔

كتبه الاحقر محمد شفيع عفا الله عنه۔ في ثمان ساعات من ثالث ربيع الثاني سنہ ۶۰ھ
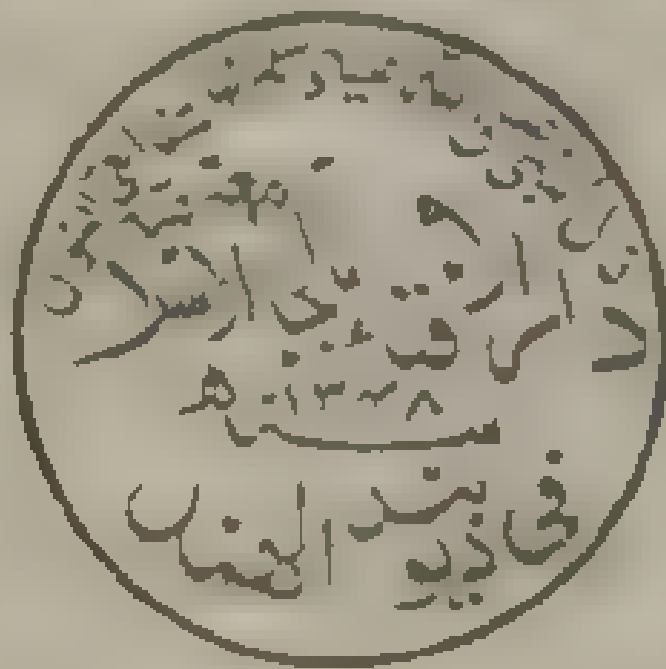
بعد الحمد والصلوٰۃ میں نے اس فتوے کو دیکھا مسئلہ زیر بحث میں کافی ووافی پایا۔ جس سے میں حرفاً حرفاً متفق ہوں اور سہولت تعبیر کے لیے اس کو تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال سے ملقب کرتا ہوں۔

کتبہ اشرف علی عفی عنہ۔ ۴ ربیع الثانی سنہ ۶۰ھ

الجواب صواب

احقر محمد طیب غفرلہ مہتمم دار العلوم دیوبند۔

الجواب حق۔

محمد حسن مدرس مدرسہ نعمانیہ امرتسر

ملخص تحریر جناب حافظ مولانا مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی زید مجدہم پروفیسر (عربی) ڈھاکہ یونیورسٹی (بنگال)

بعد الحمد والصلوٰۃ آوارہ ناکارہ ظفر احمد عفا اللہ عنہ عرض کرتا ہے کہ اس ناچیز نے رسالہ تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال مولفہ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی دام فیضہ کا مطالعہ کیا۔ میں اس تحقیق سے لفظ بلفظ متفق ہوں۔ اللہ تعالیٰ مؤلف فاضل کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کے فیض ظاہری و باطنی کو تام و تمام بنائیں۔ آمین۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

حررہ الاحقر الافقر۔ ظفر احمد عفا عنہ تھانوی۔ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ۔

تصدیق فتویٰ مذکور از جناب مولانا خیر محمد صاحب زید مجدہم مہتمم مفتی مدرسہ خیر المدارس جالندھر شہر

۷۹۶

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ احقر بعنایت سراپا اخلاص و محبت حضرت مصنف صاحب مدامی زید مجدہم مجموعہ رسالہ تحقیق سمت قبلۃ البلاد، بسمی زینت جہانگیر آباد کے مطالعہ سے مشرف ہوا جس میں کہ حضرت والا مدت برکاتہم نے مسئلہ سمت قبلہ کو ایسی تحقیقات و تدقیقات سے مدلل فرما دیا ہے کہ اس کا کوئی شرعی پہلو تشنۂ تحقیق مزید نہیں رہا۔ حق تعالیٰ حضرات مصنفین کے فیضان کو ہمیشہ جاری رکھتے ہوئے عامۂ مسلمین کو استفادہ و استفاضہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ ورحضرات

محرکین و ساعین کو جزائے دارین سے مالامال کریں۔

خادم الطلبہ

خیر محمد عفی عنہ جالندھری المفتی مدرسہ خیر المدارس جالندھر شہر ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ

ملخص تحریر جناب الحاج مولانا مولوی محمد یوسف صاحب بنوری زید مجدہم مدرس مدرسہ ڈابھیل سورت، مؤلف کتاب بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ اما بعد استفتائے سمت قبلہ جہانگیر آباد اور اس کے جوابات سے محظوظ و مستفید ہوا۔ اصل مسئلہ بہت صاف اور منقح ہے، زیادہ تفصیل کی اب کوئی حاجت نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

محمد یوسف البنوری عفا اللہ عنہ

از

ڈابھیل (ضلع سورت) ۱۴ جمادی الاولی ۱۳۶۰ھ

ضمیمہ رسالہ
تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال

ایک مفید اور مزید توضیح حضرت مؤلف کی لکھی ہوئی جس کا عنوان ہے

سمتِ قبلہ اور استقبالِ قبلہ
میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

(یہ رسالہ مرقومہ بالا کے صفحہ ۲۹ سطر ۱۴ کے بعد سے متعلق ہے جو مجھے اصل رسالہ کے وصول ہونے کے بہت بعد حاصل ہوئی۔ وصّل)

(۱) اس پر اتفاق ہے کہ مسجد بیت اللہ کے بعد سب سے پہلی مسجد جو اسلام میں بنائی گئی وہ مسجد قبا ہے (قبا مدینہ طیبہ سے چند میل کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام کا نام ہے) اس مسجد کی بنیاد تو اس وقت پڑی تھی جبکہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ پھر جب تحویل قبلہ کی آیت نازل ہوئی تو اس کی خبر لے کر ایک روز قبا میں ایک صحابی ایسے وقت پہونچے کہ اس مسجد میں نماز ہو رہی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی امام اور پوری جماعت بیت اللہ کی سمت پھر گئی۔ یہ واقعہ عام کتب تفسیر و حدیث میں منقول ہے اور اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے ان لوگوں کے اس فعل کی تصویب فرمائی۔

ظاہر ہے کہ حالت نماز میں جو سمت قبلہ اہل قبا نے اختیار کی، نہ اُس میں آلات رصدیہ اور اسطرلاب کا دخل ہو سکتا ہے نہ کسی قطب نما اور ستارہ کا، محض تخمینہ و تحری سے سمت قائم کی گئی۔ پھر نماز کے بعد بھی کہیں منقول نہیں کہ اس تحری و تخمینہ کے سوا کوئی دوسرا انتظام و اہتمام یا حسابات ریاضیہ کا استعمال استخراج سمت قبلہ کے لیے کیا گیا ہو۔

(۲) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں تمام اسلامی قلمرو میں ہر صوبہ کے عامل کے نام فرمان بھیجے کہ ہر محلہ میں مسجد بنائی جاوے۔ عمال حکومت نے حکم کی تعمیل کی۔ مگر سمت قبلہ قائم کرنے کے لیے نہ تو حضرت فاروقؓ ہی نے کوئی انتظام آلات رصدیہ اور حسابات ریاضیہ کا کیا اور نہ عمال حکومت نے بلکہ تخمینہ و تحری سے سمت قبلہ متعین کر کے مسجدیں تعمیر کی گئیں۔

(۳) آلات و حسابات سے نکالی ہوئی سمت قبلہ میں بھی اکثر اہل فن کا اختلاف رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ طول بلد اور عرض بلد کے معلوم کرنے میں ذرا سا فرق رہ گیا تو سمت کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔

لطیفۂ عجیبہ۔ علماء کا اتفاق ہے کہ دنیا کی تمام مساجد تحری و تخمینہ سے قائم کی گئی ہیں۔ لیکن مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ بطور وحی و مکاشفہ قائم کی گئی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیت اللہ کو بطور معجزہ سامنے کر دیا تھا۔ اوس کو دیکھ کر آپ نے مسجد مدینہ کی سمت قبلہ قائم فرمائی (کذا فی البحر الرائق و رد المحتار) اس لیے باجماع امت مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ بالکل یقینی ہے۔ لیکن حسابات ریاضیہ سے جانچا گیا تو وہ بھی صحیح نہیں اتری۔ چنانچہ امیر مصر ابن طولون نے جب مصر میں اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند ماہرین ہندسہ کو مدینہ طیبہ بھیج کر پہلے مسجد نبویؐ کی سمت قبلہ کو آلات رصدیہ کے ذریعہ جانچا تو معلوم ہوا کہ آلات کے ذریعہ نکالے ہوئے خط سمت قبلہ سے مسجد نبویؐ کی سمت دس درجہ مائل بجنوب ہے۔ جیسا کہ مقریزی نے کتاب الخطط میں بالفاظ ذیل

ذکر کیا ہے:۔

ان احمد بن طولون لما عزم بناء هذا المسجد بعث الی محراب مدینة رسول الله صلی الله علیه وسلم من اخذ سمته فاذا هو مائل عن خط سمت القبلة المستخرج بالصناعة نحو عشر درج الی جهة الجنوب (خطط ج۲ ص۲۵۶)	احمد بن طولون نے جب اپنی جامع مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو چند اہل فن کو مدینہ طیبہ بھیج کر مسجد نبوی کی سمت قبلہ بذریعہ آلات رصدیہ نکالی دیکھا تو وہ حسابات کے ذریعہ نکالے ہوئے سمت قبلہ سے دس درجہ مائل بجنوب ہے (خطط ج۲ ص۲۵۶)

اب وہ لوگ جو آلات رصدیہ پر سمت قبلہ کا مدار رکھنا چاہتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں وہ دیکھیں کہ اُن کی تجویز پر تو مسجد نبوی کی سمت قبلہ بھی درست نہیں ہوتی معلوم نہیں کہ عنایت اللہ مشرقی جو ہندوستانی مسجدوں میں انھیں حسابات کی بنا پر نماز ناجائز قرار دیتے ہیں وہ مسجد نبوی کے متعلق کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے مشرقی کچھ کہیں، مذکور الصدر تعامل مسلمانوں کے اطمینان کے لیے انشاء اللہ کافی و وافی ہے۔ والحمد للہ اولہ وآخرہ۔

بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ۔

مشرقی اور سمتِ قبلہ

از
(مولانا محمد ظفر الدین صاحب قادری رضوی استاد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ)

علمی حلقہ میں جناب عنایت اللہ صاحب مشرقی کا تعارف سب سے پہلے ان کی تصنیف "تذکرہ" کے ذریعہ سے ہوا تھا، اب اُن کی تحریک خاکساریت نے ان کی شہرت عام کر دی ہے۔ وہ یورپ کی درجنوں ڈگریوں کے مالک اور مختلف فنون میں علم و کمال کے مدعی ہیں۔ اسے دیکھ کر یہ خیال تھا کہ مذہب کے متعلق ان کے معلومات و خیالات کیسے ہی ناقص و غلط ہوں۔ لیکن جدید علوم سے ضرور ان کو واقفیت ہوگی، لیکن ان کے بعض علمی مضامین کو دیکھ کر یہ حسن ظن بھی غلط ثابت ہوا۔ عرصہ ہوا انھوں نے علم ہیئت کی رُو سے ہندوستان کی مسجدوں کی سمتِ قبلہ کے غلط ہونے پر ایک مضمون لکھا تھا، اس کے علاوہ وہ "مولویوں کی جہالت" کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً جن عالمانہ خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید علوم میں بھی ان کا پایہ مذہبی علوم سے کم نہیں ہے۔ اس مضمون میں ریاضی و ہیئت اور تاریخِ علوم میں ان کے علمی کمالات پر تبصرہ مقصود ہے۔ مولویوں کی جہالت کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں:۔

"آپ کی بلا جانتی ہے کہ مکہ کا رخ دریافت کرنا کسے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے جغرافیہ کس بیل کا نام ہے، علم نجوم کسے کہتے ہیں، دور بین کیا ہوتی ہے خط سرطان کس مرض کو کہتے ہیں۔ آپ صرف اپنی رات کی باسی روٹیاں گن کر بچنا نہیں جانتے اور اگر روٹیاں زیادہ ہوں اور آنے پورے نہ بیٹھیں تو حساب میں گھنٹوں غلطی نہیں کرتے، بلکہ آفوں کو ان

رصدیوں پر بٹھالیتے ہیں. آپ کو اس کا پتہ ہے کہ مغرب اور شمال کے
دو طرفوں کے درمیان خود مسلمانوں ہی نے ۹۰ درجہ قائم کیے تھے.
ہر درجہ کو ساٹھ دقیقہ (منٹ)، اور دقیقہ کو ساٹھ ثانیوں (سیکنڈ)
میں تقسیم کیا تھا۔"

مشرقی صاحب کی ریاضی سے ناواقفیت کا نمونہ

مشرقی صاحب کو اس دعوائے ہمہ دانی کے باوجود یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمانوں سے بہت پہلے یونانیوں نے اس فن کو مرتب کیا تھا۔ بطلیموس کی کتاب "مجسطی" اس فن میں معروف و مشہور ہے۔ اس بارہ میں آپ بھی اور ملاؤں کے نقشِ قدم پر نکلے، مغرب اور شمال کے دو طرفوں کے درمیان تخصیص بھی عجیب ہے، کیا مغرب اور جنوب کے دو طرفوں کے درمیان ۹۰ سے کم یا زیادہ درجے قائم کیے تھے. یا اس کے درجوں کو ساٹھ دقیقوں سے کم و بیش پر تقسیم کیا تھا اور پھر ان دقیقوں کی ساٹھ ثانیہ (سیکنڈوں) سے کم و بیش پر قسمت کی تھی علیٰ ہذا القیاس نقطۂ شمال و مشرق کے دو طرفوں اور نقطۂ مشرق و جنوب کے دو طرفوں کو کے درجوں اور ان درجوں کو کتنے دقیقہ و ثانیہ پر تقسیم کیا. جب اس فن میں ہر دائرہ ۳۶۰ درجہ پر منقسم ہے تو ہر ربع ۹۰ درجہ کا ہوا. خواہ وہ نقطۂ مغرب و شمال کے درمیان ہو یا نقطۂ شمال و مشرق کے درمیان نقطۂ مشرق و جنوب کے درمیان ہو یا نقطۂ جنوب و مغرب کے درمیان کسی دو نقطوں کے درمیان جس کا فصلِ ربع دور ہو لامحالہ ۹۰ درجہ ہوگا۔ اور ہر درجہ ۶۰ دقیقہ اور ہر دقیقہ ۶۰ ثانیہ اور ہر ثانیہ ۶۰ ثالثہ اور ہر ثالثہ ۶۰ رابعہ اور ہر رابعہ ۶۰ خامسہ اور ہر خامسہ ۶۰ سادسہ اور ہر سادسہ ۶۰ سابعہ اور ہر سابعہ ۶۰ ثامنہ اور ہر ثامنہ ۶۰ تاسعہ اور ہر تاسعہ ۶۰ عاشرہ پر منقسم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تخصیص بالکل غلط اور بے معنی ہے۔

ایک اور نادر تحقیق :۔ مشرقی صاحب فرماتے ہیں :۔

"مغرب اور شمال کی دو سمتوں میں تین لاکھ چوبیس ہزار مختلف طرزیں مسلمانوں

نے خود اسی قرآن کی تعلیم کو صحیح سمجھ کر قائم کی تھیں:

کیا فن کا حساب ثانیہ ہی تک محدود ہے جو تین لاکھ چوبیس ہزار سمتیں ہوں گی. اس کا حساب تو دقیقت عاشرہ سے بھی متجاوز ہے۔ اگر عاشرہ ہی تک مانا جائے جب بھی ہر ربع کی دو سمتوں میں پندرہ سنکھ ستائیس پدم چھبیس نیل چونسٹھ کھرب مختلف سمتیں متعین ہوتی ہیں، ایسی حالت میں ان کو صرف تین لاکھ چوبیس ہزار سمتیں بتانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ میں مشرقی صاحب کی اس خوش اعتقادی کی ضرور تعریف کروں گا کہ قرآن شریف خواہ پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں اور سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر زبان پر دعویٰ قرآن شریف ہی کا ہے۔ ربع دائرہ کو ۹۰ حصہ اور ہر حصہ کو ۶۰ دقیقہ اور ہر دقیقہ کو ۶۰ ثانیہ پر تقسیم کو قرآن شریف کی صحیح تعلیم کا نتیجہ بتانا بھی عجیب دعویٰ ہے۔ کاش مشرقی صاحب نے ان آیتوں کو بھی تحریر فرما دیا ہوتا جن سے مسلمانوں نے یہ حساب قائم کیے کہ اس سے اوروں کو بھی فائدہ پہونچتا۔ آپ کے نزدیک گویا قرآن شریف فقہ و مسائل دینی کی بجائے ہندسہ و ہیئت کی تعلیم کی کتاب ہے۔ اسی لیے فقہی مسائل جو قرآن شریف سے مستنبط ہوتے ہیں وہ ان کے نزدیک مولوی اور ملا کا بتایا ہوا دین ہے اور ہیئت و ہندسہ کے مسائل قرآن کی تعلیم ہیں۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ایک دعویٰ میں چار غلطیاں

آپ نے اپنے ایک دعوے میں چار غلطیاں کیں (۱) شمال مغرب کے دو طرفوں میں ۹۰ درجہ مسلمانوں کا قائم کرنا۔ (۲) مغرب و شمال دو سمتوں کی تخصیص۔ (۳) ان دو سمتوں کے درمیان تین لاکھ چوبیس ہزار سمت بتانا۔ (۴) اس تقسیم کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ظاہر کرنا۔

ایک اور غلطی

پھر کہتے ہیں:۔

”اسی مغرب اور شمال کی سمتوں کے درمیان صرف ایک درجہ $\frac{1}{4}$ حصہ پھر جانے سے دو ہزار تین سو میل کی دوری پر پورے چالیس میل کا فرق پڑ

جاتا ہے۔"

یہاں بھی مغرب وشمال کی تخصیص بے معنی ہے، جن لوگوں کا سمتِ قبلہ منحرف بجنوب ہے، ان میں جو لوگ مکہ معظمہ سے دو ہزار تین سو میل کی دوری پر ہیں۔ وہ اگر ایک درجہ صحیح سمت سے پھر جائیں تو کیا ان لوگوں کو چالیس میل کا فرق نہ پڑے گا۔ اسی طرح جو لوگ مکہ معظمہ سے پچھم ہیں اور ان کا سمتِ قبلہ نقطۂ مشرق سے منحرف بہ شمال یا جنوب ہے وہ اگر دو ہزار تین سو میل کی دوری پر ہوں اور سمتِ قبلہ سے ایک درجہ پھر جائیں تو ان لوگوں کو بھی صحیح سمت سے چالیس میل کا فرق ہوگا یا نہیں؟ اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے، اور اگر ہوگا تو یہ تخصیص غلط ہے اور بے معنی ہوئی۔ پھر مکہ معظمہ سے لاہور کا فصل دو ہزار تین سو میل بتانا بھی صحیح نہیں اس لیے کہ فصل طول تسـ فو ہے۔ اگر بالفرض اسے صحیح مان لیا جائے جب بھی ایک درجہ پر چالیس میل کا فرق بتانا غلط ہے، ورنہ ۶۰ درجہ کے زاویہ پر جہاں مثلث متساوی الاضلاع ہوتا ہے اور شکل ترسی نمودار ہوتی ہے (جس جگہ کرہ عالم پر کھڑے ہونے والے دو متساوی القد انسانوں کے سروں کا فاصلہ قدموں کے فاصلہ سے بقدر ایک قامت زائد ہوتا ہے۔ جیساکہ اس شکل سے ظاہر ہے) وتر اسی قدر ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس حساب سے وتر دو ہزار چار سو میل ہوتا ہے۔

مکہ سے سورت کی سمت کی تعیین میں غلطی فرماتے ہیں:۔

"مکہ معظمہ سے سورت جہاں عرب پہلی صدی میں سب سے پہلے اترے تھے، ٹھیک مشرق کی طرف تھا۔"

یہ بھی محض رجماً بالغیب اور بالکل غلط، مکہ معظمہ کا کام ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ ہے اور سورت کا عرض کا کیب ۲۱ درجہ ۱۲ دقیقہ ہے الخ ۲۸ دقیقہ کا فرق ہے اور مکہ معظمہ کا طول م لح یعنی ۴۰ درجہ ۱۳ دقیقہ اور سورت کا عب ہ یعنی ۷۲ درجہ ۵ دقیقہ ہے۔ مابین الطولین لـ نـب اس حساب سے دونوں شہروں میں شرقی غربی فرق دو ہزار

ایک سو ستاسی میل ہوا۔ اتنی دوری پر ۲۹ دقیقہ یعنی تقریباً نصف درجہ فرق ہونے سے مشرقی صاحب ہی کے حساب سے سمت قبلہ میں ۱۹ میل کا فرق ہو جائے گا۔ پھر ٹھیک مشرق کہاں ہوا کہ سمت قبلہ ان کے خیال کے مطابق ٹھیک نقطۂ مغرب ہو۔

تاریخی غلطی | مشرقی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"عرب جیسی جاہل اور اُجڈ قوم چند برسوں کے اندر اندر دو ہزار میل دور مقام کی صحیح سمت دریافت کر سکی۔ حالانکہ اوس وقت جغرافیہ کا نام و نشان موجود نہ تھا۔ اور نہ سطح زمین پر طول بلد و عرض بلد کے خطوط کوئی متنفس جانتا تھا"

بے خبری بھی کیا چیز ہے۔ اس کے طفیل میں انسان جو جی میں آئے کہہ دے کوئی ذمہ داری نہیں۔ پڑھا لکھا آدمی ایسی بات لکھنی درکنار اسے بولتے۔ بلکہ تصور کرتے شرمائے گا۔

علم جغرافیہ کب وجود میں آیا؟ موجد کون ہے؟ طول بلد، عرض بلد کے خطوط اسلام سے کتنے پہلے کھینچے گئے؟ ان کے لیے کشف الظنون اور دائرۃ المعارف دیکھیے صاحب کشف الظنون علم جغرافیہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

ھو علم یعرف منہ احوال الاقالیم السبعۃ الواقعۃ فی الربع المسکون من کرۃ الارض وعرض البلدان الواقعۃ فیھا واطوالھا وعدد مدنھا وجبالھا وبراریھا وبحورھا وانھارھا الی ذلک من احوال الربع۔ واول من صنف فیہ بطلیموس القلوذی	علم جغرافیہ وہ علم ہے۔ جس کے ذریعہ کرۂ ارض کے ربع مسکون کی ساتوں اقلیموں کے حالات اور ان کی آبادیوں کے عرض البلد اور طول البلد ان کے شہروں، ان کے پہاڑوں، ان کی خشکی، ان کے دریاؤں ان کی نہروں وغیرہ ربع مسکون کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس فن میں سب سے پہلے بطلیموس قلوزی نے تصنیف کی لبسطی کے

فانہ صنف کتابہ المعروف بجغرافیا ایضا بعد ما صنف المجسطی۔	بعد اس نے اس فن پر ایک کتاب لکھی. جو جغرافیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فن جغرافیہ پر جس میں طول وعرض بلد وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے. سب سے پہلے بطلیموس نے کتاب لکھی جس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی ہے۔ دائرۃ المعارف میں ہے:۔

بطلیموس کلودیوس ریاضی فلکی جغرافی یونانی مصری یقال انہ ولد فی بیلوسوم ونشأ فی الاسکندریۃ فی قرن الثانی المیلاد۔	بطلیموس کلودیوس. عالم ریاضی فلکی جغرافی یونانی مصری دوسری صدی عیسوی میں بیلوسوم میں پیدا ہوا۔ اور اسکندریہ میں نشوونما حاصل کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا. جبکہ مشرقی صاحب کے خیال کے مطابق جغرافیہ کا نام ونشان نہ تھا اور سطح زمین پر طول بلد عرض بلد کا کوئی جاننے والا نہ تھا۔

رہا عربوں کا صحیح سمت دریافت کر لینا، اگر درحقیقت سورت کی مسجدیں عربوں کی بنائی ہوئی ہیں یا اسی بنیاد پر ہیں اور بالکل صحیح سمت قبلہ کی طرف ہیں تو محض نور اسلام کی وجہ سے ہے ورنہ اگر ٹھیک نقطۂ مغرب کو ہیں تو ان کے قاعدہ سے ۱۹ میل خانۂ کعبہ سے منحرف ہیں۔

سمتِ قبلہ کی تعیین کا مشہور طریقہ آگے چل کر مشرقی صاحب فرماتے ہیں:۔

> "میں نے ایک شخص کو لاہور کے ملاؤں اور معماروں کے پاس بھیجا کہ وہ مسجد بناتے وقت قبلہ کا رخ کیونکر مقرر کرتے ہیں. ایک بڑی عمر کے جاہل نے کہا۔ واہ جی یہ تو بہت آسان ہے. قطب تارے کی طرف ہاتھ پھیلا کر اور کندھے کی طرف دیکھ کر کھڑے ہو گئے تو ناک کی سیدھ میں قبلہ ہے. خیر میں سمجھ گیا کہ ملا کی نجوم دانی کس قدر بے خطا ہے۔ اور

اس کا مطلب یہی ہے جو آپ کہتے ہیں کہ شمالی ہندوستان کا قبلہ غرب
ہی کی طرف ہے۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ مشرقی صاحب کی ساری پرواز اور ہندوستان کی مسجدوں کے سمت قبلہ سے انحراف کی ساری عمارت ادھنوں نے کسی ملا کے بیان پر قائم کی ہے اور اسے غایت دیانت سے تمام مولویوں کی جہالت کے سر منڈھ دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ اُس ملا یا اُس جاہل معمار کی موٹی بات کو بھی نہ سمجھ سکے۔ اگر وہ اس کے الفاظ پر غور فرماتے تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا کہ ہندوستان کے شہروں کی سمت قبلہ تین طرح کی ہے۔ بعض کا قبلہ ٹھیک نقطۂ مغرب بلا انحراف نقطۂ شمال یا جنوب ہے اور بعض کا منحرف بشمال، اور بعض کا منحرف بجنوب، اور ان سب کی پہچان قطب تارہ ہے۔ جہاں کا قبلہ ٹھیک نقطۂ مغرب ہے۔ وہاں مرکز قطب کو مونڈھے کی ہڈی کے مرکز کے سیدھ میں رکھنا ہوتا ہے اور جس جگہ کا قبلہ منحرف بشمال ہے، وہاں قطب تارے کو مونڈھے کے اگلے حصہ کی طرف کرنا ہوتا ہے اور جہاں کا قبلہ منحرف بجنوب ہو وہاں قطب تارے کو مونڈھے کی پشت پر رکھنا ہوتا ہے مگر جسے اس کا علم ہی نہ ہو اور اس تفصیل سے ناواقف ہو تو وہ لامحالہ اپنی جہالت کا الزام دوسرے کے سر تھوپے گا۔

امام رازی کا طریق تعیین سمت قبلہ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں۔

المسئلة الرابعة فی دلائل القبلة اعلم	چوتھا مسئلہ دلائل قبلہ کے بیان میں ہے۔
ان الدلائل اما ارضية او هوائية	دلائل قبلہ تین قسم کے ہیں۔ ارضی، ہوائی،
او سماوية اما الارضية والهوائية	سماوی۔ ارضی اور ہوائی کا کوئی قاعدہ کلیہ
فهی غیر مضبوطة ضبطا كليا اما	نہیں ہے۔ دی دلیلیں دو قسم کی ہیں۔
السماوية فادلتها منها تقريبية و	تقریبی۔ تحقیقی۔ تقریبی بھی دو طرح کی ہیں۔
منها تحقيقية اما التقريبية فقد	نہاری اور لیلی۔ نہاری تو آفتاب ہے اور
قالوا هذه الادلة اما ان تكون	لیلی یہ ہے کہ سمت قبلہ پر اس کوکب سے

نهارية اوليلية اما النهارية فالشمس واما الليلية فهوان يستدل على القبلة بالكوكب الذى يقال له الجدى فانه كوكب كالثابت لا تظهر حركته من موضعه واما الطريقة اليقينية فهى الوجوه المذكورة فى كتب الهيئة۔ اه۔ مختصراً۔	استدلال کیا جائے جسے جدی الفرقد کہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کوکب اگرچہ حرکت کرتا ہے مگر اتنی کم کہ بمنزلہ ثابت کے ہے۔ اس کی حرکت ظاہر نہیں ہوتی۔ اور تحقیقی دلائل وہ وجوہ ہیں جو ہیئت کی کتابوں میں مذکور ہیں اھ مختصراً۔

نجوم اور ہیئت کیا ایک ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کوکب جدی الفرقد یعنی قطب تارہ سے استدلال صرف لاہور کے بڑی عمر کے جاہل کی جدت نہیں بلکہ اکابر علماء کرام امام فخر الدین رازی جیسے مشہور و مستند عالم دین کی تحقیق ہے۔ بالفرض اگر جاہل ملا کا یہ جواب غلط بھی مان لیا جائے تو اس سے اس کی نجوم دانی سے ناواقفیت کا حکم کس طرح مشرقی صاحب نے لگا دیا۔ کیا ان کے نزدیک علم ہیئت اور نجوم دونوں ایک چیزیں ہیں کہ ایک کی ناواقفیت سے دوسرے کی ناواقفیت لازم آتی ہے۔ حالانکہ اتنا تو ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ علم ہیئت افلاک کی حرکات اور کواکب کے اوضاع و اطوار سے بحث کرتا ہے۔ اور علم نجوم میں ان اوضاع و حرکات کے آثار سے بحث ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی صاحب علم ہیئت و نجوم کے فرق سے بھی واقف نہیں پھر اس غلط جواب سے یہ نتیجہ کہاں سے نکلا کہ شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب ہی کی طرف ہے:

ایک ملا کے نہ جاننے سے تمام شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب کی سمت کس طرح ہو گیا۔ کیا شمالی ہندوستان کی تمام مسجدیں آپ کے بڑی عمر والے جاہل ہی کی رائے اور نقشہ سے بنی ہیں؟

بے بنیاد دعویٰ اس کے بعد آپ کے قیمتی افادات یہ ہیں:۔

"نقشہ کے موٹے خط ا ب سے معلوم ہوگا کہ لاہور کی مسجدوں کا رخ
صحیح رخ سے قریباً ۲۵ درجہ جنوب کی طرف ہٹا ہے۔ ایک درجہ کا
فرق دو ہزار تین سو میل پر میں نے بھی چالیس میل بتایا ہے تو اس
حساب سے ۲۵ درجوں کا فرق ۲۵ × ۴۰ یعنی ایک ہزار میل ٹھہرا۔"

یہ دونوں باتیں بالکل غلط ہیں اگر یہ بیان صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ لاہور کی تمام مسجدیں نقطۂ مغرب کو ہیں حالانکہ نقطۂ مغرب سے منحرف بجنوب ہونا چاہیے، تو لاہور کی مسجدوں کا رخ صحیح رخ سے جتنے درجے بھی ہو شمال کو ہٹا ہوگا، نہ جنوب کو۔ پھر اسے ۲۵ درجہ جنوب کو ہٹا ہوا بتانا بھی غلط ہے۔ لیکن اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بیت المقدس کی سمت میں نہ ہوں گی بلکہ اس شہر کی سمت میں ہوں گی جو لاہور سے جنوب کی طرف واقع ہوگا

ایک ہزار میل کا فرق بتانا بھی غلط اور بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ لاہور کی مسجدوں کا رخ اگر ٹھیک نقطۂ مغرب مان لیا جائے تب بھی مشرقی صاحب کے اصول کے مطابق جو صرف عرض البلد کا اعتبار کرتے ہیں اور اسی بناء پر وہ ہندوستان میں سورت، ناگپور، کٹک وغیرہ کا قبلہ جو ان کے خیال میں عرض البلد مکہ معظمہ پر واقع ہیں نقطۂ مغرب صحیح خیال کرتے ہیں بالکل غلط ہے سمتِ قبلہ جاننے کے لیے صرف عرض البلد کافی نہیں۔ اس کے ساتھ طول البلد کا معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ کہ طول البلد سے عرض موقع معلوم ہوتا ہے۔ جس سے سمتِ اطراف پہچانی جاتی ہے۔ مشرقی صاحب چونکہ صرف عرض البلد کا لحاظ کرتے ہیں اس لیے گزارش ہے کہ لاہور کا عرض البلد لا ل ب یعنی ۳۱ درجہ ۳۰ دقیقہ اور مکہ معظمہ کا کا م یعنی ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ مابین العرضین ط ن ۹ درجہ ۵۰ دقیقہ ہے۔ اس حساب سے ۲۵ درجہ کا فرق بتانا بالکل بے اصل اور غلط ہے کیا ۳۱ سے ۲۱ کی تفریق کرنے سے پچیس ۲۵ بچتے ہیں جب یہ فرق ہی غلط ٹھہرا تو ۴۰ میں ضرب دے کر ہزار میل کا فرق بتانا بھی غلط ہوا۔ صحیح ۳۹۳ میل ہے۔

سب سے بڑی غلطی مشرقی صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے جواب دینے سے قبل لاہور کی مسجدوں کو خود نہیں جانچا۔ صرف مستفتی کے کہنے پر ایمان لے آئے۔ کاش اس شخص کو لاہور کے ملاؤں اور معماروں کے پاس بھیجنے کے بجائے آپ خود اس کی تحقیق کر لیتے تو اتنی ٹھوکریں نہ کھاتے، یا کسی ایسے شخص کو بھیجتے جو یہ معلوم کر سکتا کہ کون کون مسجدیں ٹھیک قبلہ کی سمت ہیں اور کون کون کس قدر اور کس جانب منحرف ہیں تو بھی غلطیوں میں مبتلا نہ ہوتے۔ لیکن یہ ہوتا کیونکر، مشرقی صاحب کو خود ہی نہیں معلوم کہ سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا کیا قاعدہ ہے اور مسجدوں کی صحت اور غلطی معلوم کرنے کا کیا اصول ہے۔

غلط سمتیں | آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں :-

"اس نقشے سے صاف ظاہر ہے کہ تمام ہندوستان میں ماسوا سورت ناگپور، کٹک وغیرہ کے جو اسی عرض البلد پر واقع ہیں جس پر کہ مکہ معظمہ ہے۔ ہندوستان کی تمام نئی مسجدوں کا قبلہ غلط ہے۔ ایک مسجد ایسی نہیں جس کے نمازیوں نے آج تک ایک نماز قبلہ رُو ہو کر پڑھی ہو۔ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس ہے۔ راولپنڈی والوں کا بغداد اور دمشق، پشاور والوں کا بیروت۔ دہلی والوں کا بوشہر، ملتان کا کوفہ، کراچی والوں کا مدینہ، مدراس والوں کا عدن، بمبئی والوں کا بندرگاہ سواکن وغیرہ وغیرہ"

یہ آپ کے معلومات کا نچوڑ ہے جس کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سرے سے سمت قبلہ کے معنی ہی سے ناواقف ہیں۔ اور نہ آپ کو اس کے جاننے کا اصول معلوم ہے۔ آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ نمازی کا منہ نماز میں جس سمت کو ہو جائے وہی سمت قبلہ ہے اسی سے یہ فیصلہ صادر کر دیا۔ کہ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس، راولپنڈی والوں کا بغداد اور دمشق ہے۔ اول دو شہروں کا جو طول و عرض میں مختلف ہیں، ایک قبلہ یعنی بیت المقدس بتانا بالکل غلط

ہے۔ جب دو شہر طول و عرض دونوں میں مختلف ہوں گے تو ان کا قبلہ بھی مختلف ہوگا۔ ایک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس سے بھی بڑھ کر پُرلطف بات راولپنڈی کا قبلہ بغداد اور دمشق بتانا ہے جو طول و عرض دونوں میں مختلف ہیں۔ کوئی ایسے دو شہر جو طول و عرض دونوں میں مختلف ہیں، ایک شہر کا قبلہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ راولپنڈی کا قبلہ آپ نے صرف دو ہی شہروں بغداد اور دمشق ہی کو بتایا ورنہ آپ کے عامیانہ اصول پر تو مغلی کے سامنے جتنے شہر، درخت، مکان، پہاڑ، مندر، گرجا وغیرہ واقع ہوں وہ سب اس کے قبلہ ہیں ورنہ تخصیص بلا مخصص لازم آئے گی۔

سطحی نقشہ سے تعیین سمت کی سطحی غلطی سمت قبلہ میں مشرقی صاحب کی غایت معلومات یہ ہیں کہ:۔

> "نقشہ اصلاح یا اس سے بہتر صحیح نقشہ یعنی اسکولوں کا نکالو، جس شہر کا سمت قبلہ معلوم کرنا چاہتے ہو، اس شہر اور مکہ معظمہ کے درمیان خط کھینچ کر جو سمت معلوم ہو ٹیڑھا یا سیدھا جس طرح کا خط ہو، اسی طرح سات یا کج سمت قبلہ ہے۔"

مشرقی صاحب نے اسے اپنے رسالہ "مولوی کا غلط مذہب نمبر ۹" کے نقشہ میں خط ا ب ج دے کر سمجھایا ہے۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے رسالہ یا اخبار "اصلاح" کا نقشہ تو در کنار بڑے بڑے نقشوں میں سیکڑوں کیا ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں جگہیں دنیا بلکہ ہندوستان کی ایسی ہیں کہ جن کا نام و نشان تک نہیں۔ اس کے لیے ساری دنیا کا نقشہ نہ سہی، ہندوستان کے لیے کم از کم ایشیاء کا نقشہ ضرور ہونا چاہیے۔ جس میں ایک طرف تو وہ شہر ہو جس کی سمت مطلوب ہے، دوسری طرف مکہ معظمہ، اسے تو جغرافیہ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایشیاء کے نقشہ میں ہندوستان کے سب بڑے بڑے شہر بھی نہیں ہوتے۔

سمتوں کی تعیین میں سخت غلطیاں اس کے بعد مشرقی صاحب نے اپنی خیالی بنیاد پر چند شہروں کی سمت قبلہ بتائی ہے۔

اس کی واقعی صحت تو الگ رہی خود ان کے خود ساختہ اصولوں کے مطابق بھی نہیں ہے۔
سورت، ناگپور اور کٹک کا قبلہ نقطۂ مغرب کو صحیح بتانا بھی غلط ہے

سورت کے متعلق اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مشرقی صاحب کے قاعدہ سے ۱۰ میل سمت قبلہ سے فرق ہے۔ ناگپور کا عرض کا ق یعنی ۲۱ درجہ ۵ دقیقہ ہے اور مکہ معظمہ کا عرض کا کم یعنی ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ مابین العرضین لہ یعنی ۳۵ دقیقہ۔ طول ناگپور عط یعنی ۷۹ درجہ ۵ دقیقہ مابین الطولین لب نب یعنی ۳۰ درجہ ۵۲ دقیقہ۔ فصل طول ۲ گھنٹہ ۳۵ منٹ ۳۸ سکنڈ فرق دو ہزار پانچ سو چورانوے میل۔ جب آپ کے حساب سے دو ہزار تین سو میل پر ایک درجہ کے حساب سے پورے ۴۰ میل کا پڑتا ہے۔ تو دو ہزار پانچ سو چورانوے میل ۳۵ دقیقہ پر ۲۰ میل کا فرق ہوگا۔ پھر ٹھیک نقطۂ مغرب کہاں ہوا۔

علیٰ ہذا القیاس کٹک کا عرض ک ل ۲۰ درجہ ۳۰ دقیقہ ہے۔ مابین العرضین ا ی ایک درجہ دس دقیقہ اور کٹک کا طول فو ۸۶ درجہ ایک دقیقہ ہے مابین الطولین مہ نح ۴۵ درجہ ۴۰ دقیقہ ہے۔ فصل طول ۳ گھنٹہ ۳ منٹ فرق مسافت تین ہزار بیالیس میل تو کٹک کا فرق نقطۂ مغرب سے آپ ہی کے حساب سے ۷۰ میل ہوا۔ پھر کٹک کا سمت قبلہ نقطۂ مغرب بتانا کس طرح صحیح ہوگا۔

نیز انہوں نے ہندوستان کے جن جن شہروں کا قبلہ غیر ممالک کے جن جن شہروں کو بتایا ہے وہ بھی قرار واقعہ کے خلاف ہے خود ان کے اصول و قاعدہ کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان شہروں کے عرض میں بھی فرق ہے اور طول کا فرق اس پر مستزاد ہے۔

اگر بالفرض ان شہروں کے مسلمان ٹھیک نقطۂ مغرب کی طرف بھی منہ کرکے نماز پڑھتے ہوں۔ تب بھی سمت قبلہ کی طرف ٹھیک رخ نہ سہی مگر ان شہروں کی طرف بھی جنھیں مشرقی صاحب نے ان شہروں کا قبلہ بتایا ہے، رخ نہ ہوگا۔ وہ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس بتاتے ہیں۔ اولاً لاہور اور امرتسر دونوں ایک خط

پر نہیں ہیں، لاہور کا عرض البلد ۳۱ درجہ ۳۰ دقیقہ ہے اور امرتسر کا ۳۱ درجہ ۳۷ دقیقہ ہے اس حساب سے اگر بیت المقدس لاہور والوں کا قبلہ ہوگا یعنی ان کے نقطۂ مغرب کے ٹھیک جہت میں ہوگا تو امرتسر والوں کا قبلہ نہ ہوگا، اور اگر امرتسر والوں کا قبلہ ہو گا تو لاہور والوں کا نہ ہوگا۔ حالانکہ واقعہ کے لحاظ سے بیت المقدس نہ لاہور والوں کا قبلہ ہے اور نہ امرتسر والوں کا۔ اس لیے کہ بیت المقدس کا عرض لاؔ مؔ ۳۱ درجہ ۴۰ دقیقہ ہے۔ جس سے لاہور سے پورے دس دقیقہ اور امرتسر سے تین دقیقہ کا فرق ہے۔ اور بیت المقدس کا طول لہ یدؔ ۳۵ درجہ ۱۴ دقیقہ ہے اور لاہور کا طول عدؔ کجؔ ۷۴ درجہ ۲۲ دقیقہ، مابین الطولین لٹ طؔ ۳۹ درجہ ۹ دقیقہ، فصل طول دو گھنٹہ ۳۶ منٹ ۳۶ سکنڈ، فرق مسافت دو ہزار چھ سو میل، گویا خود ان کے قاعدہ سے ۱۰ میل کا فرق ہوا۔ پھر لاہور والوں کا قبلہ بیت المقدس کس طرح ہوگا۔

علیٰ ہذا القیاس طول امرتسر عدؔ مح ۷۴ درجہ ۴۸ دقیقہ ہے تو بیت المقدس اور امرتسر کا مابین الطولین لٹ لدؔ ۳۹ درجہ ۳۴ دقیقہ، اور فصل طول دو گھنٹہ ۳۸ منٹ ۱۶ سکنڈ ہوا۔ اور فرق مسافت دو ہزار چھ سو بتیس میل ہوا۔ اس لیے مشرقی صاحب کے قاعدہ سے نقطۂ مغرب سے ۳ میل کا فرق ہوگا۔ پھر امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

اسی طرح راولپنڈی والوں کا قبلہ بھی بغداد نہ ہوگا۔ کیونکہ راولپنڈی کا عرض لہ لزؔ ۳۵ درجہ ۳۷ دقیقہ ہے اور بغداد لجؔ ک ۳۳ درجہ ۲۰ دقیقہ، مابین العرضین ب یز ۲ درجہ ۱۷ دقیقہ اور راولپنڈی کا طول عجؔ و ۷۳ درجہ ۶ دقیقہ ہے۔ اور بغداد کا مد کہؔ ۴۴ درجہ ۲۵ دقیقہ، مابین الطولین کح ما ۲۸ درجہ ۴۱ دقیقہ، فصل طول ایک گھنٹہ ۵۴ منٹ ۴۴ سکنڈ، فرق مسافت ایک ہزار نو سو سترہ میل۔ یہ فرق اگرچہ طول میں اور شہروں کے اعتبار سے کچھ کم ہے پھر بھی تقریباً دو ہزار میل ہے۔ مگر عرض کا فرق ۲ درجہ ۱۷ دقیقہ ہے۔ جب ایک درجہ پر آپ کے حساب سے ۴۰ میل کا فرق پڑ جاتا ہے تو دو درجہ سے زائد پر ۹۱ میل فرق ہوگا۔ پھر راولپنڈی والوں کا قبلہ بغداد کو بتانا

کس قدر غلط ہے اور دمشق اور راولپنڈی کا مابین العرضین ب ز ق ۲۰ درجہ اور ۰ دقیقہ ہے اور مابین الطولین لہ نب ق ۳۶ درجہ ۵۲ دقیقہ ہے۔ فصل طول ۲ گھنٹہ، ۲۱ منٹ ۲۸ سکنڈ اور فرق مسافت ۲ ہزار پانچ سو چودہ میل ہے۔ اس میں بھی ان کے حساب سے ۲۸ میل فرق ہوا، نہ ٹھیک نقطۂ مغرب ہوگا کہ راولپنڈی والوں کا قبلہ دمشق قرار دیا جائے۔

پشاور کا قبلہ بیروت بتانا بھی صحیح نہیں۔ اس لیے کہ پشاور کا عرض البلد لد یہ درجہ دقیقہ ۳۴ درجہ ۳۵ دقیقہ ہے۔ اور بیروت کا لج ند ق ۳۳ درجہ ۵۴ دقیقہ، مابین العرضین کا یعنی ۲۱ دقیقہ، طول پشاور عا ل ق ۷۱ درجہ ۳۰ دقیقہ۔ طول بیروت لہ لا ق ۳۵ درجہ ۳۱ دقیقہ، مابین الطولین لہ نط ق ۳۵ درجہ ۵۹ دقیقہ، فصل طول ۲ گھنٹہ ۲۳ منٹ ۵۶ سکنڈ، فرق مسافت دو ہزار چار سو میل تو ۲۱ درجہ پر ۱۴ میل کا فرق ہوگا۔ اسی طرح دہلی کا قبلہ بوشہر نہیں ہو سکتا۔ دہلی کا عرض البلد کح مب ق ۲۸ درجہ ۴۲ دقیقہ ہے بوشہر کا کط ۲۹ درجہ ۵۰ دقیقہ، مابین العرضین اح ق ایک درجہ آٹھ دقیقہ۔ طول دہلی عز ک ق ۷۷ درجہ ۲۰ دقیقہ۔ طول بوشہر ۵۰ درجہ۔ مابین الطولین کز ک ق ۲۷ درجہ ۲۰ دقیقہ۔ فصل طول ایک گھنٹہ ۴۹ منٹ ۲ سکنڈ، فرق مسافت ایک ہزار چھ سو بیاسی میل۔ پس ۴۵ میل فرق ہوگا۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ ملتان کا قبلہ کوفہ ہے۔ ملتان کا عرض ل ج ۳۰ درجہ ۳ دقیقہ کوفہ کا عرض لب مد ق ۳۲ درجہ ۴۴ دقیقہ ہے۔ مابین العرضین ب ما ۲ درجہ ۴۱ دقیقہ۔ طول ملتان عا ل ق ۷۱ درجہ ۳۰ دقیقہ۔ طول کوفہ کد ۴۴ درجہ۔ مابین الطولین مز ل ق ۴۷ درجہ ۳۰ دقیقہ۔ فصل طول ح ی ۳ گھنٹہ دس منٹ، فرق مسافت تین ہزار ایک سو چھیاسٹھ یعنی مشرقی صاحب کے قاعدہ سے ایک سو باسٹھ میل فرق ہوگا۔ پھر ملتان کا قبلہ کوفہ بتانا کیسے صحیح ہوا۔ کراچی کا قبلہ مدینہ طیبہ بھی عجیب ہے کراچی کا عرض البلد کہ ۲۵ درجہ، مدینۂ منورہ کا عرض کد ک ۲۴ درجہ ۲۰ دقیقہ ہے۔ مابین العرضین م ق ۴۰ دقیقہ۔ طول کراچی سز ق ۶۷ درجہ۔ طول مدینۂ طیبہ م نہ ق ۴۰ درجہ

۵۵ دقیقہ، فصل طول ایک گھنٹہ ۵۴ منٹ ۴۰ سکنڈ، فرق مسافت ۱۷۲۲ میل، تو ۴۰ دقیقہ پر ۲۲ میل کا فرق ہوگا۔

مدراس کا قبلہ عدن بھی نہیں ہوسکتا۔ عرض مدراس یجج تب ۱۳ درجہ ۲ دقیقہ، عرض عدن یب حمہ ۱۲ درجہ ۵۴ دقیقہ، مابین العرضین یز ۱۰ دقیقہ، طول مدراس فہ کب ۸۰ درجہ ۲۲ دقیقہ، طول عدن مہ حج ۴۵ درجہ ۳ دقیقہ، مابین الطولین لہ یط ۳۵ درجہ ۱۹ دقیقہ، فصل طول ۲ گھنٹہ ۲۱ منٹ ۱۶ سکنڈ۔ فرق مسافت ۲۳۳۲ میل یعنی ان ہی کے حساب سے ۱۱ میل کا فرق ہوگا۔ مدراس کا قبلہ عدن تانا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟

بمبئی کا قبلہ بندرگاہ سواکن بتانا اگر مجذوب کی بڑ نہیں تو اور کیا ہے؟ عرض بمبئی یح نہ ۱۸ درجہ ۵۵ دقیقہ ہے۔ عرض سواکن یط ل ۱۹ درجہ ۳۰ دقیقہ، مابین العرضین لہ لہ ۳۵ دقیقہ۔ فصل طول دو گھنٹہ ۲۲ منٹ ۲۰ سکنڈ۔ فرق مسافت ۲۲۷۵ میل تو آپ ہی کے حساب سے ۲۸ میل کا فرق ہوا۔ ایسی صورت میں بمبئی کا قبلہ سواکن بتانا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے:

غرض جہاں جہاں کا قبلہ مشرقی صاحب نے جن جن شہروں کو بتایا ہے۔ کُل کا کُل غلط ہے، نہ واقعہ کے اعتبار سے یہ شہر قبلہ ہیں اور نہ مشرقی صاحب کے قاعدہ کے مطابق۔ سب سے کم فرق امرتسر اور بیت المقدس کے نقطۂ مغرب میں ہے۔ وہ بھی ۳ میل ہے۔ اور سب سے زیادہ ملتان اور کوفہ میں ہے۔ جس میں ایک سو چھیاسٹھ میل کا فرق ہے۔

سمت قبلہ کی تعریف اور اس کے معلوم کرنے کے طریقہ سے ناواقفیت

حقیقت یہ ہے کہ مشرقی صاحب کو نہ سمت قبلہ کی تعریف معلوم ہے۔ نہ وہ اس کے معلوم کرنے کا قاعدہ جانتے ہیں۔ نہ سمت قبلہ کے فقہی مسائل سے واقف ہیں۔ سمت قبلہ کی تعریف علمائے ہیئت کے نزدیک یہ ہے:۔

هي نقطة في الأفق من واجهها واجه الكعبة۔	سمت قبلہ افق میں اس نقطہ کا نام ہے کہ جو اس کے مواجہ میں ہوگا وہ کعبہ کے مواجہ میں ہوگا۔

اسی نقطہ پر دائرۃ الافق اس دائرۃ العظیم سے تقاطع کرتا ہے جو راس البلد، اور راس مکہ معظمہ پر ہوتا ہوا گذرے اور قوس سمتِ قبلہ کی تعریف ہے:۔

واما سمت قوس سمت القبلة فهي قوس من الافق تقع بين هذه النقطة واحدى نقطتي الشمال والجنوب بشرط ان لايكون اكثر من الربع او احدى نقطتي المشرق والمغرب كذلك وقد قوس انحرافها ايضا وهي تقدر ما يجب ان ينحرف المصلي من مواجهة احدى النقاط الاربع ليواجه البيت۔	اور قوس سمت قبلہ افق کی وہ قوس ہے جو اس نقطہ اور نقطۂ شمال یا جنوب کے درمیان یا اس نقطہ اور نقطۂ مغرب و مشرق کے درمیان واقع ہو۔ بشرطیکہ ربع دَور سے زیادہ نہ ہو۔ اسی کو قوس انحراف بھی کہتے ہیں۔ یعنی مصلی کو نقاط اربعہ مغرب مشرق اور شمال و مغرب سے کسی قدر انحراف کرنا چاہیے کہ وہ بیت اللہ کے مواجہہ میں ہو۔

٭ ٭ ٭

ہندوستان کے مختلف مقامات کے سمت قبلہ کا اختلاف

ہندوستان مکہ معظمہ سے مشرق میں ہے۔

اس لیے ہندوستان کے قبلہ کی تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ٹھیک نقطۂ مغرب میں ہو یا اس قدر کم فرق ہو کہ قابل التفات نہ ہو۔ جیسے اٹاوہ، اُناؤ، بہرائچ، جالون سیتاپور، فرخ آباد، کانپور، کھیری، لکھنؤ، ہردوئی وغیرہ کہ ان کا انحراف ایک درجہ سے بھی کم ہے۔ خصوصاً اُناؤ، اس کا انحراف فقط ۳ دقیقہ ہے۔ دوسرے انحراف شمالی ہو، جیسے بنگال، بہار، اڑیسہ کے تمام شہر اور صوبجات متحدہ کے بعض اضلاع، تیسرے انحراف جنوبی ہو جیسے پنجاب کے تمام شہر اور یو۔پی کے بعض اضلاع۔

لیکن کن کن شہروں میں کس قدر انحراف شمالی یا جنوبی ہوگا۔ اس کا جاننا مسلمانوں کے لیے ازحد ضروری ہے۔ افسوس کہ نہ صرف عام مسلمان بلکہ علماء تک اس سے

غافل ہیں۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے راقم الحروف نے اپنے رسالہ موذن الاوقات میں ہر عرض کے ایک مشہور مقام کے ہر مہینہ اور ہر دن کے جملہ اوقات روزہ و نماز ہیئت و توقیت کے قاعدہ جدید و قدیم سے استخراج کر کے دے دیے ہیں نیز اس عرض کے تمام اضلاع و قصبات اور مشہور دیہاتوں کا تفاوت جن کا طول و عرض مجھے اٹلس یا انڈکس آف میپ سے معلوم ہو سکا دے دیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کا افادہ بہت بڑھ گیا ہے۔ شائقین اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

شہروں اور آبادیوں میں تو مسجدیں ایک حد تک اس سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ مگر جہاں مسجدیں نہیں ہیں یا نئی مسجد بنانی ہے یا کسی کی سمت قبلہ غلط ہے وہاں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے صوبہ جات بنگال، بہار، اڑیسہ، ممالک متحدہ آگرہ و اودھ اور پنجاب کے اضلاع کا سمت قبلہ و قدر انحراف بقید درجہ و دقیقہ مع جہت انحراف لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد دائرہ ہندیہ یا قطب نما سے سمت قبلہ نکال لینا بہت آسان ہے۔ جس شہر میں نقطۂ مغرب سے جس قدر شمال یا جنوب کو انحراف لکھا گیا ہے، اسی قدر شمال یا جنوب کو دیتے ہوئے نماز میں کھڑا ہونا چاہیے واللہ الموفق۔

نام شہر	قوس انحراف		جہت	نام شہر	قوس انحراف		جہت	نام شہر	قوس انحراف		جہت
	دقیقہ	درجہ			دقیقہ	درجہ			دقیقہ	درجہ	
صوبۂ بنگال				بوگرا	۲۶	۶	شمالی	دیناج پور	۷	۵	شمالی
				پبنہ	۵۲	۶	"	ڈھاکہ	۳۵	۷	"
				جلپائی گوڑی	۱۵	۴	"	رنگپور	۱۱	۵	"
باقر گنج	۳۹	۹	شمالی	جیسور	۴۵	۷	"	کلکتہ	۷	۸	"
بانکورا	-	۷	"	چاٹگام	۱۲	۹	"	کوچ بہار	۴۲	۴	"
بردوان	۹	۷	"	دارجلنگ	۳۳	۳	"	کھلنا	۱۲	۸	"

نام شہر	قوس انحراف		[illegible]	نام شہر	قوس انحراف		[illegible]	نام شہر	قوس انحراف		[illegible]
	درجہ	دقیقہ			درجہ	دقیقہ			درجہ	دقیقہ	
مرشدآباد	۶	۲۷	شمالی	گیا	۶	۴۶	شمالی	بریلی شریف	۲	۱	جنوبی
مدناپور	۸	۲	״	مالدہ	۵	۳۴	״	بستی	۱	۳۳	شمالی
میمن سنگھ	۶	۳۴	״	مان بھوم	۷	۱۰	״	بلندشہر	۲	۵۶	جنوبی
نادیا	۶	۱۷	״	مظفرپور	۳	۲۵	״	بلیا	۳	۲۴	شمالی
نواکھالی	۸	۳۶	״	موتی ہاری	۲	۳۹	״	بنارس	۳	۳۰	״
بوگرہ	۸	۵	״	ہزاری باغ	۵	۴۰	״	بہرائچ	۰	۱۰	״
مونگیر	۷	۴۷	״					پرتاب گڑھ	۴	۲۸	״
				ممالک مغربی				پیلی بھیت	۲	۱۲	جنوبی
صوبۂ بہار و اڑیسہ				و شمالی				ٹہری گڑھوال	۵	۲۰	״
								جالون	۰	۵۹	شمالی
آرہ	۳	۴۶	״	آگرہ	۱	۳	جنوبی	جونپور	۲	۵۰	״
اودے پور	۶	۵۰	״	الہ آباد	۲	۵۲	شمالی	جھانسی	۱	۳۶	״
بالاسور	۸	۵۴	״	الموڑہ	۲	۲۳	جنوبی	دہرادون	۴	۱۹	جنوبی
بھاگلپور	۳	۴۲	״	اعظم گڑھ	۲	۵۰	شمالی	رائے بریلی	۱	۳۹	شمالی
پٹنہ	۳	۵۶	״	اٹاوہ	۰	۳	جنوبی	ریاست رامپور	۲	۵۲	جنوبی
پلاموں	۴	۲۳	״	ایٹہ	۱	۱۹	״	سلطان پور	۱	۵۰	شمالی
پوری	۱۰	۲۹	״	اناؤ	۲	۵۴	شمالی	سہارنپور	۵	۲۱	جنوبی
پورنیہ	۴	۳۲	״	باندا	۲	۲۶	״	سیتاپور	۰	۲۲	״
چمپارن	۳	۲۷	״	بارہ بنکی	۰	۴۳	״	شاہجہانپور	۱	۱۱	״
دربھنگہ	۳	۳۳	״	بجنور	۴	۹	جنوبی	علی گڑھ	۲	۷	״
رانچی	۶	۳۰	״	بدایوں	۲	۱۰	״	غازیپور	۳	۲۱	شمالی

نام شہر	قوس انحراف درجہ	قوس انحراف دقیقہ	جہت	نام شہر	قوس انحراف درجہ	قوس انحراف دقیقہ	جہت	نام شہر	قوس انحراف درجہ	قوس انحراف دقیقہ	جہت
فتح پور	۱	۵۲	شمالی	ہمیرپور	۱	۳۲	شمالی	سیالکوٹ	۱۱	۱۵	جنوبی
فرخ آباد	۰	۳۹	جنوبی					شاہ پور	۱۲	۳۹	″
فیض آباد	۱	۱۹	شمالی	**صوبۂ پنجاب**				شملہ	۷	۱۴	″
کانپور	۰	۵۹	″					فیروزپور	۸	۴۹	″
کھیری	۰	۴۷	جنوبی	امرتسر	۹	۴۰	جنوبی	کرنال	۵	۱۷	″
گورکھپور	۱	۵۷	شمالی	بنوں	۵	۲۷	″	کوہاٹ	۱۵	۴۲	″
گونڈہ	۱	۲۰	″	پشاور	۱۲	۱۲	″	گجرات	۱۱	۴۳	″
لکھنؤ	۰	۴۱	″	جہلم	۱۲	۳۶	″	گوجرانوالہ	۱۱	۰	″
مراد آباد	۳	۲	جنوبی	جالندھر	۸	۴۵	″	گڑگاؤں	۲	۵۶	″
میرٹھ	۳	۵۰	″	جھنگ	۶	۱۱	″	لاہور	۱۰	۰	″
مین پوری	۰	۴۲	″	حصار	۵	۱۷	″	لودھیانہ	۷	۵۳	″
متھرا	۱	۴۰	″	ڈیرہ اسمٰعیل خاں	۱۳	۱۰	″	مظفر نگر	۹	۵۲	″
مرزاپور	۴	۴۸	شمالی	ڈیرہ غازی خاں	۱۰	۱۰	″	ملتان	۹	۵۳	″
نینی تال	۳	۲۶	جنوبی	راولپنڈی	۱۴	۱۳	″	منٹگمری	۹	۲۳	″
ہردوئی	۰	۲۳	″	رہتک	۴	۴۲	″	ہوشیارپور	۸	۴۸	″

پنجاب اور یو۔پی کے جن شہروں کا سمت قبلہ جنوبی ہے۔ اسے تو مشرقی صاحب شاید تسلیم کرلیں۔ مگر یو۔پی کے جن شہروں کا قبلہ شمالی ہے یا بنگال، بہار، اڑیسہ کے تمام شہروں کا جن کا قبلہ شمالی ہے۔ اس کو تسلیم کرنے میں شاید ان کو تامل ہو، اور وہ یہ خیال کریں کہ یہ سب شہر مکہ معظمہ سے نائد العرض ہیں، اس لیے کہ ان کے دیے ہوئے نقشہ کے مطابق خط ملانے سے کعبۂ معظمہ جنوب کی طرف آتا ہے نہ شمال کو۔

اس لیے فقیر اس مسئلہ کو مدلل کرنے کے لیے سمت قبلہ معلوم کرنے کا قاعدہ بتائے دیتا ہے۔

سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا طریقہ

فصل طول مکۂ معظمہ اور بلد مفروض جس کی سمت قبلہ معلوم کرنا ہو، اگر وہ ۹۰ درجے سے کم ہے تو نصف جنوبی میں وہ عمود جو سمت الراس مکۂ معظمہ پر گزرتا ہو، نصف النہار بلدی پر قائم کریں۔ (یعنی نقطۂ اعتدال سے ایک دائرۂ عظیم مکۂ مکرمہ کی سمت گزاریں کہ نصف النہار پر آپ ہی عمود ہوگا (کیونکہ اس کے دونوں قطب اعتدالین پر گزرا ہے)

یہ سمت الراس سے ہمیشہ شمال کو گزرے گا کہ اس عرض میں معتدل سمت راس شمالی ہے اور سمت الراس مکۂ معظمہ معدل سے تو عمود جو نقطۂ اعتدال سے نکل کر سمت الراس مکۂ معظمہ پر گزرتا ہوا نصف النہار سے ملا ہو۔ قطعاً سمت الراس بلد سے شمالی ہوگا۔ مگر عرض شمالی میں تینوں حالتیں ہوتی ہیں۔ اگر عرض[1] عمود عرض البلد کے برابر ہے تو موقع عمود میں سمت الراس بلد ہے، یعنی بلد کا دائرہ اول السموت ہی سمت الراس مکہ پر گزرا ہوا ہے۔ اور اگر اس کا عرض[2] عرض البلد سے زائد ہے تو موقع عمود سمت الراس سے شمالی ہوگا۔ اور اگر عرض[3] البلد سے کم ہے تو جنوبی ہوگا۔ جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہے۔ ا ب ج ء افق شمالی ہے ب ہ د اس کا اول السموت ب ر د معدل النہار ح قطب شمالی ظاہر ہے کہ اول السموت کا معدل سے فصل اعظم دائرہ نصف النہار پر ہ ر ہے کہ عرض البلد سے پھر کم ہوتا گیا ہے یہاں تک کہ نقطۂ ب پر معدوم ہوگیا، ح ر ح ل ح ک ح ی دوائر میلیہ ہیں جو قطب سے نکل کر معدل سے ملے ہیں اور اول السموت کے نقاط ہ عہ ط سہ کا معدل سے عرض بتاتے ہیں، جن میں سب سے بڑا ہ ر ہے پھر عہ ل پھر ط ک پھر سہ ی۔ غرض نصف النہار
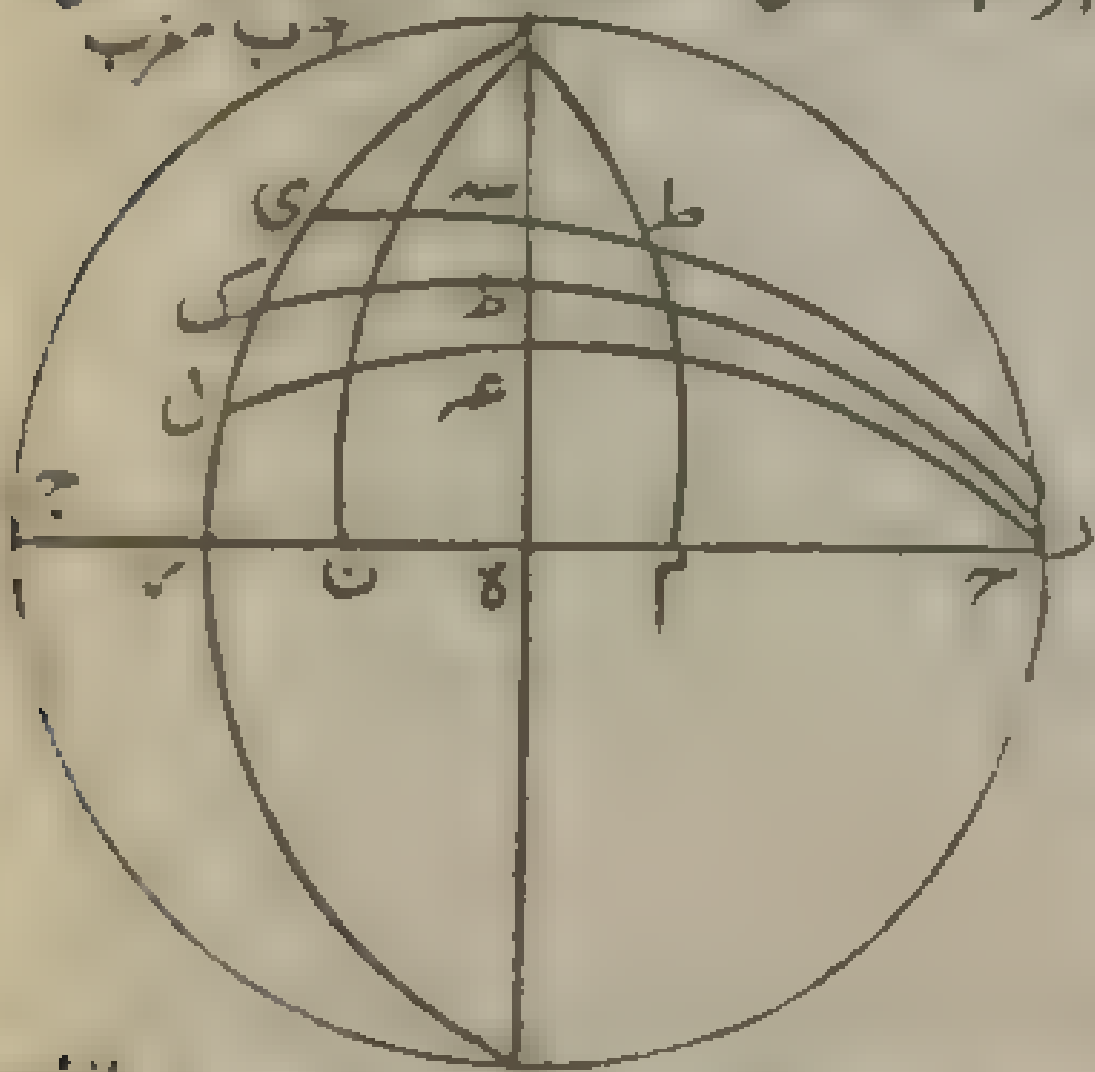
سے جتنا فصل بڑھتا گیا ہے عرض اول السموت گھٹتا گیا ہے۔ فرض کیجیے کہ تین شہر مساوی العرض ہیں، جن کا عرض عرض حرم سے زیادہ ہے۔ اور فصل طول ۹۰ سے کم تو بوجہ تساوی عرض مواقع مذکورہ پران کے اول السموت کے عرض یکساں ہوں گے۔ فرض کیجیے عرض ع ل عرض حرم سے زائد ہے ط ک مساوی اور س ی چھوٹا توان تین شہروں میں مکہ معظمہ سے جس کا فصل طول ل س ہے وہاں سمت الراس مکہ معظمہ ط نصف النہار ح ل پر ہے اور چونکہ ع ل عرض حرم سے زائد ہے۔ ط اول السموت اور معدل کے بیچ میں پڑے گا۔ تو عمود ب ن نقطۂ اعتدال سے نکل کر سمت الراس حرم پر ہوتا ہوا نصف النہار سے ملا ہوا سمت الراس بلد سے جنوب کو پڑے گا۔ اور جس کا فصل طول ک س ہے وہاں ط نصف النہار ح ک پر ہے۔ اور چونکہ ط ک مساوی عرض حرم ہے اس لیے ط خاص اول السموت پر واقع ہوگا۔ اور ب ح جو اول السموت ہے عمود ہوگا کہ ب سے نکل کر ط پر گزرتا اور نصف النہار سے ملا ہے اور جس کا فصل طول ی س ہے، وہاں ط نصف النہار ح ی پر ہے۔ چونکہ س ی عرض حرم سے چھوٹا ہے اس لیے ط اول السموت سے باہر شمال میں رہے گا۔ اور عمود م ب م سمت الراس بلد سے شمال کو پڑے گا۔ علامہ موسیٰ رومی شارح چغمنی فرماتے ہیں:۔

"اعلم ان راس مکۃ فی ھذا القسم (الذی طولہ وعرضہ اکثر من طول مکۃ وعرضھا) یمکن ان یقع علی دائرۃ اول السموت البلد فیکون سمت القبلۃ نقطۃ المغرب والخط الذی علی صوبھا خط المشرق والمغرب وان یقع شمالیا منھا فیکون السمت فی الربع الغربی الشمالی من الافق وان یقع جنوبیا عنھا فیکون السمت فی الربع الغربی الجنوبی کما یقتضیہ العمل بما فی الکتاب الا انہ لایجب ان یکون الخط المذکور علی صوبہ"۔

علامہ برجندیؒ اس کے حاشیہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"توضیح المقام ان دائرۃ اول السموت تقطع معدل النہار
علی نقطتی المشرق والمغرب وغایۃ البعد بینہما انما ھی
بقدر عرض البلد وکل من القسی الواقعۃ بینہما من دوائر
المیل بل من انصاف نہار سائر الآفاق اصغر من عرض
البلد وکل قوس البعد من غایۃ البعد اصغر من الاقرب
ویجوز ان یکون عرض مکۃ فی ھذا القسم بقدر قوس من
ھذہ القسی فیکون سمت راس مکۃ علی اول السموت و
سمت البلد وسمت القبلۃ نقطۃ المغرب ویجوز ان یکون
عرض مکۃ اعظم من تلک القوس فیکون سمت راس
مکۃ فی شمال اول السموت وسمت القبلۃ فی الربع
الغربی الشمالی من الافق ویجوز ان یکون عرض مکۃ
اصغر من تلک القوس فیکون سمت راس مکۃ فی جنوب
اول السموت وحینئذ یکون سمت القبلۃ فی الربع
الغربی الجنوبی من الافق کما ھو مقتضی العمل الذی
ذکرہ المصنف"

اسی سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جس طرح یہ خیال غلط ہے کہ زائد العرض شہروں کا سمت قبلہ مطلقاً جنوبی ہوتا ہے، اسی طرح مشرقی صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ جو شہر مکۂ معظمہ سے ٹھیک پورب واقع ہیں، ان کا قبلہ نقطۂ مغرب ہوگا۔ جس بنا، پر انھوں نے سورت کو جہاں عرب پہلی صدی میں سب سے پہلے اترے تھے، مکۂ معظمہ سے مشرق کی سمت بتایا۔ اور سورت، ناگپور، کٹک وغیرہ کو جو اسی عرض بلد پر واقع ہیں، جس پر ان کے خیال میں مکۂ معظمہ واقع ہے، ان کا قبلہ ٹھیک نقطۂ مغرب کو صحیح بتایا۔ امام فخر الدین رازیؒ تفسیر کبیر میں دلائل قبلہ بیان کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:۔

امام رازی کے دلائل قبلہ | واما الطریقۃ الیقینیۃ المذکورۃ فی کتب الھیئۃ قالوا سمت القبلۃ نقطۃ التقاطع بین دائرۃ الافق و بین دائرۃ العظیمۃ، تمر بسمت رؤسنا و رؤس اھل مکۃ و انحراف القبلۃ قوس من دائرۃ الافق ما بین سمت القبلۃ و دائرۃ نصف النھار فی بلدنا و ما بین سمت القبلۃ و مغرب الاعتدال تمام الانحراف قالوا و یحتاج فی معرفۃ سمت القبلۃ الی معرفۃ طول مکۃ و عرضھا فان کان طول البلد مساویا لطول مکۃ و عرضھا مخالف لعرض مکۃ کان سمت قبلتھا علی خط نصف النھار فان کان البلد شمالیا فالی الجنوب و ان کان جنوبیا فالی الشمال و اما اذا کان عرض البلد مساویا لعرض مکۃ و طولہ مخالفا لطولھا فقد یظن ان سمت قبلۃ ذلک البلد علی خط الاعتدال و ھو ظن خطاء۔

دیکھیے کس قدر روشن تصریح ہے کہ جب عرض بلد عرض مکہ کے مساوی اور طول بلد طول مکہ کے مخالف ہو تو خیال کیا جاتا ہے کہ اس شہر کا خط اعتدال یعنی ٹھیک مغرب کو ہے۔ جیسا مشرقی صاحب نے خیال کیا۔ مگر امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے۔

استخراج سمت قبلہ کا قاعدہ | اس تمہید کے بعد استخراج سمت قبلہ کا قاعدہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ ظل عرض حرم + جم فصل طول = ظل عرض شرقی جم عرض بلد + تم فصل طول = مفروضہ۔ جیب تمام ظل = ظل انحراف۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ جس مقام کا سمت قبلہ معلوم کرنا ہو پہلے اس کے طول بلد

مکہ معظمہ کے طول سے تفاضل لے لیا جائے۔ اس کے بعد ظل[1] التمام عرض مکہ کو جیب التمام فصل طول کے ساتھ جمع کیا جائے۔ حاصل جمع کی قوس معلوم کر کے اس کا کل لے لیا جائے کہ عرض موقع ہے۔ پھر اس کو عرض بلد سے تقسیم کیا جائے، اگر عرض بلد عرض موقع سے کم ہے تو انحراف شمالی ہوگا۔ اور زائد ہے تو انحراف جنوبی ہوگا اور برابر میں کوئی انحراف نہ ہوگا بلکہ سمت قبلہ ٹھیک نقطۂ مغرب کو ہوگا۔ س کے بعد جیب التمام عرض موقع کو ظل فصل طول کے ساتھ جمع کیا جائے۔ حاصل جمع کو جیب تفاضل عرض موقع وعرض البلد سے کم کر کے اس ظل کی قوس لے کر ۹۰ تک اس کا تمام لیا جائے، یہ قدر انحراف ہوگا۔ سمت قبلہ معلوم کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔

اس قاعدہ کے بعد اب میں پھر مشرقی صاحب کے افادات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ فرماتے ہیں:۔

> "یہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پچھلی کئی قرنوں کی نمازیں اور نقطوں کے علاوہ یقیناً اسی لیے قبول نہیں ہوئیں کہ وہ دین اسلام کے مقرر شدہ قبلہ کی طرف نہ تھیں۔ خدا اس کم نگاہ اور اندھی امت سے بجا ناراض ہے۔"

اور کمالات کے ساتھ اس دعوے سے مشرقی صاحب عالم غیب بھی ہو گئے کہ انھوں نے مسلمانوں کی قرنوں کی نمازوں کو اکارت کر دیا۔ دیکھیے ان کی پرواز کہاں تک لے جاتی ہے۔ لیکن یہ دعویٰ بھی ان کے قصور علم کا نتیجہ ہے۔

فہمِ قرآن کا نمونہ

ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ استقبال قبلہ نام ہے، خواہ عین کعبہ کی طرف رخ ہو۔ جیسے کہ مکرمہ والوں کے لیے یا محض اس جہت کی سمت ہو۔ جیسے اوروں کے لیے کلام اللہ کے یہ الفاظ ہیں۔ فول وجھک شطر المسجد الحرام۔ اور فولوا وجوھکم شطرہ اگر عین کعبہ سے استقبال کا حکم

---

[1] ظل اور ظل التمام، جیب اور جیب التمام وغیرہ کی لوکارتمی اعداد دیتھ ٹمیکل ٹیس لوگارتمس جیمبر صاحب میں ملیں گے۔ یہ کتاب رڑکی ٹامسن کالج سے مل سکتی ہے۔ ۱۲ منہ

ہوتا تو لفظ شطر کے بجائے فولوا وجوھکم الی بیت اللہ فرمایا جاتا۔ تفسیر کبیر میں ہے :۔

فی الآیۃ قولان الاول وھو قول جمھور المفسرین من الصحابۃ والتابعین والمتاخرین واختیار الشافعی رضی اللہ عنہ فی کتاب الرسالۃ ان المراد جھت المسجد الحرام وتلقائہ وجانبہ وقراۃ ابی ابن کعبؓ تلقاء المسجد الحرام۔	یعنی شطر کی تفسیر میں دو قول ہیں پہلا جمہور مفسرین، صحابہ و تابعین و علمائے متاخرین اور امام شافعیؒ کا کتاب الرسالۃ میں پسندیدہ قول یہ ہے کہ مراد جہت مسجد حرام ہے، اور اس کے مقابل و محاذی ہے۔ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت ہی تلقاء المسجد الحرام ہے۔

امام رازی نے اس کے بعد دوسرا قول معتزلہ کا بیان کیا ہے کہ شطر سے مراد نصف ہے۔ اس کے بعد دو دلیلوں سے اسے رد کیا ہے۔ فرماتے ہیں اگر شطر سے مراد طرف ہو تو لفظ شطر بڑھانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لیے اگر فول وجھك المسجد الحرام کہا جائے، جب بھی یہی مطلب ہوگا۔ البتہ اگر شطر کے معنی جہت لیے جائیں، تو بے شک اس لفظ کے بڑھانے کا فائدہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ البیت قبلۃ لاھل المسجد والمسجد قبلۃ لاھل المکۃ والحرم قبلۃ لاھل المشرق والمغرب۔

ایک خوش اعتقادی

آگے مشرقی صاحب کی خوش اعتقادی مغربی قوم کے متعلق ملاحظہ ہو :۔

> "اگر یہی فولوا وجوھکم شطر المسجد الحرام کا حکم کسی مغربی قوم پر نازل ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ یورپ کے ہر حصہ میں کروڑوں نہایت باریک بین رصدی آلات اس مطلب کے لیے شہر بشہر نصب ہو جاتے کہ خدائے عزوجل کے آسمانی حکم کی رو سے شطر المسجد الحرام صحیح طور پر دریافت کریں۔ وہ قوم ایسے دقیقہ رس اور نازک آلات ایجاد کرتی کہ

شمال و مغرب کے درمیان تین لاکھ چوبیس ہزار سمتوں سے ایک گز کا بھی
فرق نہ آنے پاتا۔ ان کے قبلہ کی سمت عین کعبہ کے سیاہ غلاف
کے نصف پر آکر پڑتی ہے۔ جو چھ فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا ہے:

مشرقی صاحب نے خوش اعتقادی کی بھی حد کردی۔ ان کو ہمیشہ ایسی ہی باتوں کا یقین ہوا کرتا ہے جو بالکل واقعہ کے خلاف ہوں، جنھیں اصلیت سے دور کا بھی علاقہ نہ ہو۔ مغربی قوموں کو فولوا وجوھکم شطر المسجد الحرام کا حکم تو نہیں، لیکن فولوا وجوھکم شطر البیت المقدس کا حکم تو ہے کہ وہ ان کا بھی قبلہ ہے۔ میں مشرقی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مغربی قوموں نے یورپ میں کتنے کروڑ باریک بین رصدی آلات بیت المقدس کی سمت معلوم کرنے کے لیے شہر بشہر نصب کر دیے، کیا مسلمانوں کے لیے خانۂ کعبہ کی جو اہمیت ہے مغربی قوموں کے لیے بیت المقدس کی اس سے کم ہے؟۔

سمت قبلہ معلوم کرنے کے طریقوں اور آلات سے ناواقفیت

مشرقی صاحب باوجود دعوئ ہمہ دانی اپنے گھر کی دولت سے محروم ہیں، انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمانوں کے پاس سمت جگہ معلوم کرنے کے کیسے باریک آلات ہیں۔ آپ کے تخیل میں تو صرف مغربی قوم ایسے آلات ایجاد کرتی کہ شمال و مغرب کے درمیان تین لاکھ چوبیس ہزار سمتوں سے ایک گز کا بھی فرق نہ آنے پاتا اور مسلمانوں کے پاس اس گئی گزری حالت پر بھی ایسے ایسے آلات و معلومات ہیں کہ نقطۂ شمال و مغرب کے درمیان پندرہ سنکھ ستائیس پدم چھبیس نیل چونسٹھ کھرب مختلف طریقوں کے درمیان ایک گز تو درکنا ایک انچ کا بھی فرق نہیں پڑسکتا۔ اگر جناب کو اس کی خبر نہ ہو تو اس کا کیا علاج میں بتاتا ہوں کہ اس آلہ کا نام اسطرلاب ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ ادراک سمت قبلہ کے طریقۂ یقینیہ کے بیان میں فرماتے ہیں:۔

"ولذلک طرق اسھلھا ان یعرف الجزء الذی یسامت

رؤس اهل المكة من فلك البروج وهو ﺰ من الجوزاء
و ﺰ من السرطان فيضع ذلك الجزو على خط وسط
السماء فى الاسطرلاب المعمول لعرض البلاد ويعلم على
المرئی علامة ثم يدير العنكبوت الی ناحية المغرب ان
كان البلد شرقيا عن مكة كما فى بلاد خراسان والعراق
بقدر مابين الطولين من اجزاء الحجرة الی قوله،
ويخط على ظل المقياس خطا من مركز العمود الی اطراف
الظل فذلك الخط خط الظل فيبنى عليه المحراب"

یہ آلہ آپ کی مغربی قوم کے آلات کی طرح بہت بیش قیمت بھی نہیں جس کا حصول ہر شخص کے لیے ممکن نہ ہو، رامپور لائبریری اور کتب خانہ خدابخش مرحوم کے علاوہ دوسرے کتب خانوں میں بھی بہتیرے اسطرلاب ہیں۔ اسطرلاب کے علاوہ میں مشرقی صاحب کو ایک اور آلہ بتاتا ہوں جس سے نہایت آسانی کے ساتھ سمت قبلہ معلوم کی جاسکتی ہے اور مغرب وشمال کے پندرہ سنکھ حصوں میں اس کے ذریعہ بھی ایک انچ کا فرق نہیں پڑسکتا، یہ آلہ خاص ہندوستان کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اس کا نام دائرۂ ہندیہ رکھا گیا۔

علامہ ریاضی بہاء الدین محمد عاملی اپنی کتاب "تشریح الافلاک" میں اسطرلاب والا طریقہ بتاکر لکھتے ہیں:۔

"طريق آخر اسهل من الاول تاخذ يوم كون الشمس فی احد
الجزئين السابقين (ای ثامنة الجوزاء او الثالثة والعشرين
من السرطان) لكل خمس عشر درجة من التفاوت بين
الطولين ساعة ولكل درجة اربع دقائق فاذا مضى من
نصف النهار بقدر ما معك من الساعات والدقائق
ان زاد طول البلد او بقى له بقدره ان نقص فظل المقياس

ے خط سمت القبلة وهى على خلاف جهت الظل:
علامہ عصمت اللہ اس کی شرح میں اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں:۔

"وذلك لان دائرة الارتفاع تمر حينئذ بسمت راس مكة ايضا والظل يكون فى سطحها فخط الظل هو خط سمت القبلة فما يحاذى احد طرفى هذا الخط من اجزاء الدائرة الهندية يكون نقطة سمت القبلة"

سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا ایک اور آسان طریقہ

یہ تو مشرقی صاحب کو سمت قبلہ کے معلوم کرنے کے آلات کا پتہ بتانا تھا۔ اب عام مسلمانوں کے لیے سمت قبلہ نکالنے کی سہل ترین ترکیب لکھتا ہوں۔ ۲۹ مئی اور ۱۴ جولائی کو تاریخوں میں اپنے شہر اور مکہ معظمہ میں جتنے گھنٹہ اور منٹ کا فرق ہو۔ نصف النہار کے بعد اتنے گھنٹہ اور منٹ پر کسی عمود یا پایہ کا سایہ دیکھیں۔ یا خود سیدھے دھوپ میں کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت کا سایہ ٹھیک سمتِ قبلہ کو بتائے گا۔ مکہ معظمہ اور کسی شہر کے وقت میں گھنٹہ اور منٹ کا فرق اس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اطلس کے آخر میں شہروں کا طول وعرض دیا ہوتا ہے۔ اس سے مکہ معظمہ اور اس شہر کا طول معلوم کر کے چھوٹے کو بڑے سے تفریق کریں۔ حاصل تفریق کو چار میں ضرب دے کر ساٹھ پر تقسیم کریں، اس سے گھنٹہ منٹ معلوم ہو جائے گا۔

کاش مشرقی صاحب لاہور کی مساجد کو کم از کم اسی قاعدہ سے دیکھنے کے بعد ان کی سمتِ قبلہ کے غلط ہونے کا حکم لگاتے۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:۔

"میں بتا بتا ہوں کہ ہندوستان کے سب نمازی مسلمان اگر اپنی نمازوں کو بارگاہ خداوندی میں پھر قبول کرانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے غلط قبلوں کو اس صحیح نقشہ سے درست کر لیں جو میں نے الاستنجاح میں دیا ہے

یا اس سے بہتر نقشہ سے درست کرلیں. غلط قبلوں والی مسجدوں پر آلاتِ رصدیہ کے ذریعہ سے صحیح قبلوں کے نشان ازسرِ نو لگائیں حتی الوسع پرانی مسجدوں میں جن کے قبلے یقیناً درست ہوں گے. اپنی نمازیں علی الخصوص جمعہ کی نماز ادا کریں۔"

نماز کی قبولیت اور عدم قبولیت اور چیز ہے اور شرائط و ارکان کے مطابق ہونا اور چیز۔ ٹھیک سمت قبلہ پر نہ ہونے سے عدم قبولیت کا حکم لگانا ہرگز صحیح نہیں۔

مشرقی صاحب کے نقشہ کی غلطیاں

الاصلاح کے نقشوں سے قبلوں کی درستی کی بھی ایک ہی کہی، آپ حکم تو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو دے رہے ہیں اور نقشے میں صرف چند جگہوں کے نام دیے ہیں اور وہ بھی غلط. مثلاً پٹنہ کا طول ۸۵ ہے، آپ کے نقشہ میں ۹۰ درجے سے بھی پورب یعنی ۹۲ درجہ ہے اور عرض ۲۵ درجہ ہے. مگر آپ کے نقشہ میں خط سرطان کے قریب یعنی ۲۳ درجہ ہے. اولاً تو یہ قاعدہ ہی غلط ہے. اگر قاعدہ صحیح بھی ہو تو مشرقی صاحب کے نقشہ میں ایسی فاش غلطیاں ہیں کہ ان پر بنیاد رکھنا کسی طرح صحیح نہیں اگر صحیح نقشہ بھی دستیاب ہو جائے تو اس میں گنتی کی چند جگہوں کے سوا تمام آبادیوں کے نام نہیں ہوتے. پھر نقشہ میں اگر وہ جگہ جس کی سمت قبلہ معلوم کرنی ہے مل بھی گئی. تو نقشہ میں مکہ معظمہ اور اس شہر کے درمیان خط کھینچ دینے سے اس شہر کی مسجدوں کی سمت قبلہ کس طرح معلوم ہوگی. پھر سطحی خط اور ہے. کروی خط اور. نقشہ میں ان دونوں شہروں کے درمیان خط ملا دینے سے اس دائرہ کے مساحت پر کس طرح ہوگا. جو سمت الراس مکہ معظمہ پر گزرتا ہو اور افق بلد سے متقاطع ہو۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مُو اینجاست ۔۔۔ نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند

ایک پُر لطف تجویز

سب سے پر لطف آلات رصدیہ کے ذریعہ مسجدوں کے صحیح قبلوں کا نشان بنانے کی تجویز ہے. اولاً ہر مسجد کے لیے قیمتی آلات آئیں گے کہاں سے. پھر ہر جگہ کے عوام ان کے استعمال سے واقف نہیں، مولویوں

اور علماؤں کو آپ ناواقف بتا چکے ہیں تو کیا ہر جگہ آپ خود سمت گوارا فرمائیں گے جن جن مسجدوں میں آپ نے نمازیں پڑھی ہیں، کیا ان کی سمت قبلہ آپ نے آلات کے ذریعہ سے درست کر لی تھی، اچھرہ کی مسجد کا جہاں آپ چار سال سے مقیم ہیں اور جس میں آپ نے ہزاروں نمازیں پڑھی ہوں گی سمت قبلہ کیا ہے، نقطۂ مغرب سے کس قدر اور کس جانب انحراف ہے۔ کسی ایسی تجویز کا جس پر خود عمل نہ ہو پیش کرنا مضحکہ انگیز ہے۔

کیا مسجد کی قدامت اس کے سمت قبلہ کی صحت کی دلیل ہے

مشرقی صاحب نے لاہور کے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ "وہ اپنی تمام نئی مسجدوں کو چھوڑ کر شاہی مسجد، سنہری مسجد، مسجد وزیر خاں میں نماز ادا کریں"

کیا مشرقی صاحب نے ان مسجدوں کی سمت قبلہ کی تحقیق کر لی ہے یا محض قدامت کی بنا پر ان کی صحت تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے بیان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قدامت کی بنا پر ان کا قبلہ صحیح سمجھتے ہیں، اس لیے کہ لاہور کی تمام مسجدوں کے سمت قبلہ سے منحرف ہونے کا فتویٰ دے چکے ہیں۔

خاتمہ

مشرقی صاحب کا رسالہ "مولوی کا غلط مذہب نمبر۹" شروع سے آخر تک محل نظر ہے جو مسجدیں سمت قبلہ کے مطابق ہیں خواہ وہ نئی ہوں یا پرانی، ان کی نمازوں کے سمت قبلہ کے موافق ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں اور جن مسجدوں کے قبلے صحیح سمت میں نہیں ہیں تو اگر وہ ۴۵ درجہ کے اندر تک ہیں جب بھی نماز صحیح ہو جائے گی۔ گو ہمارے بتائے ہوئے قاعدہ کے مطابق اون کی سمت قبلہ صحیح کر لینا ضروری ہے لیکن اگر ان کی موجودہ حالت میں بھی ان میں نمازیں پڑھی جائیں جب بھی ہو جائیں گی۔ سمت کعبہ کی جانب رُخ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رُخ کا کوئی جز کعبہ کی سمت میں واقع ہو، پس اگر کعبہ سے خفیف انحراف بھی ہو لیکن رُخ کا کوئی جز کعبہ کے مواجہہ میں ہو تو نماز ہو جائے گی۔ البتہ اگر ۴۵ درجہ سے زیادہ انحراف ہوگا تو استقبال نہ ہوگا اور اس صورت میں نماز نہ ہوگی جیسا کہ اس

شکل سے واضح ہوگا مثلاً اب ایک خط ہے اس پر ہ ح عمود ہے۔ فرض کیجئے کہ کعبہ معظمہ عین نقطہ ح کے محاذی ہے دونوں قائمے ا ہ ح، اور ح ہ ب کی تنصیف کرتے ہوئے خطوط ہ د اور ہ ج کھینچے تو یہ زاویے د ہ ح، ج ہ ح ۴۵ درجے کے ہوئے کیونکہ قائمہ ۹۰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اس شکل کے مطابق جو شخص مقام ہ پر کھڑا ہے۔ اگر نقطہ ح کی طرف رخ کرے تو عین کعبہ کی جانب ہوگا اور اگر داہنے بائیں د یا ج کی طرف جھکے تو جب تک ہ د یا ہ ج کے اندر ہے، جہت کعبہ میں ہے اور جب د سے بڑھ کر ب یا ج سے گزر کر ا کے درمیان ہو جائے گا تو جہت بالکل بدل جائے گی اور نماز نہ ہوگی۔
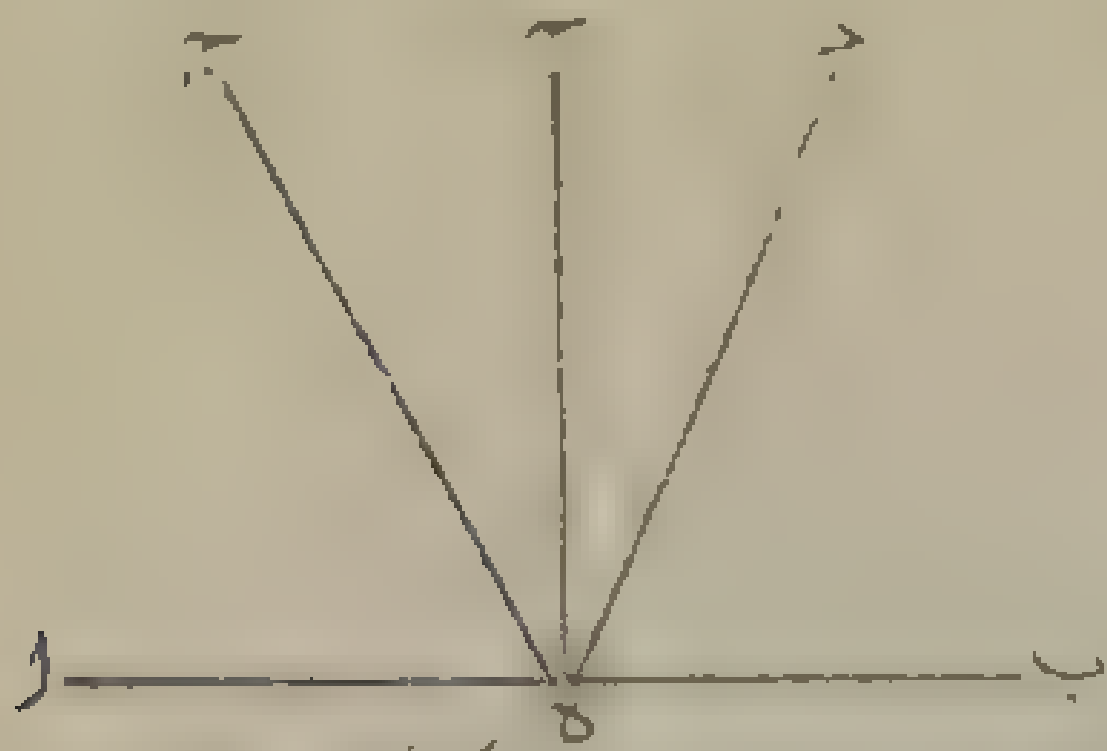
(منقول از رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ جنوری و فروری سنہ ۹۴ء)

دفع الملامة
عن
القيام عند اول القيامة

اقامت کے وقت مقتدی
کب
کھڑے ہوں؟

****

"اس موضوع پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا ایک رسالہ
پہلے بھی دیوبند میں شائع ہو چکا ہے بعد ازاں موصوف کو
نظر ثانی کا موقع ملا تو بہت سی ترمیم واضافہ کے بعد یہ
ایک نیا رسالہ بن گیا، جو ترمیم کے بعد پہلی بار البلاغ
صفر ۱۳۹۲ھ میں شائع ہوا تھا۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد۔ اقامتِ نماز کے وقت امام اور مقتدی کس وقت کھڑے ہوں؟ شروع اقامت سے یا بعد میں مؤذن کے کسی خاص کلمہ پر یہ ایک ایسا فروعی مسئلہ ہے کہ اس کی جانب میں لڑنا نہیں۔ دونوں ہی طریقے شرعاً جائز ہیں فرق اور اختلاف صرف اس میں ہے کہ افضل و اولیٰ کون سا طریقہ ہے۔ اگر کراہت ہے تو وہ صرف اس صورت میں ہے کہ امام کے مسجد میں آنے سے پہلے اقامت شروع کر دیں اور سب مقتدی کھڑے ہو کر امام کے آنے کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ صورت شاذ و نادر ہی کہیں ہوتی نہیں، اور جو صورت عام طور پر پیش آتی ہے کہ امام بھی موجود مقتدی بھی، اس میں شروع اقامت سے کھڑا ہونا کسی کے نزدیک بلا کراہت یا اختلاف کے جائز ہے اور کچھ تاخیر سے کھڑا ہونا کسی کے نزدیک مکروہ نہیں۔ اس مسئلے کو بحث و مباحثہ اور باہمی جدال جھگڑے کا ذریعہ بنا لینا کوئی مناسب نہیں کیونکہ باہمی جدال اور جھگڑے سے جو فساد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں فریقین نہ معلوم کتنے گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی توہین کرنے لگتے ہیں، باہمی منافرت پیدا ہو جاتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سختی کے ساتھ رد کیا ہے۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ یعنی ایک مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لئے حرام، اُس کا خون بھی، اُس کا مال بھی اُس کی آبرو بھی۔ توہین اور سخت کلامی میں ایک دوسرے کی آبرو پر حملہ ہوتا ہے جو از روئے حدیث مذکور حرام ہے۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے سباب المسلم فسوق، یعنی کسی مسلمان کو گالی دینا برا کہنا فسق ہے۔ اب سمجھنے کی بات ہے کہ ایک اولیٰ و افضل پر عمل کرنے کے لئے اتنے حرام

اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا دانشمندی ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں کہ پورے عالم اسلام کو صرف مسلمانوں کے باہمی تفرقہ نے تباہی کے کنارے پر لگا دیا ہے۔ اس زمانے میں تو ایسے مسائل میں ہر مسلمان کو چاہیئے کہ جس عالم بزرگ پر اعتماد ہو اس کے فتویٰ کے مطابق اپنے عمل میں افضل کو تلاش کرکے اس پر عمل کرے، دوسرے اگر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں، بغیر کسی جھگڑے کے نرمی سے سمجھا دینے کا موقع ہو تو سمجھا دے ورنہ اُس کو اُس کے طریقہ پر چھوڑ دے۔

مندرجہ رسالہ سوال وجواب اب سے تیئیس سال پہلے دارالعلوم دیوبند میں لکھا گیا تھا چونکہ عوام یہاں بھی اس مسئلہ میں الجھتے رہتے ہیں اس لئے مسئلہ کی پوری حقیقت واضح کرنے کے لئے اس کو کسی قدر اضافہ و ترمیم کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ پھر عرض ہے کہ اگر سمجھ میں آجائے تو خود عمل کریں، دوستوں کو بتلا دیں، جو لوگ اس کے خلاف کریں، اُن سے کوئی جھگڑے کی صورت ہرگز نہ بننے دیں۔

واللہ المستعان

بندہ محمد شفیع، دارالعلوم کراچی

۲۷/ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ بوقت قیام الی الجماعت امام اور مقتدین کا ابتداء اقامت سے کھڑا ہونا مستحب ہے یا حی علی الفلاح پر، اگر مقتدین بغیر امام یا مع الامام، ابتداء اقامت سے کھڑے ہوجائیں تو یہ ان کا عمل کراہت میں داخل ہے۔ اگر کراہت میں داخل ہے تو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ابتداء اقامت سے کھڑے ہو کر صفوف کو استوار کرنا اور اس پر عمل کی تلقین کرنا کراہت کے خلاف ہے اور اگر قیام من ابتداء الاقامۃ مکروہ نہیں تو حاشیہ طحاوی میں تحریر کردہ حکم کراہت قیام من ابتداء الاقامۃ کا کیا جواب ہے۔ مع حوالہ کتب بیان فرما کر تشفی بخشیں بینوا توجروا

الجواب وباللہ التوفیق

سوال کے جواب میں پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا تعامل کیا اور کس طرح رہا ہے اسی کے سمجھنے سے سب سوالات کا خود بخود حل ہو جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل:

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ

۱ —— کان بلال یؤذن اذا دحضت الشمس فلا یقیم حتی یخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاذا خرج الامام اقام الصلوٰۃ۔

(مسلم باب متی یقوم الناس فی الصلوٰۃ، ص ۲۲۰ ج ۱)

حضرت بلالؓ اذان ظہر اُس وقت دیتے تھے جب آفتاب کا زوال ہو جاتا، پھر اقامت اُس وقت تک نہ کہتے تھے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکان سے باہر نہ آجاتے جب باہر تشریف لاتے تو نماز کی اقامت کہتے تھے۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

۲ —— ان الصلوٰۃ کانت تقام لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیاخذ الناس مصافہم قبل ان یقوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقامہ (مسلم ص ۲۲۰ ج ۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کے لئے نماز کھڑی کی جاتی تھی، اور لوگ آپ کے کھڑے ہونے سے پہلے اپنی اپنی جگہ صفوں میں لے لیتے تھے۔

۳ —— عن ابی ھریرۃ رضؓ یقول اقیمت الصلوٰۃ فقمنا فعدلنا الصفوف قبل ان یخرج الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث (مسلم ص ۲۲۰)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار نماز کھڑی کی گئی تھی، ہم کھڑے ہوئے اور

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہماری طرف نکلنے سے پہلے ہی ہم نے صفیں درست کرلیں۔

۴ ——— عن ابی قتادۃ رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی (بخاری باب متی یقوم الناس اذا راوا الامام عند الاقامۃ وعن الک رواہ مسلم فتح الباری ج ۲ ص ۹۴)

حضرت ابو قتادہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم کھڑے نہ ہو جب تک مجھے اپنی طرف آتا ہوا نہ دیکھ لو۔

۵ ——— روی عبد الرزاق عن ابن جریج عن ابن شہاب ان الناس کانوا ساعۃ یقول المؤذن اللہ اکبر یقومون الی الصلوٰۃ فلا یاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقامہ حتی تعتدل الصفوف۔

ابن شہاب سے مروی ہے کہ جس وقت مؤذن اللہ اکبر کہتا تھا لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے تک صفیں درست ہو جاتی تھیں (فتح الباری، ص ۹۵، ج ۲)

۶ ——— عن عبد اللہ ابن اوفیٰ رض قال کان بلال اذا قال قد قامت الصلوٰۃ نھض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ذکرہ فی مجمع الزوائد عن مسند عبد الرزاق)

حضرت عبد اللہ بن اوفیٰ رض نے فرمایا کہ حضرت بلال رض جب قد قامت الصلوٰۃ کہتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے تھے۔

مسئلہ زیر بحث کے متعلق یہ چھ احادیث ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل اس مسئلے کے متعلق بیان فرمایا ہے۔ ان میں پہلی حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت بلال رض کی عام عادت یہ تھی کہ حجرۂ شریفہ کی طرف نظر رکھتے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے کہ آپ باہر تشریف لے آئے تو اقامت شروع کرتے تھے، زرقانی نے شرح موطا میں اور قاضی عیاض نے شرح شفا میں اس حدیث کا یہی مفہوم لکھا ہے،

ان کے الفاظ یہ ہیں۔

ان بلالاً کان یراقب خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاول مایراہ یشرع فی الاقامۃ قبل ان یراہ غالب الناس ثم اذا راوہ قاموا فلا یقوم مقامہ حتی تعدل صفوفھم۔

(زرقانی علی المؤطا ص ۱۴۴، ج ۱)

حضرت بلال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکلنے کا انتظار کرتے تھے اور آپ پر نظر پڑتے ہی اقامت شروع کر دیتے تھے اور ابھی اکثر لوگوں کی نظروں کے سامنے آپ نہ آنے پاتے تھے۔ پھر جب لوگ آپ کو دیکھتے تھے تو کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ صفیں درست ہونے سے پہلے اپنی جگہ نہیں کھڑے ہوتے تھے۔

دوسری اور تیسری حدیث سے بھی یہ ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کی عام عادت یہ تھی کہ جب مؤذن تکبیر شروع کرے تو سب لوگ کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کر لیتے تھے امام نوویؒ نے شرح مسلم میں تیسری حدیث کے جملہ فعدلنا الصفوف پر فرمایا:

اشارۃ الی انہ ھذہ سنۃ معھودۃ عندھم وقد اجمع العلماء علی استحباب تعدیل الصفوف۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ ان کے نزدیک سنت ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ صفیں سیدھی کرنا مستحب ہے، چوتھی حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ حضرت بلال رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے باہر تشریف لانے سے پہلے ہی اقامت شروع کر دی اور حسب دستور سب صحابہ اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہو گئے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ دیر لگی تو آپ نے یہ ہدایت دی کہ میرے نکلنے سے پہلے کھڑے نہ ہوں، مقصد اس کا ظاہر ہے کہ لوگوں کو مشقت سے بچانے کے لئے فرمایا ہے اور اس حدیث کے الفاظ لاتقوموا حتی ترونی یعنی اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ میں گھر سے باہر آگیا ہوں۔ اس لفظ سے بھی یہ مفہوم ہوتا ہے کہ میرے باہر آجانے کے بعد کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں

(کانت الصلوٰۃ تقام لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیاخذ الناس مقامہم قبل خروجہ وتسویۃ

(مسند روایتہ ـ ص ۱۳۲ ج ۱)

پانچویں حدیث میں اس عادت اور عام تعامل یہ معلوم ہوا کہ حضرت بلالؓ اقامت اس وقت شروع کرتے، جب دیکھ لیتے کہ آپ حجرۂ شریفہ سے باہر تشریف لے آئے اور اقامت شروع ہوتے ہی حسب دستور صحابہ کرامؓ کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کر لیتے تھے۔

چھٹی حدیث سے ایک خاص صورت یہ بھی معلوم ہوئی کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے پہلے ہی مسجد میں تشریف فرما ہوتے تھے تو آپ اس وقت کھڑے ہوتے تھے، جب مؤذن قد قامت الصلوٰۃ پر پہنچتا تھا۔ ظاہر ہے کہ عام صحابہ کرامؓ بھی آپ کے ساتھ اسی وقت کھڑے ہوتے ہوں گے۔

ان سب روایات حدیث کے مجموعہ سے ایک بات قدر مشترک کے طور پر ثابت ہوئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے مسجد میں تشریف فرما نہ ہوتے بلکہ گھر میں سے تشریف لاتے تھے تو آپ کو دیکھتے ہی حضرت بلالؓ اقامت شروع کرتے اور سب صحابہ کرامؓ شروع اقامت سے کھڑے ہو کر تعدیل صفوف کرتے تھے۔ آپ نے اس کو کبھی منع نہیں فرمایا۔ البتہ گھر میں سے باہر تشریف لانے سے پہلے اقامت کہنے اور لوگوں کے کھڑے ہونے سے منع فرمایا ہے جو کہ از روئے شفقت تھی جس کو فقہاء کرام کی زبان میں مکروہ تنزیہی کہا جاتا ہے۔

تابع سنت خلفاء راشدین کا تعامل:

۱ ـــــ عن النعمان بن بشیرؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسوی صفوفنا اذا قمنا الی الصلوٰۃ فاذا استوینا کبّر

(رواہ ابو داؤد)

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفیں درست کرتے تھے اور جب ہم

سیدھے ہو جاتے تھے تو تکبیر تحریمہ کہتے تھے۔

۲ ـــــــ روی عن عمرؓ انہ کان یوکل رجالاً باقامۃ الصفوف فلا یکبر حتی یخبر ان الصفوف قد استوت (اخرجہ الترمذی و قال و روی عن علی و عثمان انھما کانا یتعاھدان ذلک) یہ دونوں حدیثیں نیل الاوطار کی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے صفیں درست کرنے کے لئے لوگ متعین کر دیئے تھے اور صفیں درست ہونے کی خبر جب تک نہ دی جاتی تکبیر تحریمہ نہیں کہتے تھے (امام ترمذی نے اس حدیث کی روایت کی ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بھی اس امر کا اہتمام کرتے تھے۔

ان میں پہلی حدیث سے خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور دوسری حدیث سے خلفاء راشدین میں سے حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کا یہ تعامل اور عام عادت معلوم ہوتی کہ وہ صفوں کی درستی کی خود بھی نگرانی کرتے تھے اور جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ صفیں سب درست ہو گئیں یعنی نہ صف کے درمیان میں کوئی جگہ چھوڑی گئی اور نہ آگے پیچھے رہے اُس وقت تکبیر نماز کی شروع فرماتے تھے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ جبھی ہو سکتا ہے جب لوگ شروع اقامت سے کھڑے ہو جائیں، جیسا کہ اوپر احادیث مرفوعہ سے صحابہ کرام کی عام عادت بھی ثابت ہو چکی ہے ورنہ اگر حی علی الصلوٰۃ یا حی علی الفلاح یا قد قامت الصلوٰۃ پر لوگ کھڑے ہوں تو اُس کے بعد یہ تسویہ صفوف کا انتظام کیا جائے تو یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ اقامت ختم ہو جانے کے کافی دیر بعد نماز شروع ہو، حالانکہ یہ باتفاق علماء مذموم ہے۔

مذاہب فقہاء

حضرات فقہاء نے اس مسئلہ کو بعنوان آداب الصلوٰۃ لکھا ہے اور آداب سے مراد وہ افعال ہیں جن کا چھوڑ دینا کسی کراہت یا عتاب کا موجب نہیں ہوتا، کرنا اس کا افضل ہے، نہ کرنے والے پر بھی نکیر کرنا جائز نہیں بلکہ نکیر کرنا بدعت ہے۔ درمختار میں ضمن

صفۃ الصلاۃ سے پہلے لکھا ہے:

ولها آداب تركه لا يوجب اساءة ولا عتابا كترك سنة الزوائد وفعله افضل۔

اور نماز کے کچھ آداب ہیں جن کے چھوڑنے سے گناہ نہیں ہوتا اور نہ ملامت ہوتی ہے مثلاً سنن زوائد کو ترک کرنا، ہاں اس کا کرنا افضل ہے۔ اس استحباب میں مذاہب آئمہ مجتہدین امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس طرح لکھا ہے:

مذاهب الشافعی رح وطائفة انه يستحب ان لا يقوم احد حتى يفرغ المؤذن من الاقامة ونقل القاضی عیاض عن مالكؒ وعامة العلماء انه يستحب ان يقوموا اذا اخذ المؤذن فی الاقامة وكان انسؓ يقوم اذا قال المؤذن قد قامت الصلوٰة وبه قال احمدؒ وقال ابو حنيفةؒ والكوفيون يقومون فی الصف اذا قال حی على الصلوٰة۔

(نووی شرح مسلم، ص ۲۲۱، ج ۱)

امام شافعیؒ اور ان کے علاوہ ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ مؤذن کے اقامت سے فارغ ہونے تک کسی کا کھڑا نہ ہونا مستحب ہے۔ قاضی عیاض نے امام مالکؒ اور عامۃ العلماء سے نقل کیا ہے کہ مؤذن کے اقامت شروع کرتے وقت لوگوں کا کھڑا ہوجانا مستحب ہے اور جب مؤذن قد قامت الصلاۃ کہتا تھا تو حضرت انسؓ کھڑے ہوجایا کرتے تھے۔ حضرت امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں اور حضرت امام ابوحنیفہؒ اور دیگر اہل کوفہ نے فرمایا ہے کہ حی علی الصلاۃ کہتے وقت صف میں کھڑے ہوجائیں۔

اور مذہب حنفیہ کی پوری تفصیل عالمگیری اور بدائع میں حسب ذیل ہے۔

ان كان المؤذن غير الامام وكان القوم مع الامام فی المسجد فانه يقوم الامام والمؤتم اذا قال حی على الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو الصحيح فاما اذا كان الامام خارج المسجد فان دخل من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذلك الصف واليه مال شمس الائمة السرخسی

وشیخ الاسلام خواہر زادہ وان کان الامام دخل المسجد من قدامهم یقومون کما رأوا الامام ولا یقومون ما لم یدخل المسجد (عالمگیری، ص ۳۵، ج ۱)

اگر مؤذن امام کے علاوہ ہو اور مقتدی حضرات امام کے ساتھ مسجد میں ہوں تو امام اور مقتدی حی علی الفلاح کہتے وقت کھڑے ہوجائیں ہمارے آئمہ ثلاثہ کا مذہب یہی ہے اور یہی قول صحیح ہے اور اگر امام خارج مسجد ہو تو دیکھنا چاہئے اگر امام صفوں کی طرف سے داخل ہو تو امام جس صف سے آگے بڑھتا جائے اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں۔ اسی طرف شمس الائمہ سرخسی اور شیخ الاسلام خواہر زادہ بھی گئے ہوئے ہیں اور اگر امام مقتدیوں کے سامنے سے داخل ہو تو امام کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہوجائیں اور جب تک مسجد میں داخل نہ ہو کھڑے نہ ہوں۔

اور بدائع میں اس تفصیل مذکور کی یہ حکمت بھی بیان فرمائی ہے کہ:

لان القیام لاجل الصلاۃ ولا یمکن اداؤها بدون الامام فلم یکن القیام مفیدا ثم ان دخل الامام من قدام الصفوف فکما راوہ قاموا لانه کما دخل المسجد قام مقام الامامۃ وان دخل من وراء الصفوف فالصحیح انه کلما جاوز صفا قام ذلك الصف لانه صار بحال لو اقتدوا به جاز فصار فی حقهم کانه اخذ مکانه۔

(بدائع: ص ۲۰۰، ج ۱)

اس لئے کہ قیام نماز ادا کرنے کے لئے ہے اور نماز ادا کرنا بدون امام کے ممکن نہیں لہذا قیام بغیر امام کے مفید نہ ہوگا، پھر اگر امام صفوں کے سامنے سے مسجد میں داخل ہو تو امام کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہوجائیں کیونکہ امام مسجد میں داخل ہوتے ہی امامت کی جگہ کھڑا ہوگیا اور اگر امام صفوں کے پیچھے سے داخل ہو تو صحیح قول کے مطابق امام جس صف سے آگے بڑھتا جائے اسی صف کے لوگ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ امام جس صف سے آگے بڑھ گیا ان کے حق میں ایسا ہوگیا کہ اگر اس کے پیچھے اقتدا

کریں تو کر سکتے ہیں۔ لہٰذا امام گویا ان کے حق میں اپنی جگہ پر آگیا۔

اور مذہب مالکیہ کی تشریح خود امام مالکؒ نے جو موطا میں ایک سوال کے جواب میں فرمائی وہ یہ ہے:

متی یجب القیام علی الناس حین تقام الصلوٰۃ قال مالک واما قیام الناس حین تقام الصلوٰۃ فانی لم اسمع فی ذلک بحد یقام له الا انی اری ذلک علی قدر طاقۃ الناس فان منهم الثقیل والخفیف ولا یستطیعون ان یکونوا کرجل واحد (موطاء امام مالک)

نماز شروع ہوتے وقت لوگوں پر قیام کب واجب ہے؟ حضرت امام مالک نے فرمایا کہ نماز شروع ہوتے وقت لوگوں کے قیام کے بارے میں کوئی حد متعین نہیں سنی کہ اس وقت کھڑے ہوں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگوں کی طاقت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ ان میں بعض بھاری ہیں اور بعض ہلکے ہوتے ہیں، اور سب ایک طرح کے نہیں ہو سکتے۔

مسئلہ زیر بحث کے متعلق ائمہ اربعہ کے مذاہب مذکورۃ الصدر عبارات میں آگئے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک تو اقامت ختم ہونے کے بعد کھڑا ہونا مستحب ہے۔ امام مالک کے نزدیک حسب روایت قاضی عیاض شروع اقامت ہی سے کھڑا ہونا مستحب ہے۔ البتہ موطا کی تشریح سے یہ معلوم ہوا کہ کسی خاص حد پر بھی قیام واجب نہیں بلکہ لوگوں کی سہولت پر چھوڑا جائے۔ بھاری بدن کمزور آدمی دیر میں اٹھتا ہے ہلکا آدمی جلدی اٹھ جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ معلوم ہوا کہ جب موذن قد قامت الصلوٰۃ کہے اس وقت کھڑا ہونا چاہیئے۔

امام اعظم ابو حنیفہ کے مذہب میں وہ تفصیل ہے جو عالمگیری اور بدائع کے حوالہ سے اوپر مذکور ہوئی کہ امام اور مقتدی اگر اقامت سے پہلے ہی مسجد میں موجود تھے تو صحیح روایت کے مطابق حی علی الفلاح پر اٹھ جانا چاہیئے اور اگر امام باہر سے آرہا ہے تو گر

وہ محراب کے کسی دروازے سے یا اگلی صف کے سامنے سے آئے تو جس وقت مقتدی امام کو دیکھیں اس وقت کھڑے ہو جائیں اور اگر وہ پچھلی صفوف کی طرف سے آرہا ہے تو جس صف سے گذرے وہ صف کھڑی ہوتی چلی جائے۔

ایک تنبیہ:

البحر الرائق میں حنفیہ کے مذہب کی تفصیل لکھتے ہوئے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ جب امام اقامت سے پہلے ہی مسجد میں موجود ہو تو حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہیئے اس کی علت یہ بیان فرمائی ہے:

والقیام حین قیل حی الفلاح لانہ امر یستجب المسارعۃ الیہ

(بحر ص ۲۳۱، ج ۱)

حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا اس لئے افضل ہے لفظ حی علی الفلاح کھڑے ہونے کا امر ہے اس لئے کھڑے ہونے کی طرف مسارعت کرنا چاہیئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے حی علی الفلاح پر یا قدقامت الصلوٰۃ پر کھڑے ہونے کو مستحب فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک استحباب کا مطلب یہ ہے کہ اس امر کے بعد بیٹھے رہنا خلافِ ادب ہے نہ یہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا خلافِ ادب ہے: کیوں کہ پہلے کھڑے ہونے میں تو اور بھی زیادہ مسارعت پائی جاتی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ جن حضرات ائمہ نے حی علی الصلوٰۃ پر کھڑے ہونے کو مستحب فرمایا ہے اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا استحباب کے خلاف ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد بیٹھے رہنا خلافِ ادب ہے کیونکہ وہ مسارعت الی الطاعت کے خلاف ہے۔

اس میں غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ مذاہب ائمہ اربعہ میں دو باتیں متفق علیہ ہیں، ایک یہ ہے کہ یہ سب اختلاف محض افضلیت و اولویت کا ہے۔ اس میں کوئی جانب ناجائز یا مکروہ نہیں اور کسی کو کسی پر نکیر و اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ اسی لئے مذاہب اربعہ کے متبعین میں کبھی اس پر کوئی جھگڑا نہیں سنا گیا۔

دوسرے یہ کہ باجماع صحابہ وتابعین واتفاق آئمہ اربعہ صفوں کی تعدیل ودرستی واجب ہے جو نماز شروع ہونے سے پہلے مکمل ہوجانا چاہیئے اور یہ اس صورت میں ہوسکتی ہے جب کہ عام آدمی شروع اقامت سے کھڑے ہوجائیں، بقول امام مالکؒ کوئی کمزور، ضعیف بعد میں بھی کھڑا ہو تو مضائقہ نہیں۔

جیسا کہ خلفاء راشدین اور عام صحابہ کرام کا تعامل اس کے مطابق اوپر معلوم ہوچکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت امام اور مقتدی سب اقامت سے پہلے مسجد میں موجود ہوں تو امام اعظم ابوحنیفہ امام احمد بن حنبل کے نزدیک حی علی الفلاح اور قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا ہونا اور امام شافعی کے نزدیک آخر اقامت پر کھڑے ہونا افضل ہے اور امام مالک کے نزدیک شروع ہی سے کھڑا ہونا افضل ہے اور خلفاء راشدین اور عام صحابہ کرام کا تعامل بھی اس پر شاہد ہے اور اسی تعامل کی بناء پر حضرت سعید بن مسیب کا مذہب یہ ہے کہ شروع اقامت ہی سے سب کو کھڑا ہوجانا صرف مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔

مگر یہ امت میں کسی کا مذہب نہیں کہ امام اقامت کے وقت باہر سے آکر مصلیٰ پر بیٹھ جائے اور بیٹھنے کو ضروری سمجھے کھڑے ہونے والے مقتدیوں کو کھڑے ہونے سے روکے۔ جو کھڑا ہو اس کو برا سمجھے، پہلے کھڑے ہونے کو مکروہ اور برا سمجھنا اور برا کہنا ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مذہب نہیں۔ مذہب حنفیہ کی مستند روایات بحوالہ عالمگیری و بدائع اوپر لکھ چکے ہیں جن کو شمس الائمہ سرخسی اور دوسرے آئمہ حنفیہ نے اختیار کیا ہے۔ حنفیہ کی کتابوں کے متون و شروح اور فتویٰ کی کتابوں میں بجز ایک مضمرات کی روایت کے جس کو طحاوی نے نقل کیا ہے۔ کسی نے پہلے کھڑے ہونے کو مکروہ نہیں کہا اور کیسے کہہ سکتے تھے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور عام صحابہ وتابعین کے تعامل سے ابتداءِ اقامت میں کھڑا ہونا ثابت ہے اور آئمہ حنفیہ میں کسی نے اس کو مکروہ نہیں کہا۔

اب رہا مضمرات کی روایت کا معاملہ تو اُس روایت کے الفاظ طحطاوی نے یہ نقل کئے ہیں:

واذا اخذ المؤذن فی الاقامة ودخل رجل المسجد فانه یقعد ولا ینتظر قائما کما فی مضمرات قہستانی

جب مؤذن اقامت شروع کرے اس حالت میں کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا تو وہ شخص بیٹھ جائے، کھڑے ہو کر انتظار نہ کرے۔

اس روایت کا صاف مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اُس صورت سے متعلق ہے جب کہ امام کے آنے سے پہلے اقامت شروع کر دی ہو جس کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے کما مر اور اس کا لفظ لا ینتظر اس مفہوم کے قریب ہے کیوں کہ انتظار سے مراد انتظار امام ہے اس صورت میں یہ روایت تمام روایات حنفیہ اور تمام کتب حنفیہ کے مطابق بھی ہو جاتی ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت صحابہ کے بھی خلاف نہیں اور اگر اس کا مفہوم یہ لیا جائے کہ امام کے موجود ہونے پر اقامت کہی جا رہی ہو تو باہر سے آنے والے کے لئے کھڑا ہونا مکروہ ہے تو یہ خود مذہب حنفیہ کی تمام مستند روایات اور کتب حنفیہ کے متون و شروح کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی قابلِ ترک ہوگی اور خلافِ سنت ہونے کی وجہ سے بھی اور جب کہ مضمرات کی اس روایت کا ایسا مفہوم بے تکلف بن سکتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ البتہ طحطاوی نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا جو سب متون شروح حنفیہ سے مختلف اور سنتِ صحابہ کے معارض ہے علامہ طحطاوی کی جلالت قدر اور علمی عظمت اپنی جگہ ہے مگر مضمرات کی روایت کا یہ مفہوم قرار دینا خود اس روایت کے سقوط کا موجب بنتا ہے۔

اور خود علامہ طحطاوی نے درمختار کی شرح میں وہی لکھا ہے جو اوپر عالمگیری اور بدائع کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ امام باہر سے اگر اگلی صف کی طرف سے آئے تو اس کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہو جائیں اور پچھلی صفوف کی طرف سے آئے تو جس

صف سے گذرے وہ کھڑی ہوتی جائے، البتہ درمختار میں ایک اور مسئلہ یہ لکھا ہے کہ اگر امام خود ہی اقامت کرنے لگے تو مقتدی اُس وقت تک نہ کھڑے ہوں جب تک کہ اقامت پوری نہ ہوجائے۔ درمختار نے یہ مسئلہ ظہیریہ کے حوالے سے بیان کیا اور اس خاص مسئلہ کے تحت طحطاوی نے لکھا ہے۔

وربمایؤخذ منہ کراھۃ تقدیم الوقوف فی البحث السابق

(طحطاوی علی الدر ص ۲۴۵، ج ۱)

بسا اوقات لوگ اس سے تقدیم وقوف کی کراہت کا مفہوم نکالتے ہیں۔

اس کے الفاظ ربما یؤخذ سے خود اس کراہت کے مفہوم کے ضعف کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس مفہوم کو طحطاوی نے بھی اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا کہ بعض لوگ اس سے یہ مفہوم مراد لیتے ہیں۔

حاصل یہ کہ تمام کتب حنفیہ میں سے ایک روایت مضمرات قہستانی کے الفاظ مشکوک ہیں اُن کا وہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے جو جمہور سلف اور تمام کتب حنفیہ کی تصریحات کے مطابق ہے اور دوسرا مفہوم کراہت تقدیم بھی لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر روایت مضمرات کا یہی مفہوم لیا جائے تو وہ ائمہ مذہب کی تصریحات اور تمام متون وشروح حنفیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے قابل ترک اترتی ہے۔

خلاصۂ کلام سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پھر خلفاء راشدین مذکورالصدر تصریحات اور جمہور صحابہ وتابعین کا تعامل اس پر شاہد ہے کہ ان حضرات کا معمول و دستور یہی تھا کہ امام جب مسجد میں آجائے تو اول اقامت ہی سے سب لوگ کھڑے ہو کر صفوف کی درستی کریں اور جس صورت میں امام پہلے سے محراب کے قریب بیٹھا ہو اس میں بھی حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا بھی بایں معنی ہے کہ اس کے بعد بیٹھے رہنا خلافِ ادب ہے کیونکہ مسارعت الی الطاعت کے خلاف ہے یہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا خلافِ ادب ہے کیوں کہ اس میں

تو مسارعت اور زیادہ ہے اور یہ کہ جو طریقہ بعض مسجدوں میں اختیار کیا جاتا ہے کہ اقامت کے وقت امام باہر سے یا مسجد کے کسی گوشہ سے چل کر آئے اور آکر مصلّے پر بیٹھ جائے اور اس بیٹھنے کو اس درجہ ضروری سمجھے کہ جو لوگ پہلے کھڑے ہوں اُن کو بھی بیٹھ جانے کی تاکید کرے جو نہ بیٹھے اُس پر طعن کرے۔ یہ امت میں کسی امام و فقیہ کا مذہب نہیں خالص بدعت ہے۔

تنبیہ:

یہ تفصیل مسئلے کی اصل حقیقت واضح کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اور آخری طریقہ جو جمہور آئمہ فقہاء کے خلاف ہے وہ اگرچہ مذموم ہے مگر مسلمانوں میں باہمی جھگڑا اور جنگ وجدال اس سے زیادہ مذموم و منحوس ہے اس لئے اس پر بھی کسی سے نکیر مناسب نہیں۔ ہمدردی خیر خواہی اور نرمی کے ساتھ مسئلے کی حقیقت ایسے لوگوں کو بتلا دیں جن سے امید قبول کرنے کی ہو ورنہ سکوت بہتر ہے خود اپنا عمل سنّت کے مطابق رکھے دوسروں سے تعرض نہ کرے۔

واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم
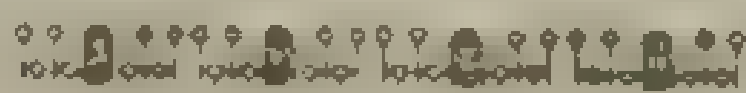
رفع التضاد
عن
احكام الضاد

حرفِ ضاد کا صحیح مخرج

اور

اس کے احکام

مقام تالیف ———— دیوبند

تاریخ تالیف ———— ۲۰ جمادی الاولی ۱۳۵۱ھ

مدت تالیف ———— پانچ گھنٹے

اشاعت اوّل ———— کتب خانہ اشرفیہ راشد کمپنی دیوبند

"حرفِ ضاد کا مخرج ظاء کے مشابہ ہے یا
دال کے؟ نیز جن لوگوں سے حرفِ ضاد صحیح طور
پر ادا نہیں ہوتا ان کی نمازوں کا کیا حکم ہے؟
ان مسائل کی تحقیق اس مقالہ کا موضوع ہے
اور اس میں دوسرے اکابر علماء کے فتاوی
بھی شامل ہیں"

مفتی بغداد علامہ سیّد محمود آلوسی کا فتویٰ
متعلقہ حرف ضاد

علامہ موصوف نے اپنی تفسیر روح المعانی میں آیۂ کریمہ وما ھو علی الغیب بضنین کے تحت میں اس مسئلہ پر ایک جامع و مختصر کلام کے ساتھ اُسی مضمون پر فتویٰ دیا ہے جو اس رسالہ کا لب لباب ہے اور بعض الفاظ اُن کے یہ ہیں :۔

وَالْفَرْقُ بَيْنَ الضَّادِ وَالظَّاءِ مَخْرَجاً اَنَّ الضَّادَ مَخْرَجُهَا مِنْ اَصْلِ حَافَةِ اللِّسَانِ وَمَا يَلِيْهَا مِنَ الْاَضْرَاسِ مِنْ يَمِيْنِ اللِّسَانِ اَوْ يَسَارِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ يَتَمَكَّنُ مِنْ اِخْرَاجِهَا مِنْهُمَا وَالظَّاءُ مَخْرَجُهَا مِنْ طَرَفِ اللِّسَانِ وَاُصُوْلِ الثَّنَايَا الْعُلْيَا وَاخْتَلَفُوْا فِيْ اِبْدَالِ اَحَدِهِمَا بِالْاُخْرٰى هَلْ يَمْتَنِعُ وَتَفْسُدُ بِهِ الصَّلٰوةُ اَمْ لَا فَقِيْلَ تَفْسُدُ قِيَاساً وَنَقَلَهٗ فِي الْمُحِيْطِ الْبُرْهَانِيْ عَنْ عَامَّةِ الْمَشَائِخِ وَنَقَلَهٗ فِي الْخُلَاصَةِ عَنْ اَبِيْ حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ وَقِيْلَ لَا تَفْسُدُ اِسْتِحْسَاناً وَنَقَلَهٗ فِيْهِ عَنْ عَامَّةِ الْمَشَائِخِ

ضاد اور ظاء میں مخرج کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ ضاد کا مخرج اصل حافہ لسان اور اس کے متصل کی داڑھیں ہیں خواہ زبان کی داہنی جانب سے نکالا جائے یا بائیں جانب سے اور بعض لوگ دونوں جانب سے نکالنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اور ظاء کا مخرج طرف لسان اور ثنایا عُلیا کی جڑیں ہیں اور علماء کا ان کے آپس میں ایک دوسرے سے بدل دینے کے بارہ میں اختلاف ہے کہ کیا یہ ابدال ناجائز اور مفسد نماز ہے یا نہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے اور یہی قیاس ہے اور اسی کو محیط برہانی میں عامہ مشائخ سے نقل کیا ہے اور اسی کو خلاصہ میں امام ابوحنیفہ رح اور امام محمد رح سے نقل کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی اور یہی استحسان ہے اور اسی کو اُس میں عامہ مشائخ سے نقل کیا ہے مثل ابو مطیع بلخی اور محمد بن سلمۃ اور ایک جماعت

كَأَبِيْ مُطِيْعٍ الْبَلْخِيِّ وَمُحَمَّدِ بْنِ سَلَمَةَ وَقَالَ جَمْعٌ إِذَا أَمْكَنَ الْفَرْقُ بَيْنَهُمَا فَتَعَمَّدَ ذٰلِكَ وَكَانَ مِمَّا يُقْرَأُ بِهٖ كَمَا هٰهُنَا وَغَيَّرَ الْمَعْنٰى فَسَدَتْ صَلَاتُهٗ وَإِلَّا فَلَا لِعُسْرِ التَّمْيِيْزِ بَيْنَهُمَا خُصُوْصًا عَلَى الْعَجَمِ وَقَدْ أَسْلَمَ كَثِيْرٌ مِنْهُمْ فِي الصَّدْرِ الْأَوَّلِ وَلَمْ يُنْقَلْ عَنْهُمْ حَثُّهُمْ عَلَى الْفَرْقِ وَتَعْلِيْمُهٗ مِنَ الصَّحَابَةِ وَلَوْ كَانَ لَازِمًا لَفَعَلُوْهُ وَنُقِلَ هٰذَا هُوَ الَّذِيْ يَنْبَغِيْ أَنْ يُعَوَّلَ عَلَيْهِ وَيُفْتٰى بِهٖ وَقَدْ جَمَعَ بَعْضُهُمُ الْأَلْفَاظَ الَّتِيْ لَا يَخْتَلِفُ مَعْنَاهَا ضَادًا وَظَاءً فِيْ رِسَالَةٍ صَغِيْرَةٍ وَلَقَدْ أَحْسَنَ بِذٰلِكَ فَلْيُرَاجَعْ فَإِنَّهٗ مُهِمٌّ۔ (روح المعانی ص ج ۱)

نے یہ کہا ہے کہ جب دونوں میں فرق کرنے پر قدرت ہو اور پھر عمداً غلط پڑھے اور کسی قرأت میں یہ تبدیل منقول نہ ہو جیسے ولا الضالین اور غیر المغضوب علیہم میں ہے اور معنی بھی بدل جائیں تو ان تمام شرطوں کے ساتھ فساد نماز کا حکم کیا جائے گا ورنہ نہیں کیونکہ دونوں میں تمیز دشوار ہے خصوصاً اہل عجم پر اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سے اہل عجم قرن اول میں مسلمان ہوئے اور کہیں منقول نہیں کہ صحابہ و تابعین نے اُن کو فرق کرنے کی تحریض و تاکید کی ہو یا اُس کے تعلیم حاصل کرنے کا امر کیا ہو اور اگر اہل عجم پر یہ فرق اور اُس کی تعلیم واجب ہوتی تو وہ صحابہ ضرور اس کی تاکید کرتے اور اُن سے اس کی نقل ہم تک پہنچتی اور یہی وہ چیز ہے کہ جس پر اعتماد کرنا اور فتویٰ دینا مناسب ہے۔

اور بعض لوگوں نے ایک مستقل رسالہ میں ان الفاظ کو جمع کر دیا ہے جن کے معنی ضاد و ظاء ہو کے آپس میں بدلنے سے بدلتے نہیں اور یہ رسالہ بہت اچھا ہے اس کو دیکھنا چاہیے۔

(روح المعانی ص ۹۱ ج ۱)

رَفعُ التَّضَادْ
عن
اَحکَامِ الضَّادْ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد

اہلِ عجم عربی حروف کے ادا کرنے میں جو غلطیاں کرتے ہیں اُن میں سب سے زیادہ اشکال کی چیز حرف ضاد ہے کیونکہ اول تو حسب تصریح علماء قرارت و تجوید اس حرف کا ادا کرنا فی نفسہٖ مشکل ہے۔ مشاق اور ماہر قاریوں کو بھی اس میں مشقت کرنی پڑتی ہے عوام کا تو پوچھنا کیا (صرح بہ المرعشی وسیاتی عنقریب) پھر یہ حرف عام اتنا ہے کہ اس کے بغیر کوئی نماز ادا نہیں ہو سکتی سورہ فاتحہ جو واجبات صلوٰۃ میں ہے اُس میں ہی دو جگہ واقع ہے اس لئے حرف ضاد کے تلفظ میں زمانہ طویل سے عجم و عرب میں اختلاف چلا جاتا ہے تقریباً سیکڑوں رسائل و اشتہارات وغیرہ اس مسئلہ کے متعلق شائع ہوئے ہوں گے اور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں اس لئے ضرورت نہ تھی کہ اس مسئلہ پر کوئی رسالہ لکھا جائے۔ لیکن جب دار العلوم دیوبند کے دارالافتاء کی خدمت اس ناکارہ کے سپرد کر دی گئی اور اس مسئلہ میں بھی سوالات کی کثرت ہوئی تو مناسب معلوم ہوا کہ ایک مختصر رسالہ جو افراط و تفریط سے خالی ہو اس موضوع میں لکھ دیا جائے جس میں اکابر دار العلوم کی رائے اس مسئلہ کے متعلق فقہی روایات کی تائید کے ساتھ واضح کر دی جائے اس لئے یہ چند ورق سیاہ کئے گئے ہیں خدا کرے کہ طالبین حق کے لئے اطمینان کا اور خواہ مخواہ جھگڑنے والوں کے لئے اسکات کا سبب بن جائے اور احقر کے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے مفید ہو وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لوگ اکثر دیار میں حرف

ضاد کی صوت میں اختلاف کرتے ہیں۔ بعض اس کو مشتبہ الصوت بظاء کہتے ہیں گو فرق ضرور ہے بعض صوت متعارف یعنی دُواد کو صحیح کہتے ہیں۔ ان دونوں میں کون صحیح ہے؟ نیز جو شخص حرف ضاد کو صوت متعارف (دُواد) کے ساتھ پڑھے تو اس کی نماز جائز ہوگی یا فاسد؟

الجواب مسئلہ ضاد کے اختلافات دو قسم پر منقسم ہیں۔ اوّل یہ کہ حرف ضاد کی صوت مشابہ ظاء ہے یا دال مہملہ کے مشابہ ہے۔ دوسرے یہ کہ جو شخص بجائے ضاد کے نماز میں ظاء معجمہ یا دال مہملہ پڑھے اس کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں۔ دونوں امر کے متعلق مختصراً عرض ہے کہ امر اوّل فن تجوید و قراءت کا مسئلہ ہے جس سے احقر زیادہ واقف نہیں پوری تحقیق اس کی کسی صاحب فن سے کرلی جائے اور جس قدر مشہور و معروف اور عام کتب فن میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ جمہور قراء و فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مخرج ضاد حافہ لسان اور اس کی متصل کی داڑھیں ہیں اور اس کی آواز ظاء معجمہ کی آواز کے مشابہ ہے دال مہملہ کے مشابہ نہیں جیسا کہ کتب فقہ و قراءت میں اس کی بے شمار تصریحات موجود ہیں منجملہ ان کے شیخ مکی نصر اپنے رسالہ نہایۃ القول المفید فی علم التجوید ص ۵۸ مطبوعہ مصر میں فرماتے ہیں:-

انَّ الضَّادَ وَالظَّاءَ الْمُعْجَمَتَانِ اِشْتَرَكَتَا جَهْرًا وَرَخَاوَةً وَاسْتِعْلَاءً والطباقا وافترقتا مَخْرَجًا وانفردت الضاد بالاستطالة و فی المَرعشی نَقْلًا عن الرِعَايَةِ مَا مُخْتَصَره ان هٰذَيْنِ الحرفين اَعْنِى الضَّادَ والظَّاءَ مُتَشَابِهَانِ فِى السَّمعِ وَلَا تَفْتَرِقِ الضَّادُ اِلَّا بِاخْتِلَافِ الْمَخْرَجِ وَالِاسْتِطَالَةِ

ضاد معجمہ اور ظاء معجمہ صفت جہر و رخوت و استعلاء و اطباق میں دونوں شریک ہیں اور مخرج کے اعتبار سے دونوں جدا جدا ہیں اور ایک صفت یعنی استطالت میں ضاد ممتاز ہے ظاء میں یہ صفت نہیں، اور مرعشی میں رعایہ سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں حرف یعنی ضاد اور ظاء سننے میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق اس کے سوا نہیں کہ ایک تو مخرج ان دونوں کا الگ الگ ہے اور دوسرے ضاد میں صفت استطالت

فِي الضَّادِ وَلَوْلَاهُمَا لَكَانَتْ إِحْدَاهُمَا عَيْنَ الْأُخْرٰى فَالضَّادُ أَعْظَمُ كُلْفَةً وَأَشَقُّ عَلَى الْقَارِئِ مِنَ الظَّاءِ وَحَتّٰى لَوْ قَصَّرَ الْقَارِئُ فِي تَجْوِيدِ الظَّاءِ جَعَلَهَا ضَادًا انتهى۔

ہے۔ جو ظاء میں نہیں اور اگر یہ دو باتیں فارق نہ ہوتیں تو دونوں حرف ایک ہی ہو جاتے پس ضاد بہ نسبت ظاء کے قاری پر زیادہ مشکل اور شاق ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر قاری حرف ظاء کی تجوید میں ذرا کوتاہی کرتا ہے تو وہ ضاد بن جاتا ہے۔

اور امر دوم کے متعلق خود فتویٰ تو یہ ہے کہ جو شخص باوجود قادر بالفعل ہونے کے ضاد کا مخرج صحیح جاننے کے بے پروائی سے یا جان بوجھ کر حرف ضاد کے بجائے ظاء خالص پڑھے یا دال پڑھے خواہ تفخیم کے ساتھ یا بلا تفخیم کے تو دونوں صورتوں میں جس جگہ معنی میں تغیر فاحش ہو جائے گا نماز فاسد ہو جائے گی لیکن عوام جو مخارج وصفات سے واقف نہیں اور بوجہ عدم تمیز و ناواقفیت کے ضاد کے بجائے ظاء یا دال پڑھتے ہیں ان کی نماز بلا کسی تفصیل کے مفتیٰ بہ صحیح و درست ہو جاتی ہے۔

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس بارہ میں فقہائے متقدمین و متاخرین کے اقوال مختلف ہیں۔ متقدمین کا مذہب تو یہ ہے اگر قرآن میں کوئی حرف دوسرے حرف سے بدل جائے خواہ ضاد ظاء سے بدلے یا دال سے یا اس کا عکس اور اسی طرح دوسرے حرف میں اگر تبدیلی واقع ہو جائے تو فساد یا عدم فساد نماز کے متعلق یہ ضابطہ ہے۔

ضابطۂ متقدمین

اگر ان دونوں حرفوں کا مخرج ایک یا متقارب ہو اور ایک حرف کا دوسرے سے بدل لینا بقواعد عربیت جائز بھی ہو۔ یعنی بدلنے سے معنی مراد میں زیادہ تغیر فاحش نہ پیدا ہوتا ہو تو اُن کے باہمی تبدیل سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ خواہ کوئی حرف ہو اور کسی طرح بدل جائے مثلاً قاف اور کاف اور سین اور صاد وغیرہ۔ صَرَّحَ بِهٖ فِي شَرْحِ

المنیۃ الکبیر۔ ص ۴۴۸۔

وَلَفْظُہٗ وَاِنْ بَدَّلَ حَرْفًا مَکَانَ حَرْفٍ کَانَ الْاَصْلُ فِیْہِ اَنَّہٗ اِنْ کَانَ بَیْنَھُمَا قُرْبُ الْمَخْرَجِ اَوْکَانَ مِنْ مَخْرَجٍ واحدٍ لَا تفسد صَلٰوتُہٗ (منیۃ) وزاد فی المحیط قَیْدًا لَابُدَّ مِنْہُ وَھُوَ اَنْ یَجُوْزَ ابدال احدھما مِنَ الْاٰخَرِ وَ اِلَّا فَھُوَ مُنْتَقِضٌ بِمَسَائِلَ کَثِیْرَۃٍ (کبیری شرح منیہ ص ۴۴۸)

اور اگر ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدل دیا تو ضابطہ اس بارہ میں یہ ہے کہ اگر ان دونوں حرفوں میں قرب مخرج ہو یا دونوں ایک ہی مخرج سے ہوں تو نماز فاسد نہ ہوگی اور محیط میں اس کے ساتھ ایک قید کا اضافہ کیا ہے جس کی سخت ضرورت ہے وہ یہ کہ ان دونوں میں سے ایک کا دوسرے سے بدلنا جائز بھی ہو ورنہ اگر یہ قید نہ لگائی جائے تو یہ ضابطہ بہت سے مسائل احکام میں ٹوٹ جائے گا (کبیری شرح منیہ ص ۴۴۸)

اور جہاں یہ صورت نہ ہو بلکہ اس کی تبدیل سے معنی میں تغیر فاحش پیدا ہو جائے وہاں نماز فاسد ہو جائے گی۔

اور مسئلہ زیر بحث یعنی ضاد کی تبدیل ظاء سے یا دال سے یہ دونوں اسی قسم میں داخل ہیں۔ تو متقدمین کے قول کے موافق جب کوئی شخص ضاد کو ظاء خالص سے بدل دے یا دال پڑھے دونوں صورتوں میں معنی پر غور کیا جائے گا۔ اگر تغیر فاحش پیدا ہو گیا کہ مراد قرآن بالکل بدل گئی تو فساد نماز کا حکم کیا جائے گا ورنہ نہیں شرح منیہ میں ہے:۔

اَمَّا اِذَا قَرَأَ مَکَانَ الذَّالِ الْمُعْجَمَۃِ ظَاءً مُعْجَمَۃً اَوْقَرَأَ الظَّاءَ الْمُعْجَمَۃَ مَکَانَ الضَّادِ الْمُعْجَمَۃِ اَوْعَلَی الْقَلْبِ (الی قولہ) تَفْسُدُ صَلٰوتُہٗ وَعَلَیْہِ اکثر الائمۃ للتغیر الفاحش

لیکن اگر ذال معجمہ کی جگہ ظاء معجمہ یا ضاد معجمہ کے بجائے ظاء معجمہ پڑھ دی یا اس کے برعکس کر دیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اکثر ائمہ کا یہی مذہب ہے بوجہ تغیر فاحش کے نیز شرح منیہ میں ہے کہ اگر خضرًا کو بجائے ضاد کے دال سے پڑھ دیا تو نماز فاسد ہو

ابعید (کبیری مجتبائی ص ۴۴۸) وَمِنْهَا خضرًا بِالدَّالِ المُهْمَلَةِ مَكَانَ الضَّادِ المُعْجَمَةِ تَفْسُدُ لِبُعْدِ الفَاحِشِ۔

جائے گی بوجہ بعد فاحش کے۔

(کبیری شرح منیہ ص ۴۴۸)

بحیرت شرح منیہ میں بحو رتی خاں قاعدہ مذکورہ کے بہت سے جزئیات نقل کرکے ثابت کیا کہ جس جگہ ضاد کو ظاد سے یا دال وغیرہ سے بدلنے میں تغیر فاحش معنی میں پیدا ہو گیا وہاں فسادِ صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ورنہ نہیں۔

مثلاً وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا میں ظاء سے بدل کر ظَبْحًا پڑھے یا غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ کے بجائے غَيْرِ الْمَغْظُوبِ ظاء پڑھے ضَعْهَا هَضِيمٌ کے بجائے هَظِيمٌ بالظاء پڑھے۔ فَتَرْضٰى میں ظاء سے بدل کر تَرْظٰى پڑھے۔ ضعف الحیوٰۃ میں ظعف بالظاء پڑھے۔ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ میں فَرَظَ بالظاء پڑھے۔ ان سب صورتوں میں امام الفقہ والفتاوی قاضیخان نے فسادِ نماز کا حکم دیا ہے۔

(صرح به فی شرح المنیة صفحہ ۴۴۸)

نیز فتاوی قاضی خاں میں ہے:۔

وَكَذَا لَوْ قَرَأَ غَيْرِ الْمَغْظُوبِ بِالظَّاءِ اَوْ بِالذَّالِ تَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ وَلَوْ قَرَاَ اَلظَّالِّيْنَ بِالظَّاءِ اَوْ بِالذَّالِ لَا تَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ وَلَوْ قَرَاَهٗ اَلدَّالِّيْنَ بِالدَّالِ تَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ (قاضیخان ص ۷۰ جلد ۱)

مذہب متقدمین کے موافق الثغ یا غیر قاری کا حکم

اور جو شخص صحیح لفظ نکالنے پر قادر نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ زبان میں کوئی نقص ہے جس کو الثغ کہا جاتا ہے یا اس وجہ سے کہ بوجہ ناواقفیت غلط پڑھتے پڑھتے وہی زبان پر اس طرح چڑھ گیا کہ اب اس کے خلاف نکالنے کی قدرت نہ رہی جیسے اکثر عورتوں اور بوڑھوں کو پیش آتا ہے اس کا حکم متقدمین کے مذہب پر یہ ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ واجب ہے کہ دن رات ان حرفوں کی تصحیح کی کوشش کرتے رہیں جب تک یہ کوشش جاری رکھیں گے ان کی نماز صحیح قرار دی جائیگی۔

(اگرچہ حرف غلط ہی نکلے لیکن جب کوشش کرنا چھوڑ دیں تو نماز فاسد قرار دی جائے گی۔

وَكَذٰلِكَ بَيَانُهٗ فِيْ شَرْحِ الْمُنْيَةِ وَقَالَ صَاحِبُ الْمُحِيْطِ وَالْمُخْتَارُ لِلْفَتْوٰى فِيْ جِنْسِ هٰذِهِ الْمَسَائِلِ اَنَّهٗ اِنْ كَانَ يَجْتَهِدُ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ فِي التَّصْحِيْحِ وَلَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ فَصَلٰوتُهٗ جَائِزَةٌ وَاِنْ تَرَكَ جَهْدَهٗ فَصَلٰوتُهٗ فَاسِدَةٌ (الی قوله) وَذَكَرَ فِيْ فَتَاوٰى الْحُجَّةِ مَا يُوَافِقُ قَوْلَ صَاحِبِ الْمُحِيْطِ فَاِنَّهٗ قَالَ مَا يَجْرِيْ عَلٰى اَلْسِنَةِ النِّسَاءِ وَالْاَرِقَّاءِ الْجُهَلَاءِ الْكَثِيْرِ مِنْ اَوَّلِ الصَّلٰوةِ اِلٰى اٰخِرِهَا كَالشَّيْتَانِ وَالْاَلِيْمِيْنِ وَاِيَّاكَ تَابُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَئِيْنُ اَلسِّرَاطُ اَنَامْتَ فَعَلٰى جَوَابِ الْفَتَاوٰى الْحُسَامِيَّةِ مَا دَامُوْا فِي التَّصْحِيْحِ وَالتَّعَلُّمِ وَالْاِصْلَاحِ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَلَا يُطَاوِعُهُمْ لِسَانُهُمْ جَازَتْ صَلٰوتُهُمْ كَسَائِرِ الشُّرُوْطِ اِذَا عَجَزَ عَنِ الْوُضُوْءِ وَتَطْهِيْرِ الثَّوْبِ وَالْقِيَامِ (الی قوله) مَا اِذَا تَرَكُوْا

اور یہ اس لئے کہ شرح منیہ میں بحوالہ محیط مذکور ہے کہ مختار للفتوی اس جیسے مسائل میں یہ ہے کہ اگر یہ شخص شب و روز تصحیح حروف کی کوشش میں لگا رہے۔ اس کے باوجود بھی قدرت نہ ہو تو اس کی نماز جائز ہے اور اگر کوشش چھوڑ بیٹھے تو اس کی نماز (بصورت حرف مغیر معنی ہونے کی صورت میں) فاسد ہے (اس کے بعد کہا، اور فتاوی حجۃ میں بھی محیط کے موافق ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس میں کہا ہے کہ عورتوں اور غلاموں (یا خدمت پیشہ جاہل لوگوں) کی زبان پر جو غلط حروف چڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور اول نماز سے آخر تک بہت سے غلط ان سے سرزد ہوتے ہیں جیسے شیتان۔ الیمین۔ ایاک نابد۔ ایاک نستئین۔ السراط۔ انامت تو ان سب اغلاط کا حکم فتاوی حسامیہ کے موافق یہ ہے کہ یہ لوگ جب تک تصحیح حروف اور اصلاح و تعلم میں رات دن کوشش کرتے رہیں اور اس پر بھی ان کی زبان سے صحیح حروف نہ نکلیں تو ان کی نماز جائز ہے جیسے تمام شروط نماز کا حکم ہے کہ جب ان سے عاجز ہو تو معاف ہو جاتی ہیں جیسے وضو یا کپڑے کی پاکی یا قیام سے عاجز ہونے کی صورت میں فقہا نے کہا ہے (پھر فرمایا)

تشدیده والجهد فسدت صلوته

لیکن اگر وہ تصحیح اور کوشش کو چھوڑ دیں تو ان کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

(کبیری ص ۴۵۲ و ۴۵۳)

اور یہ سب بیان مذکور مذہب فقہاء متقدمین کا ہے جیسا کہ شارح منیہ نے اس بیان کو نقل کر کے فرمایا ہے۔ (وهذا ابنٔ علی مختار المتقدمین ص ۴۵۳)

ضابطۂ متاخرین

اور فقہائے متاخرین نے جب اس مسئلہ میں عموم بلوی اور سہولت کی سخت حاجت کا مشاہدہ کیا اول تو عرب میں بھی بوجہ اختلاط عجم اب اُن چیزوں کی رعایت کا حقہ نہیں رہی پھر عجم تو اس سے عموماً ناواقف ہیں مذہب متقدمین کی بناء پر تو شاید کسی کسی کی ہی نماز صحیح رہے۔ عوام تو درکنار خواص اور مجودین کی نماز بھی صحیح نہیں رہ سکتی۔ بیچارے عوام تو کس حساب میں ہیں۔

اس لئے انھوں نے اور شرعیہ کی حدود میں رہ کر جس قدر گنجائش سہولت کی نکل سکتی تھی۔ اس کے موافق فتوی دیا اور مسئلہ زیر بحث کے متعلق یہ ضابطہ قرار دیدیا کہ:

حروف کی باہمی تبدیل مطلقاً مفسد نماز نہیں خواہ، اتحاد و قرب مخرج ہو یا نہ ہو اور معنی میں تغیر فحش ہو یا نہ ہو جیسے کہ شامی بحث زلۃ القاری میں بحوالہ تاتارخانیہ نقل کیا ہے۔

وفي التتارخانية عن الحاوي حكي عن الصفار انه كان يقول الخطأ اذا دخل في الحروف لا تفسد لان فيه بلوى عامة الناس لانهم لا يقيمون الحروف الا بمشقة وفيها اذا

اور تاتارخانیہ میں بحوالہ حاوی صفار سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ غلطی جب حروف میں واقع ہو تو نماز فاسد نہیں ہوتی اس لئے کہ اس میں عام لوگوں کا ابتلا ہے کیونکہ وہ حروف کو بغیر مشقت کے درست نہیں کر سکتے۔ نیز تاتارخانیہ میں ہے کہ جب دو حرفوں میں

لَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحَرْفَيْنِ اتِّحَادُ الْمَخْرَجِ	نہ اتحاد مخرج ہو اور نہ قرب مخرج مگر اس میں
وَلَا قُرْبُہٗ اِلَّا اَنَّ فِيْهِ بَلْوٰى	ابتلاء عام ہو جیسے ذال بجائے ضاد یا زائے
الْعَامَّةِ كَالذَّالِ مَعَ الضَّادِ اَوِ الزَّاءِ	خالص بجائے ذال یا ظاء بجائے ضاد تو بعض
الْمَحْضِ مَكَانَ الذَّالِ وَالظَّاءِ مَكَانَ	مشائخ کے نزدیک نماز فاسد نہ ہوگی. و میں
الضَّادِ لَا تَفْسُدُ عِنْدَ بَعْضِ الْمَشَائِخِ	کہتا ہوں کہ اس قاعدہ کی بناء پر شاء کو سین سے
قُلْتُ فَيَنْبَغِيْ اَنْ لَا يَفْسُدَ فِيْ	اور قاف کو ہمزہ سے بدلنے میں بھی نماز فاسد
اِبْدَالِ الثَّاءِ سِيْنًا وَالْقَافِ	نہ ہوگی۔
هَمْزَةً كَمَا هُوَ لُغَةُ عَوَامِّ زَمَانِنَا	جیسا کہ ہمارے زمانے کے اکثر عوام میں
(شامی مصری ص ۵۹۲ ج۱) وَرُوِيَ عَنْ	رائج ہے۔
مُحَمَّدِ بْنِ سَلَمَةَ مِثْلُهٗ. (شرح منیہ ص ۴۴۴)	(شامی مصری ص ۵۹۲ ج ۱)

علامہ شامی اور حلبی شارح منیہ نے متقدمین و متاخرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے۔ اِنَّ مَذْهَبَ الْمُتَاَخِّرِيْنَ اَوْسَعُ وَمَذْهَبَ الْمُتَقَدِّمِيْنَ اَحْوَطُ فَالْعَمَلُ بِمَا يُخْتَارُ وَالْاِحْتِيَاطُ اَوْلٰى۔ اس سے علمائے محققین نے فتویٰ ایک ایسے قول پر دیا ہے جو متقدمین و متاخرین دونوں کے اقوال کو جامع ہے جس میں ضرورت کا بھی پورا لحاظ کر لیا گیا ہے اور زیادہ آزادی بھی نہیں دی گئی وہ یہ ہے:۔

قول مختار یا اعدل الاقاویل

چونکہ متاخرین کے ضابطہ مذکورہ کی بناء پر عوام میں زیادہ بے پروائی پیدا ہونے کا احتمال تھا اس لئے محققین متاخرین نے ایک بین بین اور متوسط ضابطہ تجویز فرمایا جس میں عوام پر تنگی بھی نہیں اور اصل حکم سے زیادہ بُعد بھی نہیں وہ یہ ہے کہ:۔

عوام جو مخارج اور صفات سے واقف نہیں بوجہ ناواقفیت یا عدم التمیز کے اگر ان کی زبان سے ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف نکل جائے (خواہ کوئی حرف ہو) اور وہ یہ سمجھے میں نے وہی حرف نکالا ہے جو قرآن شریف میں ہے تو اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔

(حسب ضابطہ متاخرین)۔

اور جو شخص واقف ہے اور صحیح حرف نکالنے پر قادر بالفعل ہے اور پھر بھی جان بوجھ کر یا بے پروائی سے غلط حرف نکالتا ہے تو جس جگہ معنی میں تغیر فاحش پیدا ہو جائیگا حسب ضابطہ متقدمین اُس کی نماز فاسد قرار دی جائے گی۔

الغرض عوام کے حق میں متاخرین کے قول پر فتوی ہے اور خواص فقہاء و قراء کے حق میں متقدمین کے قول پر جو شخص مخارج و صفات سے واقف ہو وہ خواص میں داخل ہے خواہ عرف عام میں اُس کو قاری نہ کہتے ہوں اور جو اس سے ناواقف ہے وہ اس بارہ میں عوام میں داخل ہے۔ اگرچہ کتنا ہی بڑا عالم ہو۔

اور یہ قول منیہ اور شرح منیہ میں بالفاظ ذیل مذکور ہے:۔

وَكَانَ الْقَاضِى الْإِمَامُ الشَّهِيْدُ الْحَسَنُ يَقُوْلُ الْاَحْسَنُ فِيْهِ اَىْ فِى الْجَوَابِ فِىْ هٰذِهِ الْاَبْدَالِ الْمَذْكُوْرَةِ اَنْ يَقُوْلَ الْمُفْتِىْ اِنْ جَرٰى ذٰلِكَ عَلٰى لِسَانِهٖ وَلَمْ يَكُنْ مُمَيِّزًا بَيْنَ بَعْضِ هٰذِهِ الْحُرُوْفِ وَبَعْضٍ وَكَانَ فِىْ زَعْمِهٖ اَنَّهٗ اَدَّى الْكَلِمَةَ عَلٰى وَجْهِهَا لَا تَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ وَكَذَا اَىْ مِثْلُ مَا ذَكَرَ الْحَسَنُ رُوِىَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مُقَاتِلٍ وَعَنِ الشَّيْخِ الْاِمَامِ اِسْمٰعِيْلَ الزَّاهِدِ وَهٰذَا مَعْنٰى مَا ذُكِرَ فِىْ فَتَاوِى الْحُجَّةِ اَنَّهٗ يُفْتٰى فِىْ حَقِّ الْفُقَهَاءِ بِاِعَادَةِ الصَّلٰوةِ وَفِىْ حَقِّ الْعَوَامِّ

اور قاضی امام شہید حسن فرماتے تھے کہ بہتر اس قسم کے تغیرات مذکورہ میں یہ ہے کہ مفتی یہ جواب دے کہ اگر ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف بلا قصد اس کی زبان سے نکل گیا اور اس کو صحیح حرف اور غلط حرف میں امتیاز نہ ہوا اور اُس کا گمان یہی رہا کہ میں نے وہی حرف ادا کیا ہے جو قرآن کا اصل حرف ہے تو اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ اور جو قول امام حسن کا ذکر کیا گیا ہے یہی محمد بن مقاتل اور امام اسمٰعیل زاہد سے بھی منقول ہے اور یہی مراد ہے اُس کلام کی جو فتاوی حجہ میں مذکور ہے کہ فقہاء و علماء کے حق میں اعادہ نماز کا حکم کیا جائے اور عوام کے حق میں جواز کا مثل قول محمد بن سلمہ کے تاکہ احتیاط کے موقع میں احتیاط کو اختیار کیا جائے

بِالْجَوَازِ کَقَوْلِ مُحَمَّدِ بْنِ سَلَمَۃَ اِخْتِیَارًا لِلْاِحْتِیَاطِ فِیْ مَوْضِعِہٖ وَالرُّخْصَۃِ فِیْ مَوْضِعِہَا (کبیری مجتبائی ص ۴۴۸)

اور تنگی کے موقع میں تنگی کر (کبیری شرح منیہ ص ۴۴۸)

اور یہی قول علامہ شامی نے قاضی امام ابو عاصم سے بالفاظِ ذیل بحوالہ خزانہ نقل فرمایا ہے اور حلیہ اور بزازیہ سے اُس کا مختار اور اعدل الاقاویل ہونا نقل کیا ہے

اِنْ تَعَمَّدَ ذٰلِکَ تَفْسُدُ وَاِنْ جَرٰی عَلٰی لِسَانِہٖ اَوْ لَا یَعْرِفُ التَّمْیِیْزَ لَا تَفْسُدُ وَھُوَ الْمُخْتَارُ (حلیہ) وَفِی الْبَزَّازِیَّۃِ وَھُوَ اَعْدَلُ الْاَقَاوِیْلِ وَھُوَ الْمُخْتَارُ۔ (شامی زَلَّۃُ الْقَارِیْ ص ۵۹۲ جلد ا مصری)

اور یہی مضمون عالمگیری کتاب الصلوٰۃ باب رابع میں بحوالہ ذخیرہ کردری نقل کیا اور مختار ہونا بیان فرمایا ہے۔

خُلاصہ فتویٰ

الغرض حرف ضاد اپنے مخرج و صفات کے اعتبار سے ظاء خالص اور دال پُر دونوں سے بالکل جُدا ایک مستقل حرف ہے اُس کو جس طرح دال سے بدل کر (عوام کی طرح) پڑھنا غلطی ہے اسی طرح ظاء خالص سے بدل کر (بعض قرار زمانہ کی طرح) پڑھنا بھی غلطی صریح ہے لیکن فسادِ نماز کے بارے میں فتویٰ اس پر ہے کہ اگر جان بوجھ کر یا بے پروائی سے باوجود قدرت بالفعل ہونے کے ایسا تغیر کرے کہ ضاد کی جگہ دال یا ظاء خالص پڑھے تو نماز فاسد ہوجائے گی اور اگر بوجہ ناواقفیت اور عدم تمیز ایسا سرزد ہوجائے اور وہ اپنے نزدیک یہی سمجھے کہ میں نے حرف ضاد پڑھا ہے تو نماز صحیح ہوجائے گی۔

جس کا حاصل یہ ہوا کہ عوام کی نماز تو بلا کسی تفصیل و تنقیح کے بہر حال صحیح ہوجاتی ہے خواہ ظاء پڑھیں یا دال یا زاء وغیرہ کیونکہ وہ قادر بھی نہیں اور سمجھتے بھی یہی ہیں کہ ہم نے اصلی حرف ادا کیا ہے اور قراء مجودین اور علماء کی نماز کے جواز میں تفصیل مذکور ہے کہ اگر غلطی قصداً یا بے پروائی سے ہو تو نماز فاسد ہے اور سبقت لسانی یا عدم تمیز کی وجہ

سے ہو تو جائز و صحیح ہے۔

تنبیہ

لیکن نماز کے جواز و عدم فساد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بے فکر ہو کر ہمیشہ غلط پڑھتے رہنا جائز ہو گیا اور پڑھنے والا گناہ گار بھی نہ رہے گا۔ بلکہ اپنی قدرت و گنجائش کے موافق صحیح حروف پڑھنے کی مشق کرنا اور کوشش کرتے رہنا ضروری ہے ورنہ گناہ گار رہیگا۔ اگرچہ نماز فاسد نہ ہو۔ کما فی العالمگیریۃ فی الباب الرابع ومن لا یحسن بعض الحروف ینبغی ان یجھد ولا یعذر فی ذلک (عالمگیری مصری ص ۸۲، جلد ۱)۔

اور مقدمہ جزریہ میں ہے ؎

وَالْاَخْذُ بِالتَّجْوِیْدِ حَتْمٌ لَازِمٌ مَنْ لَمْ یُجَوِّدِ الْقُرْاٰنَ اٰثِمٌ
لانہ بہ الالٰہ انزلا وَھٰکَذَا مِنْہُ اِلَیْنَا وَصَلَا
وَھُوَ اِعْطَاءُ الْحُرُوْفِ حَقَّھَا مِنْ صِفَۃٍ لَّھَا وَمُسْتَحَقَّھَا

اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں قَوْلُہٗ وَالْاَخْذُ وَالْاَظْھَرُ اَنْ یُقَالَ تَقْدِیْرُہٗ وَاَخْذُ الْقَارِیْ بِتَجْوِیْدِ الْقُرْاٰنِ وَھُوَ تَحْسِیْنُ اَلْفَاظِہٖ بِاِخْرَاجِ الْحُرُوْفِ مِنْ مَّخَارِجِھَا وَاِعْطَاءِ حُقُوْقِھَا مِنْ صِفَاتِھَا فَرْضٌ لَازِمٌ وَحَتْمٌ دَائِمٌ وَاَمَّا دَقَائِقُ التَّجْوِیْدِ عَلٰی مَا سَیَاْتِیْ بَیَانُہٗ فَاِنَّمَا ھُوَ مِنْ مُسْتَحْسَنَاتِہٖ (المنح الفکریۃ شرح المقدمۃ الجزریۃ لعلی القاری)۔

کتبہ احقر محمد شفیع الدیوبندی عفی عنہ
خادم دارالافتاء بدارالعلوم الدیوبندیۃ فی خمس ساعات
من یوم الخمیس لعشرین من اولی الجمادین سنہ ۱۳۵۱ھ

تصدیق و تتمہ

حضرت مجدد الملۃ حکیم الامۃ امام القراءۃ و الفقہ
محمد اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم

بعد الحمد و الصلوٰۃ اشرف علی عفی عنہ عرض رسا ہے کہ رسالہ دفع التضاد بہت بہت دلچسپی سے دیکھا دلچسپ اور مطابق ضرورت کے پایا جزی اللہ تعالیٰ مؤلفہا خیر الجزاء چونکہ ایسے شخص کے پیچھے صحیح خواں کے اقتدا کا واقعہ بھی کثیر الوقوع ہے اس لئے اس کے متعلق فتویٰ ذیل بطور ضمیمہ بلکہ تتمہ کے ملحق کر دیا۔ میرا عمل بھی اسی فتوے پر ہے۔ وَهِيَ هٰذِهٖ۔

فِي الدُّرِّ وَلَا غَيْرِ الْأَلْثَغِ بِهٖ اَيْ بِالْأَلْثَغِ عَلَى الْأَصَحِّ كَمَا فِي الْبَحْرِ عَنِ الْمُجْتَبٰى وَحَرَّرَ الْحَلَبِيُّ وَابْنُ الشِّحْنَةِ اَنَّهٗ بَعْدَ بَذْلِ الْجَهْدِ دَائِمًا حَتْمًا كَالْأُمِّيِّ فَلَا يَؤُمُّ اِلَّا مِثْلَهٗ اِلٰى اَنْ قَالَ هٰذَا هُوَ الصَّحِيْحُ الْمُخْتَارُ فِي حُكْمِ الْأَلْثَغِ وَكَذَا مَنْ لَا يَقْدِرُ عَلَى التَّلَفُّظِ بِحَرْفٍ مِنَ الْحُرُوْفِ اھ (ص ۶۰۸ و ۶۰۹ جلد ۱ مع الشامی)

وَفِي رَدِّ الْمُحْتَارِ تَحْتَ قَوْلِهٖ عَلَى الْأَصَحِّ اَيْ خِلَافًا لِمَا فِي الْخُلَاصَةِ عَنِ الْفَضْلِيِّ مِنْ اَنَّهَا جَائِزَةٌ لِاَنَّ مَا يَقُوْلُهٗ صَارَ لُغَةً لَهٗ وَمِثْلُهٗ فِي التَّاتَارْخَانِيَّةِ وَفِي الظَّهِيْرِيَّةِ وَاِمَامَةُ الْأَلْثَغِ لِغَيْرِهٖ تَجُوْزُ وَقِيْلَ لَا وَنَحْوُهٗ فِي الْخَانِيَّةِ عَنِ الْفَضْلِيِّ وَظَاهِرُهُ اعْتِمَادُهُمُ الصِّحَّةَ وَكَذَا اعْتَمَدَهَا صَاحِبُ الْحِلْيَةِ قَالَ لِمَا اَطْلَقَهٗ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْمَشَائِخِ مِنْ اَنَّهٗ يَنْبَغِيْ لَهٗ اَنْ لَا يَؤُمَّ غَيْرَهٗ وَفِي خِزَانَةِ الْأَكْمَلِ تُكْرَهُ اِمَامَةُ الْفَأْفَاءِ اھ وَلٰكِنَّ الْأَحْوَطَ عَدَمُ الصِّحَّةِ اھ (ص ۶۰۸ ج ۱)

ان عبارات سے امورِ ذیل مستفاد ہوئے۔

(۱) الثغ کی امامت کے جواز میں اختلاف ہے بعض نے اس کی امامت کو سب کے حق میں جائز رکھا ہے۔

(۲) الثغ صرف وہی نہیں جس میں پڑھنے کی قابلیت ہی نہ ہو کیونکہ حلبی اور ابن شحنہ نے اس پر بذل جہد واجب کیا ہے اور وجوب جہد فرع ہے قدرت کی پس الثغ سے مراد وہ الثغ ہے جو اس وقت حالتِ موجودہ میں صحیح پڑھنے پر قادر نہیں۔

(۳) جو شخص الثغ نہ ہو لیکن اس وقت کسی حرف کے صحیح تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بھی بحکم الثغ ہے۔ پس ہر چند کہ صحیح و مختار قول یہی ہے کہ الثغ کی امامت غیر الثغ کے لئے درست نہیں اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ صحیح خواں کی اقتدا ایسے شخص کے پیچھے جائز نہ ہو جو حروف کو صحیح ادا نہ کرتا ہو مگر اس وقت ضرورت کی وجہ سے امام فضلی کے قول پر فتویٰ دینے کو جی چاہتا ہے خصوصاً حرف ضاد کے مسئلہ میں کیونکہ عام طور پر قراء تک اس کو غلط پڑھتے ہیں لہٰذا قاری کی اقتدا غیر قاری کے پیچھے درست ہے البتہ ایسے شخص کے پیچھے صحیح نہیں جو بحالتِ موجودہ تصحیح حروف پر قادر ہے مگر غفلت یا بے توجہی یا رعایت عوام کی وجہ سے کسی حرف کو مثلاً ضاد کو اصلی مخرج سے نہیں نکالتا کیونکہ وہ بحکم الثغ نہیں بلکہ عمداً غلط پڑھنے والا ہے۔ واللہ اعلم۔

حررہٗ ظفر احمد ۱۹ رجب ۱۳۴۲ھ

صح الجواب

اشرف علی ۱۹ رجب ۱۳۴۲ھ

تقریظ و تصدیق از حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب

رحمۃ اللہ علیہ محدّث دار العلوم دیوبند

رسالہ اور ضمیمہ احقر کے نزدیک نہایت دل پسند اور صحیح اور مفید ہے حق تعالیٰ مؤلف صاحب کو جزائے خیر اور مزید توفیق اس قسم کے افادات کی عطا فرمادیں۔

بندہ محمد اصغر حسین عفا اللہ عنہ

(مدرس حدیث دار العلوم دیوبند)

تحریر جناب قاری عبد الوحید خاں صاحب مدرّس اوّل درجہ تجوید دار العلوم دیوبند

تحریر ہذا مع تنبیہ ضروری مؤلف جناب مولانا الحاج مفتی محمد شفیع صاحب مفتی حال دار العلوم دیوبند کو امتثالاً دیکھائی زمانہ مناسب و غنیمت سمجھتا ہوں فن تجوید کے متعلق جناب موصوف نے خود ہی تحریر فرمادیا باقی رہا عدمِ فساد و فسادِ نماز کے متعلق اصحابِ فتویٰ جانیں احقر کا منصب نہیں

احقر عبد الوحید الہ آبادی غفرلہٗ

یوم جمعہ ۲۸-۵-۵۱ھ

فتاویٰ از حضرت قطب الارشاد امام ربّانی فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ

منقول از فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۱۲ و ۱۱۳ حصہ دوم مطبوعہ دہلی

۱ — استفتاء } کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارہ میں کہ

چند اشخاص حرف (ض، دوآد قرآن شریف میں پڑھنے سے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم قرآن شریف میں (دُوآد) پڑھتے ہو تو عربی لفظ جو بزبان اردو بولتے ہو تو وضو کو (مُودو) کیوں نہیں کہتے اور ضیاء الدین کو (دیاء الدین) کیوں نہیں کہتے یہ بھی تو عربی لفظ ہیں تو قرآن شریف میں (زدآد) کا پڑھنا صحیح ہے یا (دُوآد) پڑھنا چاہیئے۔

زیادہ سلام

راقم احقر العباد حمایت اللہ

ساکن شمس پور ضلع ایٹہ پرگنہ پٹیالی معرفت جناب عبد العلیم خانصاحب بھونگامی۔ فقط

الجواب

اصلی حرف ضاد ہے اُس کو اصلی مخرج سے ادا کرنا واجب ہے اگر نہ ہوسکے تو بحالت معذوری دال پُر کی صورت سے بھی نماز ہو جاوے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

الجواب صحیح بندہ عزیز الرحمٰن عفی عنہ مفتی دار العلوم دیوبند [مہر: و توکل علی العزیز الرحمٰن]

الجواب صحیح خلیل احمد مدرس اوّل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور [مہر: خلیل احمد]

الجواب صحیح اشرف علی عفی عنہ [مہر: [illegible] اشرف علی]

الجواب صحیح عنایت الٰہی عفی عنہ مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور [مہر: عنایت الٰہی]

الجواب صحیح بندہ محمود عفی عنہ مدرس اوّل مدرسہ دیوبند [مہر: الٰہی عاقبت محمود گرداں]

الجواب صحیح احقر الزمان گل محمد خاں مدرس مدرسہ دیوبند [مہر: گل محمد خاں]

الجواب صحیح غلام رسول عفی عنہ مدرس مدرسہ دیوبند [مہر: غلام رسول]

[مہر: رشید احمد]

سُوال

(فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم —— ص ۹۳ و ۹۴)

گذارش یہ ہے کہ میں تجوید سے واقف ہوں اور قرارت سیکھی ہے تو جو لوگ معذور بھی نہیں ہیں اور قرارت کا مخارج حروف کی جانب اُن کا خیال ہی نہیں تو ایسے شخصوں کے پیچھے نماز ہوگی یا نہ؟ اور میری نماز یا قاری کامل کی نماز ایسے شخصوں کے پیچھے ہو جاوے گی یا نہیں یا ترک جماعت کی جاوے اور اعادہ نماز ہر وقت کا نہایت مشکل ہے کیونکہ عام طور سے ضاد کو مشابہ بالدال ہی پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دال نہیں پڑھی بلکہ ایک مخرج علیحدہ ادا کیا ہے دیگر حروف کا فرق کرنا اس سے آسان ہے؟

الجواب

د۔ظ۔ض کے حرف جداگانہ اور مخارج جداگانہ ہونے میں تو شک نہیں ہے اور اس میں بھی شک نہیں ہے کہ قصداً کسی حرف کو دوسرے مخارج سے ادا کرنا سخت بے ادبی اور لبسا اوقات باعث فسادِ نماز ہے مگر جو لوگ معذور ہیں اور ان سے یہ لفظ اپنے مخرج سے ادا نہیں ہوتا اور وہ حتی الوسع کوشش کرتے رہتے ہیں ان کی نماز بھی درست ہے اور دال پُر ظاہر ہے کہ خود کوئی حرف نہیں ہے بلکہ ضاد ہی ہے اپنے مخرج سے پورے طور پر ادا ہی نہیں ہوا تو جو شخص دال خالص یا ظاد خالص عمداً پڑھے اس کے پیچھے تو نماز نہ پڑھیں مگر جو شخص دال پُر کی آواز میں پڑھتا ہے آپ اس کے پیچھے نماز پڑھ لیا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

سُوال

(فتاویٰ رشیدیہ حصہ سوم —— ص ۱۰۷)

قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم پانی پتی نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ حرف ضاد

کو مشابہ بالدال وظاء نہ پڑھے ورنہ نماز نہ ہوگی کیوں کہ نماز میں قرآن کا صحیح پڑھنا
فرض ہے لہٰذا ہر ایک شخص کو مخرج سے ادا کرنے کی ہر حرف کی کوشش ہونی چاہیئے
اگر کوشش کرتا ہے تب بھی پورا حرف صحیح نہ ادا ہو تو اس میں مواخذہ دار نہ ہوگا
اگر بلا سعی مشابہ بالدال وظاء پڑھے گا تو معنی میں فرق آوے گا۔ لہٰذا اس تحریر میں
حضور کیا فرماتے ہیں اور جو شخص کہ قاری ہو یا علم قرارت سیکھتا ہو تو وہ شخص کہ مشابہ
بدال وظاء پڑھے اس کے پیچھے اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟ یا یہ اپنی نماز لوٹا دے
یہ میں نے بھی دیکھا کہ اگر حرف ضاد کو مخرج سے ادا کرے تو ہرگز مشابہ بالدال نہیں
نکلتا مشابہ بالظاء ادا ہوتا ہے اور باوجود یکہ یہ حرف شفویہ میں سے نہیں ہے مگر ہونٹ
ملتے ہیں اور زبان وہاں سے ہٹتی ہے تب مشابہ بالدال نکلتا ہے اصل مخرج سے
مشابہ بالظاء مع تمامی شرائط کے ادا ہوتا ہے۔ قیاسًا!

الجواب

یہ قول قاری صاحب کا درست ہے کہ جو شخص باوجود قدرت کے ضاد کو ضاد
کے مخرج سے ادا نہ کرے وہ گناہ گار بھی ہے اور اگر دوسرا لفظ بدل جانے سے
معنی بدل گئے تو نماز بھی نہ ہوگی اور اگر باوجود کوشش وسعی ضاد اپنے مخرج سے
ادا نہیں ہوتا تو معذور ہے اس کی نماز ہو جاتی ہے اور جو شخص خود صحیح پڑھنے
کا قادر ہے ایسے معذور کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ مگر جو شخص قصدًا دال یا
ظاد پڑھے اس کے پیچھے نماز نہ ہوگی۔ فقط

رشید احمد عفا اللہ عنہ

الاعجوبة فی عربیة
خطبة العروبة

خطبۂ جمعہ

عربی زبان میں کیوں ہے :

تاریخ تالیف ———— دوشنبہ ۲۰ رجمادی الثانیہ سنہ ۱۳۵۰ھ

مدت تالیف ———— پانچ گھنٹے متفرق اوقات میں

مقام تالیف ———— دیوبند ضلع سہارنپور یوپی

طبع اول ———— ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۰ھ

از دارالاشاعت دیوبند

"کہا جاتا ہے کہ غیر عرب مسلمانوں کے سامنے جمعہ کا خطبہ عربی میں کیوں دیا جاتا ہے؟ ہر ملک کی اپنی مادری زبان میں کیوں نہیں؟ یہ سوال دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں بھی آیا تھا۔ یہ رسالہ اس کا مفصل جواب ہے جس پر حضرت تھانوی نے نظر ثانی فرما کر اس کی تصدیق فرمائی۔"

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبدہ الذین اصطفیٰ ولاسیما علی
سیدنا ومولانا محمد المجتبیٰ ومن بھدایہ اھتدی

امّا بعد

استفتاء

شریعتِ مطہرہ کا اس بارہ میں کیا حکم ہے کہ خطبہ جمعہ عربی کے سوا دوسری ملکی زبانوں میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور اگر خطبہ عربی زبان میں پڑھ کر ترجمہ اردو وغیرہ میں کر دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔ اگر دونوں صورتیں ناجائز ہوں تو اس مسئلہ کا مفصل جواب عنایت فرمایا جائے کہ جب خطبہ کا مقصود وعظ ہے تو عربی زبان سے ناواقف لوگوں کے سامنے عربی میں پڑھنے سے کیا فائدہ۔

الجواب

چونکہ مسئلہ عامۃ الورود اور کثیر الوقوع ہے اس لئے جواب کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔ پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ خطبہ جو نماز جمعہ کے لئے ایسا لازم کر دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر نماز جمعہ ہی ادا نہیں ہوتی اور جس طرح نماز جمعہ ظہر کے وقت سے پہلے درست نہیں اسی طرح خطبہ بھی اگر زوال سے پہلے پڑھ لیا جائے تو شرعاً معتبر نہیں۔ اس کا اعادہ ضروری ہے (کما ھو مصرح فی عامۃ کتب الفقہ) اس خطبہ کی شرعی غرض اور اس سے اصلی مقصود کیا ہے تاکہ آگے یہ فیصلہ کرنا سہل ہو جائے کہ وہ کس زبان میں ہونا چاہئے اور اگر عربی میں پڑھیں تو اس کا ترجمہ ملکی زبان میں کرنا چاہئے یا نہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان و فرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت و عدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب و سنن ہیں جو اس کے مکملات میں سے ہیں۔

خطبہ کے ارکان اور آداب

فرض صرف دو ہیں۔ ایک وقت جمعہ، دوسرا مطلق ذکر اللہ خواہ کسی لفظ سے ہو۔ پھر امام صاحبؒ کے مذہب پر طویل ہو یا مختصر اور صاحبین کے مذہب پر ذکر طویل جس کو عرفاً خطبہ کہا جاسکے شرط ہے کذا فی الهدایہ والفتح والبحر۔

اور آداب وسنن پندرہ[۱۵] ہیں:۔

ایک[۱] طہارت اسی لئے بلا وضو خطبہ پڑھنا مکروہ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ناجائز ہے

دوسرے[۲] کھڑے ہوکر خطبہ پڑھنا اس کے خلاف مکروہ ہے۔

تیسرے[۳] قوم کی طرف متوجہ ہوکر خطبہ پڑھنا۔

چوتھے[۴] خطبہ سے پہلے آہستہ اعوذ باللہ پڑھنا (علی قول ابی یوسفؒ)

پانچویں[۵] خطبہ کا لوگوں کو سنانا اس لئے اگر آہستہ پڑھ لیا تو اگرچہ فرض ادا ہوگیا مگر کراہت رہی۔

چھٹے یہ کہ خطبہ مختصر پڑھنا جو دس چیزوں پر مشتمل ہو۔

(۱) حمد سے شروع کرنا (۲) اللہ تعالیٰ کی ثنا کرنا (۳) کلمہ شہادتین پڑھنا (۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا (۵) وعظ ونصیحت کرنا (۶) کوئی آیت قرآن مجید کی پڑھنا (۷) دونوں خطبوں کے درمیان تھوڑا سا بیٹھنا (۸) دوسرے خطبہ میں دوبارہ الحمد اور ثنا اور درود پڑھنا (۹) تمام مسلمان مرد وعورت کے لئے دعا مانگنا (۱۰) دونوں خطبوں کو مختصر کرنا جس کی انتہا یہ ہے کہ طوال مفصل کی سورتوں میں سے کسی سورت کے برابر ہو

اس طرح پر یہ پندرہ سنتیں خطبہ کے لئے ہوگئیں جن کے خلاف کرنا مکروہ ہے گو خطبہ ادا ہوجاتا ہے اور نماز جمعہ صحیح ہوجاتی ہے (بحر)

اسی کے ساتھ ایک سولھویں سنت اور ہے جو انھیں دلائل سے ثابت ہے جن سے مذکور الصدر پندرہ سنتیں ثابت ہیں۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل اور مواظبت

کہ اسی سے اکثر سنن مذکورہ ثابت ہوئی ہیں اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ صرف عربی زبان میں ہو غیر عربی میں نہ ہو۔ کیونکہ نہ تمام عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف ثابت ہوا اور نہ آپ کے بعد صحابہ کرام سے کبھی غیر عربی میں خطبہ پڑھنا ثابت ہوا حالانکہ اُن میں بہت سے حضرات عجمی زبانوں سے واقف تھے اور بیان مذکورہ پر مندرجہ ذیل عبارات شاہد ہیں۔ امر اوّل کے دلائل کہ خطبہ جمعہ کی اصل حقیقت اور رکن صرف ذکر اللہ ہے یہ ہیں:-

خطبہ کی اصل حقیقت ذکر ہے وعظ و تذکیر اس کا رکن نہیں

قال اللہ تبارک و تعالیٰ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللهِ قلت و قد صرح عامة المفسرين بان المراد من الذکر الخطبة و یؤیدہ ما رواہ الشیخان عن ابی ھریرة رض فی حدیث طویل فاذا خرج الامام حضرت الملائکة یستمعون الذکر (از تفسیر ابن کثیر ص ۵۶ ج ۹) قال ابن کثیر ای ترککم البیع و اقبالکم الی ذکر اللہ والی الصلوٰة وفی مبسوط السرخسی رحمہ اللہ و لنا ان الخطبة ذکر والمحدث والجنب لا یمنعان من ذکر اللہ مبسوط ص ۲۶ ج ۲ ثم قال بعد ذلک و ان المنصوص

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب اذان جمعہ دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف چلو۔ عامہ مفسرین نے اس آیت کے تحت میں تصریح فرمائی ہے کہ ذکر سے آیت میں خطبہ جمعہ مراد ہے۔ اور بخاری و مسلم کی روایت اس کی تائید کرتی ہے جو حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث کے ذیل میں مروی ہے الفاظ اس کے یہ ہیں (پس جب کہ امام خطبہ کے لئے نکلتا ہے تو ملائکہ ذکر سننے کے لئے اندر آجاتے ہیں (تفسیر ابن کثیر ص ۵۶ ج ۹) نیز ابن کثیر کہتے ہیں یعنی تمہارا بیع کو چھوڑ دینا اور ذکر اللہ اور نماز کی طرف متوجہ ہونا اور مبسوط امام سرخسی میں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ خطبہ ذکر ہے اور بے وضو اور غسل کی حاجت والا ذکر اللہ سے ممنوع نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ منصوص علیہ قرآن میں ذکر

عليه الذكر قال الله تعالى فاسعوا
الى ذكر الله وقد بينا ان الذكر
بها اى بالخطبة ثبت بالنص الذكر
تحصل بقوله الحمد لله مبسوط مصرى
ص ۳۱ ج ۲۔ وقال الحلبى فى شرح
المنية الكبير وقوله تعالى فاسعوا
الى ذكر الله من غير فصل بين
كونه ذكرا طويلا او قصيرا فالشرط
الذكر الاعم بالقطعى غير ان الماثور
عنه صلى الله عليه وسلم اختيار
احد الفردين اعنى الذكر المسمى
خطبة والمواظبة عليه فكان ذلك
واجبا او سنة۔ (كبيرى لاہورى ص ۵۴)

ہے۔ اور یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ذکر بالخطبہ نص
سے ثابت ہے اور ذکر لفظ الحمد للہ کہنے سے
ادا ہو جاتا ہے اور حلبی نے شرح منیہ میں فرمایا
ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فاسعوا الی ذکر اللہ عام
ہے کہ ذکر طویل ہو یا مختصر۔ پس شرط صلوٰۃ اتنی
ہے کہ جو قرآن سے ثابت ہے۔
ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر مطلق کی
ایک فرد یعنی ایسا ذکر طویل جس کو خطبہ کہہ سکیں اختیار
کرنا اور اس پر دوام فرمانا حدیث میں منقول ہے
اس لئے ایسے ذکر طویل کو واجب یا سنت کہیں گے
فرض نہیں۔
(بلکہ فرض تو مطلق ذکر سے ادا ہو جاتا
ہے)۔

خطبہ جمعہ غیر عربی میں جائز نہیں

امر دوم یعنی سنن اور آداب خطبہ کا ثبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے تعامل سے جس کی بنا پر فقہا نے ان آداب کی تصریح فرمائی ہے عالمگیری کتاب الصلوٰۃ باب سادس ص ۱۴۷ ج ۱ مصری اور بحر الرائق ص ۱۵۹ ج ۲ میں ان کو مفصل لکھا ہے عبارت بحر کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

اما الخطبة فتشتمل على
فرض وسنة فاما الفرض
فشيئان الوقت وذكر الله تعالى
واما سننها فخمسة عشر ثم شرحها

خطبہ دو چیزوں پر مشتمل ہے ایک فرض دوسری
سنت۔ فرض تو صرف دو چیزیں ہیں ایک
وقت جمعہ دوسرے ذکر اللہ تعالیٰ اور سنتیں
پندرہ ہیں۔ اس کے بعد وہی پندرہ سنتیں بیان

مفصل ذکر کرنا   بیان کیں جو اوپر مذکور ہو چکیں۔

پندرہ سنتوں کی تصریح کتب مذکورہ کی عبارتوں میں ہے اور سولھویں سنت یعنی خاص عربی میں ہونا حضرت امام ابویوسفؒ و محمدؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ اور امام نودی و رافعی وغیرہم نے اوسی دلیل سے ثابت کیا ہے جس سے پندرہ سنتیں ثابت ہیں یعنی عمل اور مواظبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر صحابہ کرام کی باوجودیکہ جس طرح آج تبلیغ احکام اور اون کی تعمیم و اشاعت کی حاجت ہے اوس وقت اس سے زیادہ تھی کیوں کہ اب تو کتب و رسائل ہر قوم کی زبان میں ہزارہا موجود ہیں اور اوس وقت سلسلہ تصنیف بالکل نہ تھا۔ نیز یہ بھی نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب ہمیشہ اہل عرب ہی ہوں بلکہ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ روم و فارس اور مختلف بلاد عجم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس خطبہ میں شریک ہوتے تھے اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضور صلعم بوجہ مادری زبان عربی ہونے کے دوسری زبان میں خطبہ نہ دیتے تھے تو اگر مقصود خطبہ وعظ و تبلیغ ہی تھا اور تبلیغ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر ہے کہ تمام اقوام عالم عرب و عجم کے لئے عام ہے تو عجمیوں کی رعایت سے ایسا کیا جا سکتا تھا کہ کسی صحابی کو حکم فرما دیتے تو خطبہ کے بعد ہی اوس کا ترجمہ عجم کی زبان میں سنا دیتے جیسا کہ بعض وفود وغیرہ سے مکالمہ کے وقت ترجمان سے کام لیا جاتا تھا۔

لیکن تمام عمر نبوی میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مروی نہیں۔ آپ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک سیل رواں کی صورت میں بلاد عجم میں داخل ہوئے اور دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جہاں اسلام کا کلمہ نہیں پہنچا دیا اور شعائر اسلام نماز اور جمعہ واعیاد قائم نہیں کر دیے۔ ان حضرات کے خطبے تاریخ کی کتابوں میں آج بھی بالفاظہا مذکور و مدون ہیں ان میں کسی ایک نے بھی کبھی بلاد عجم میں داخل ہونے کے بعد اپنے مخاطبین کی ملکی زبان میں خطبہ نہیں دیا حالانکہ وہ ابتدا فتح اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ جب کہ تمام لوگ تبلیغ احکام کے لئے آج سے کہیں زیادہ محتاج تھے۔

یہاں یہ شبہہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اون کو عجمی زبان کی واقفیت نہ تھی کیونکہ بہت سے صحابہ کرام کے متعلق اون کی سوانح و تذکروں میں تصریح ہے کہ وہ فارسی یا رومی یا حبشی

نہ تھے کہ ادائے جمعہ اوس پر موقوف ہو جائے۔

(ب) خطبہ جمعہ کے لئے وقت ظہر ہونا شرط ہے۔

(کما فی عامۃ الکتب و لفظ البحر لانہ یعنی وقت الظہر) شرط حتی لو خطب قبلہ و صلی فیہ ای فی وقت الظہر) لم تصح

(بحرالرائق ص ۱۵۸ ج ۲)

بحرالرائق کے الفاظ یہ ہیں کہ وقت ظہر کے لئے شرط ہے یہاں تک کہ اگر قبل ظہر پڑھ لیا اور نماز جمعہ وقت ظہر کے اندر پڑھی تو یہ خطبہ اور نماز دونوں صحیح نہ ہوں گے۔

اگر خطبہ کا مقصد ذکر محض نہ تھا بلکہ وعظ و تبلیغ مقصود تھی تو وقت ظہر کی کیا تخصیص ہے اگر زوال سے پہلے کوئی خطبہ پڑھ لے اور نماز بعد زوال پڑھے تو کیا مقصد وعظ ادا نہ ہوگا کہ فقہاء اس صورت میں جمعہ کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔

(ج) ادائے خطبہ کے لئے صرف پڑھ دینا کافی ہے کسی کا سننا ضروری نہیں گر چند بہرے آدمیوں کے سامنے یا سوئے ہوئے لوگوں کے سامنے خطبہ پڑھ دیا گیا اور پھر نماز جمعہ پڑھی تو خطبہ ادا ہو گیا اور نماز جمعہ صحیح ہو گئی۔

کما فی البحر و ان کانوا صمًّا او نیاما۔

بحرالرائق میں ہے کہ اگرچہ حاضرین خطبہ بہرے ہوں یا سو رہے ہوں۔

اگر مقصود خطبہ وعظ و تذکیر تھا تو صورت مذکورہ کے جواز کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

(د) اگر خطبہ پڑھنے کے بعد امام کسی کام میں مشغول ہو گیا اور نماز میں کوئی معتد بہ فصل ہو گیا تو قول مختار کے موافق خطبہ کا اعادہ کرنا ضروری ہے اگرچہ سننے والے دوبارہ بھی وہی لوگ ہوں گے جو پہلے سن چکے ہیں۔

کذا ذکرہ فی البحر عن الخلاصۃ ثم قال و قد صرح فی السراج الوہاج بلزوم الاستیناف و بطلان الخطبۃ وھذا ھو الظاھر (بحر ص ۱۵۹ ج ۲)

بحر میں بحوالہ خلاصہ مذکور ہے کہ سراج وہاج میں اس صورت میں بطلان خطبہ اور اس کی تجدید کے لازم ہونے کی تصریح ہے اور یہی ظاہر ہے۔

اور وعظ و پند ہی خطبہ کا مقصد ہوتا تو اس اعادہ سے کیا فائدہ متصور ہے۔

(۵) بہت سے فقہاءؒ نے خطبہ جمعہ کو دو رکعتوں کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

ذکرہ في البحر الرائق وفي البدائع ثم هي وان كانت قائمة مقام الركعتين الخ (بحر) (ص ۱۰۸ ج ۲)

اس کو بحر میں ذکر کیا اور پھر فرمایا کہ بدائع میں ہے کہ خطبہ اگرچہ دو رکعتوں کا قائم مقام ہے

(۶) خطبہ جمعہ کے لئے جو پندرہ سنتیں اوپر مذکور ہوئی ہیں وہ بھی یہی بتلاتی ہیں کہ خطبہ کا اصلی مقصد ذکر اللہ ہے وعظ و تبلیغ اوس کے مقاصد اصلیہ میں داخل نہیں ورنہ ان آداب و سنن کا وعظ و تذکیر سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا۔ امور مذکورہ سے یہ بات اچھی طرح روشن ہوگئی کہ خطبہ جمعہ کا مقصد اصلی شریعت کی نظر میں صرف ذکر اللہ ہے وعظ و تذکیر اوس کی حقیقت و مقصد کا جزو نہیں البتہ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ خطبہ میں کلمات وعظ و تذکیر کا ہونا سنت ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوا کہ اون تمام کلمات کا خاص عربی زبان میں ہونا سنت ہے تو جس طرح وعظ و تذکیر وغیرہ کے کلمات کا خطبہ میں چھوڑ دینا خلاف سنت ہوا اسی طرح غیر عربی زبان میں پڑھنا یا عربی میں پڑھ کر اوس کا ترجمہ سنانا خلاف سنت اور مکروہ ٹھہرا۔

اس شبہ کا جواب کہ جب مخاطب سمجھتے نہیں تو پھر خطبہ عربی میں پڑھنے سے کیا فائدہ

اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ خطبہ جمعہ کا مقصود اصلی صرف وعظ و تذکیر نہیں بلکہ ذکر اللہ اور ایک عبادت ہے اور ایک جماعت فقہاء کی اسی وجہ سے اس کو دو رکعتوں کا قائم مقام کہتی ہے تو اب یہ سوال سرے سے منقطع ہوگیا کہ جب مخاطب عربی عبارت کو سمجھتے ہی نہیں تو عربی میں خطبہ پڑھنے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ اگر یہ سوال خطبہ پر متوجہ ہوگا تو پھر صرف خطبہ پر نہ رہے گا بلکہ نماز اور قراءۃ قرآن اور اذان و اقامت اور تکبیرات نماز وغیرہ سب پر یہی سوال عائد ہوجائے گا بلکہ قراءت قرآن پر بہ نسبت خطبہ کے زیادہ چسپاں ہوتا ہے

سے ثابت ہے کہ ہر قوم کی زبان اور لغت کو طرزِ معاشرت اور اخلاق اور عقل و دین میں نہایت قوی دخل ہے اور ہر لغت اور زبان کے کچھ اثراتِ مخصوصہ ہیں کہ جب کسی قوم اور کسی ملک میں وہ زبان پھیلتی ہے تو وہ اثرات بھی ساتھ ساتھ عالمگیر ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ حالت کو اب سے پچاس برس پہلے کی حالت کے ساتھ اگر موازنہ کیا جائے تو اس کی تصدیق آنکھوں کے سامنے آجائے گی کہ جس وقت تک ہندوستان میں انگریزی زبان کی یہ کثرت نہ تھی اس دہریت و تفریح اور آزادی و بے قیدی کی بھی یہ کثرت نہ تھی سرکاری اسکولوں کے ذریعہ ملک میں اس زبان کو عام کیا گیا تو ایسا ہو گیا کہ گویا ہندوستان کے طرزِ معاشرت اور اخلاق و تدین سب ہی پر ڈاکہ ڈال دیا۔

زبان کی اشاعت و عموم کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی معاشرت یورپین نیفات۔ یوروپین آزادی و دہریت وبا کی طرح پھیل گئی اور جس وقت مسلمانوں کی قسمت میں ترقی لکھی تھی تو اُن کے لئے بھی زبان عربی کی اشاعت نے وہی کام کیا تھا جو آج انگریزی کی زبان کر رہی ہے بلکہ اگر تاریخ دیکھی جائے تو بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عربی زبان نے تمام دنیا کو ایسا مفتوح کیا تھا کہ کوئی خطہ بھی اس کے حلقہ اثر سے خارج نہ رہا تھا اور تقریباً ایک ہزار سال کامل تمام عالم پر ایسی حکومت کی کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے یقیناً عاجز ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں عرب و عجم کی زبان پر مفصل کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے:

واعلم ان اعتیاد اللغۃ موثر فی العقل والخلق والدین تاثیراً قویا بینا۔

سمجھو کہ کسی خاص زبان کی عادت ڈالنا عقل اور خلق و دین میں بہت بڑی قوی تاثیر رکھتا ہے جو بالکل ظاہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر بادشاہ اپنی قومی زبان کو اپنی مملکت میں رائج کرنے کے لئے طرح طرح کی کوشش کرتا ہے۔

؎ اس سے یہ غرض نہیں کہ انگریزی زبان سیکھنا مطلقاً ناجائز ہے بلکہ ایک مشاہدہ کا بتانا مقصود ہے اور اگر کوئی انگریزی زبان ان مفاسد سے محفوظ رہ کر سیکھے تو بلاشبہ جائز اور نیک نیت ہو تو ثواب ہے

ہندوستان میں زبان انگریزی کی ترویج اور اس کا سیاسی مقصد!

یورپین اقوام جو آزادی و حریت کی بہت دعویدار ہیں اور مساوات کا دم بھرتی ہیں جس وقت ہندوستان پر قبضہ کرتی ہیں تو ہزاروں طرح کی کوشش کر کے اور کروڑوں روپیہ خرچ کر کے اپنی خاص قومی زبان کو ہندوستان کی معاشرت کا جزو اعظم بنا دیتی ہیں۔ ہندوستان میں اب اگرچہ زبان انگریزی کا عموم و شیوع بہت کچھ ہو چکا ہے۔ لیکن اب بھی اگر صحیح حیثیت سے مردم شماری پر نظر ڈالی جائے۔ کل ہندوستانی قلمرو میں شاید پانچ فیصدی اشخاص بھی انگریزی جاننے والے نہ نکلیں گے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت کی طرف سے جو پرزہ کاغذ چلتا ہے تو انگریزی زبان کے سکہ کے ساتھ چلتا ہے۔ ڈاکخانہ کے تمام کاغذات ریلوے کے ٹکٹ بلٹیاں اور تمام کاغذات تمام عدالتوں کے عام کاغذات جو خاص طور سے ہندوستانیوں ہی کی اطلاع و کاروبار کے لئے جاری کئے جاتے ہیں وہ سب انگریزی زبان میں لکھے جاتے ہیں خلق اللہ اس غیر زبان کی وجہ سے پریشان ہوتی ہے اور اصحاب معاملہ کو محض اس زبان کی دقت کی وجہ سے دوگنا خرچ ترجمانی وغیرہ میں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر حکومت اس کی پروا نہیں کرتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا اس پر مجبور ہو گئی کہ انگریزی زبان حاصل کرے اس کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی پوچھے کہ اس میں کوئی اہل ملک کی مصلحت تھی ہرگز نہیں محض سیاسی فائدہ یہ کہ اپنے حلقہ اثر کو وسیع کرنا اور طرز معاشرت و تمدن اور اپنی نام نہاد تہذیب کو دنیا میں رواج دینا۔ ہمارے روشن خیال برادر جو علماء سے یہ سوال پیش کرتے ہیں کہ عربی زبان میں خطبہ پڑھنے سے کیا فائدہ کبھی اس طرف بھی نظر عنایت متوجہ فرمائی ہے کہ انگریزی زبان میں ڈاک اور ریل کے ٹکٹ اور ریل کی بلٹی وغیرہ چھاپنے سے کیا فائدہ۔ سفر کرنے والے عموماً انگریزی داں نہیں۔ اگر وہ حکومت کی اس گہری چال پر نظر ڈال لیتے تو انہیں خطبہ کی عربی ہونے کی حکمت خود بخود معلوم ہو جاتی

عربی زبان کی بعض خصوصیات

اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ یہی وہ بات ہے جس کو یورپ سے بہت پہلے مسلمانوں نے سمجھا تھا اور چونکہ یہ

کہ اوس نے یہاں کی قدیم زبانوں یعنی سریانی۔ یونانی۔ قبطی۔ بربری وغیرہ کی جگہ لے لی۔
ایران میں ایک مدت تک عربی زبان قائم رہی اور اگرچہ اوس کے بعد زبان فارسی کی تجدید
ہوگئی۔ لیکن اس وقت تک علمار کی تحریریں اوسی زبان میں ہوتی ہیں۔ ایران کے کل علوم
و مذہب کی کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں۔ ایشیار کے اس خطہ میں زبان عربی کی وہی حالت
ہے جو از منہ متوسط میں زبان لاطینی کی حالت یوروپ میں تھی۔

ترکوں نے بھی جنھوں نے عربوں کے ملک فتح کئے اونھیں کی طرز تحریر اختیار کرلی۔ در
اس وقت تک ترکوں کے ملک میں کم استعداد لوگ بھی قرآن کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ یورپ
کی لاطینی اقوام کی البتہ ایک مثال ہے جہاں عربی زبان نے اون کی قدیم السنہ کی جگہ نہیں
لیکن یہاں بھی اونھوں نے اپنے تسلط کے بین آثار چھوڑے ہیں۔ موسیو ڈوزی
اور موسیو انگلمین نے مل کر زبان اندلس اور پرتگال کے اون الفاظ کی جو عربی سے مشتق ہیں
ایک لغت تیار کرلی ہے۔ فرانس میں بھی عربی زبان نے بڑا اثر چھوڑا ہے۔ موسیو سدی یو
نہایت درست لکھتے ہیں کہ اوورن اور سوئٹز میں کی زبان بھی عربی الفاظ سے زیدہ معمور ہو
گئی ہے اور اون کے ناموں کی صورت بھی بالکل عربی ہے۔

فرانسیسی زبان کے ایک لغت نویس جنھوں نے الفاظ کا اشتقاق دیا ہے لکھتے
ہیں کہ "جنوبی فرانس میں عربوں کے قیام کا کوئی اثر نہ محاورہ پر رہا ہے اور نہ زبان پر۔ جو فہرست
اوپر لکھی جا چکی ہے اوس سے معلوم ہوگا کہ اس رائے کی کس قدر وقعت ہے۔ نہایت تعجب
کی بات ہے کہ اب بھی ایسے تعلیم یافتہ لوگ موجود ہیں جو اس قسم کے مہمل اقوال کا اعادہ کرتے
ہیں" انتہیٰ۔ (منقول از تحقیق الخطبہ لحضرۃ استاد مولٰنا شبیر احمد العثمانی الدیوبندی مدظلہم)

دیکھئے اگر اگلے زمانہ کے مسلمان بھی ہماری طرح یہی رائے رکھتے کہ خطبات و تکبیرات
وغیرہ شعائر اسلامیہ کو ملکی زبان میں کردیا جائے تو آج عربی زبان کی وہ امتیازی خصوصیات
جن کا سکہ دوسری اقوام کو بھی ماننا پڑ گیا ہے کس طرح محفوظ رہ سکتیں

کلام اگرچہ طویل ہوگیا لیکن یہ بات عقلاً و نقلاً منقح اور صاف ہوگئی کہ خطبات کو اور
بالخصوص خطبہ جمعہ کو عربی زبان ہی میں رکھنا چاہیئے۔ اوس کا ترجمہ کرنا بھی مناسب نہیں۔

خطبہ جمعہ و عیدین میں فرق

خطبہ جمعہ و عیدین و نکاح وغیرہ اس بات میں قول مختار کے موافق سب شریک ہیں کہ جب خطیب خطبہ پڑھے تو کلام وسلام یہاں تک کہ ذکر و تسبیح وغیرہ سب ناجائز ہوجاتے ہیں بلکہ چپ بیٹھنا اور خطبہ سننا ضروری ہوجاتا ہے:۔

قال فی الدر المختار وکذا یجب الاستماع لسائر الخطب کخطبۃ نکاح وخطبۃ عید وختم۔

اور ایسے ہی تمام خطبوں کا سننا ضروری ہے مثل خطبہ نکاح و خطبہ عید وغیرہ۔

لیکن چند امور میں خطبہ جمعہ و عیدین میں فرق ہے۔ (۱) خطبہ عیدین جمعہ کی طرح نماز کے لئے شرط نہیں بلکہ بلا خطبہ بھی نماز عیدین صحیح ہوجاتی ہے (۲) خطبہ عیدین فرض وواجب نہیں بلکہ سنت ہے (۳) خطبہ عیدین بعد عید پڑھا جائے پہلے نہیں۔

قال الشامی بیان للفرق وھو انہا فیھما سنۃ لا شرط وانہا بعدھا لا قبلھا بخلاف الجمعۃ قال فی البحر حتی لو لم یخطب اصلا صح واساء لترک السنۃ ولو قدمھا علی الصلوٰۃ صحت واساء ولا تعاد الصلوٰۃ۔ (شامی باب العیدین ص ٥٥٠ ج ۱)

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ فرق درمیان خطبہ جمعہ و عیدین کے یہ ہے کہ خطبہ عیدین میں سنت ہے شرط نہیں اور یہ کہ عیدین میں بعد نماز ہے بخلاف جمعہ کے بحرالرائق میں ہے کہ اگر عیدین میں بالکل خطبہ نہ پڑھا جائے تو نماز صحیح ہوجائے گی اگرچہ ترک سنت سے گناہ گار ہوں گے اسی طرح نماز سے پہلے خطبہ پڑھنے میں خلاف سنت کا گناہ ہوگا مگر نماز درست ہوجائے گی۔

امور مذکورہ پر نظر کرتے ہوئے اگر خطبہ عیدین میں عربی خطبہ پڑھ کر اردو ترجمہ بھی سنادیا جائے تو مضائقہ نہیں کیونکہ اوّل تو اس خطبہ کی وہ شان نہیں کہ شرط صلوٰۃ اور قائم مقام رکعتین ہو۔ ثانیاً چونکہ خطبہ عید نماز کے بعد ہوتا ہے تو جب خطبہ عربی سے فراغت ہو گئی نماز عید اور اُس کی سنت ادا ہوگئی اب خالی وقت ہے اس میں بوجہ تبلیغ احکام کے ترجمہ سنادیں تو کچھ مضائقہ نہیں اور تطویل خطبہ بھی لازم نہیں آتا کیونکہ ترجمہ کے وقت گو

کوئی شخص جانا چاہے تو کوئی حرج شرعاً درپیش نہیں ہوتا بخلاف خطبہ جمعہ کے کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ نماز کا انتظار ضروری ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

خلاصۂ احکام المسئلہ

(۱) خطبہ جمعہ شرط نماز ہے بغیر خطبہ کے نماز جمعہ ادا نہیں ہوتی اور یہ شرط ادنیٰ ذکر سے ادا ہو جاتی ہے۔ (بحر الرائق)

(۲) خطبہ جمعہ و عیدین وغیرہ کا عربی میں ہونا سنت ہے اور اس کے خلاف دوسری زبانوں میں پڑھنا بدعت ہے (مصفّیٰ شرح مؤطا شاہ ولی اللہ و کتاب الاذکار نووی و درمختار و عمدۃ الرعایۃ و شرح جامع صغیر عبدی)

(۳) اسی طرح عربی میں خطبہ جمعہ پڑھ کر اس کا ترجمہ کسی زبان میں قبل از نماز سنانا بھی بدعت ہے جس سے بچنا ضروری ہے البتہ نماز کے بعد ترجمہ سنا دیں تو مضائقہ نہیں، مگر بہتر ہے (المآثر)

(۴) البتہ خطبہ عیدین وغیرہ میں اگر خطبہ کے بعد ہی ترجمہ سنا دیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ منبر سے علیحدہ ہو کر ترجمہ سنا دیں تاکہ امتیاز ہو جائے (کما صرح بہ فی تقریر الرسالۃ الاجوبۃ بناءً علی حدیث مسلم)

(۵) سنت ہے کہ خطبہ باوضو پڑھا جائے بے وضو پڑھ کر نماز کے لئے پھر وضو کرنا مکروہ ہے۔ (بحر)

(۶) سنت ہے کہ خطبہ کھڑے ہو کر پڑھا جائے بیٹھ کر مکروہ ہے۔ (عالمگیری و بحر الرائق)

(۷) سنت ہے کہ قوم کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ پڑھیں رو بقبلہ یا کسی دوسری جانب کھڑے ہو کر پڑھنا مکروہ ہے۔ (عالمگیری، بحر)

تقریظ از حضرت سراج السالکین امام العارفین مجدد الملۃ حکیم الامۃ سیدی وسندی حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم

بعد الحمد والصلوٰۃ میں نے رسالہ مؤلفہ جامع الکمالات العلمیہ مولانا محمد شفیع صاحب مدرس ومفتی مدرسہ دارالعلوم دیوبند دام فیضہ نہایت شوق و رغبت سے دیکھا بیحد پسند کیا۔ بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع میں بے نظیر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور شبہات کا دافع فرمادے۔ بطور تذنیب میں بھی بعض فوائد مناسبہ اس کے ساتھ ملحق کرتا ہوں۔

(۱) بڑی بناء عقلی غیر عربی میں خطبہ جائز رکھنے والوں کی یہ ہے کہ یہ تذکیر ہے اور تذکیر مخاطبین کی زبان میں ہونا چاہیئے ورنہ عبث ہے۔ اس کا ایک حقیقی جواب ہے اور ایک الزامی تحقیقی یہ ہے کہ اس کا تذکیر ہونا مسلّم نہیں خود قرآن مجید میں اس کو ذکر فرمایا گیا ہے قال تعالیٰ: فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ الآیہ خصوص مذہب حنفی کی اس تصریح پر (کفت تسبیحۃ او تحمیدۃ) اور تسبیح و تحمید کا تذکیر نہ ہونا ظاہر۔ معلوم ہوا کہ وہ صرف ذکر ہے تذکیر نہیں الا تبعاً۔ اور الزامی یہ ہے کہ قرآن مجید بنص قرآنی تذکیر ہے۔ قال تعالیٰ ان ھو اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ تو چاہیئے اس کو بھی نماز میں حاضرین کی زبان میں پڑھا کریں۔ پس جس طرح اوس کا عربی زبان میں پڑھنا امر تعبدی ہے اسی طرح خطبہ کا عربی زبان میں پڑھنا۔

(۲) اور بڑی بناء نقلی دعویٰ مذکورہ کی یہ ہے کہ امام صاحب نے نماز میں قرأت کو فارسی میں جائز فرمایا ہے اس کا ایک جواب نقلی ہے۔ ایک عقلی۔ نقلی جواب تو یہ ہے کہ امام صاحبؒ نے اس قول سے رجوع فرمالیا ہے پس اس سے استدلال کرنا ایسا ہے جیسے آیت منسوخہ یا حدیث منسوخ سے استدلال کرنا اور عقلی یہ ہے کہ امام صاحب کے اس قول مرجوع عنہ کی بناء یہ تھی کہ قرآن تذکیر ہے اس لئے غیر عربی میں پڑھنا جائز ہے اگر یہ بناء ہوتی تو جزئیہ کفایت تسبیح یا تحمید کو اس سے تعارض ہوتا وہو باطل۔ پس اس سے اس کا استدلال کرنا

تو دیل التوین بما یرضی بہ القائل کی قبیل سے ہے۔

(۳) رسالہ میں عیدین کے خطبہ عربی کے بعد اوس کے ترجمہ وغیرہ کی اجازت دی ہے اس میں بھی ہیئت اوفق بالسنۃ یہ ہے کہ خطبہ سے فارغ ہو کر منبر سے نیچے اوتر کر بیان کردے اوس کی دلیل اپنے ایک رسالہ سے بلفظہا نقل کرتا ہوں وہو ہذا تقریر المرام۔ انہ روی مسلم عن جابر فی قصۃ یوم الفطر ثم خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما فرغ نزل فاتی النساء فذکرھن الحدیث۔

وروی البخاری عن ابن عباس بعد وعظ النساء ثم انطلق ھو وبلال الی بیتہ فقولہ فرغ ونزل وانطلق الی بیتہ نص فی کون ھذا التذکیر بعد الخطبۃ وانہ لم یکن علی المنبر وانہ لم یعد الی المنبر ولما کان ھذا الکلام غیر الخطبۃ لخلوہ عن الخطاب العام الذی ھو من خواص الخطبۃ ثبت بہ ان غیر الخطبۃ لا ینبغی ان یکون فی اثناء الخطبۃ ولا علی ھیئۃ الخطبۃ ولا شک ان التذکیر بالھندیۃ لیس من الخطبۃ المسنونۃ فی شیء لان من خواصہا المقصودۃ کونہا بالعربیۃ لعدم نقل خلافہ عن صاحب الوحی او السلف فلما لم یکن ھذا التذکیر الھندی خطبۃ المسنونۃ کان الاوفق بالسنۃ کونہا بعد الفراغ عن الخطبۃ وتحت المنبر وھو المرام۔

کتبہ

اشرف علی التھانوی

عفی عنہ ذنبہ الجلی والخفی

المنتصف من شوال المکرم ۱۳۵۰ھ

فضائل وآداب دعاء

مسمّٰی بہ احکام الالتجاء فی احکام الدعاء

یعنی قرآن کریم اور حدیث شریف میں
دعاء کے جو طریقے اور آداب تعلیم فرمائے
گئے ہیں ان پر مکمّل اور جامع

کتاب (۱) احکام دعا سے انتخاب ترتیب جدید کیساتھ (اداریہ)

احادیث معتبرہ میں دعاء کے لیے مفصّل ذیل آداب کی تعلیم فرمائی گئی ہے جنکو ملحوظ رکھکر دعاء کرنا بلاشبہ کلید کامیابی ہے. لیکن اگر کوئی شخص کسی وقت ان تمام یا بعض آداب کو جمع نہ کرسکے تو یہ نہیں چاہیے کہ دعا ہی کو چھوڑ دے بلکہ دعاء ہر حال میں مفید ہی مفید ہے اور ہر حال میں حق تعالیٰ سے قبول کی امید ہے.

یہ آداب مختلف احادیث میں وارد ہوئے ہیں، پوری حدیث نقل کرنے میں رسالہ طویل ہوتا ہے اس لیے صرف خلاصہ مضمون اور اس کتاب کے حوالہ پر اکتفار کیا جاتا ہے جس میں یہ حدیث سند کے ساتھ موجود ہے.

ادب (۱) کھانے پینے پہننے اور کمانے میں حرام سے بچنا (رواہ مسلم و الترمذی عن ابی ہریرۃ رض)

ادب (۲) اخلاص کے ساتھ دعاء کرنا یعنی دل سے یہ سمجھنا کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی ہمارا مقصد پورا نہیں کرسکتا (الحاکم فی المستدرک)

ادب (۳) دعاء سے پہلے کوئی نیک کام کرنا اور بوقت دعاء اس کا اس طرح ذکر کرنا کہ یا اللہ میں نے آپ کی رضا کے لیے فلاں عمل کیا ہے آپ اس کی برکت سے میرا فلاں کام کردیجیے (مسلم. ترمذی. ابوداؤد)

ادب (۴) پاک وصاف ہوکر دعاء کرنا (سنن اربعہ. ابن حبان. مستدرک. حاکم)

ادب (۵) وضو کرنا (صحاح ستہ عن ابی موسی الاشعری)

ادب (۶) دعاء کے وقت قبلہ رو ہونا (صحاح ستہ عن عبداللہ بن زید بن عاصم رض)

ادب (۷) دو زانو ہو کر بیٹھنا (ابو عوانہ سعد بن وقاص رض)

ادب (۸) دعاء کے اوّل و آخر میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنا (صحاح ستہ عن انس رض)

ادب (۹) اسی طرح اوّل و آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا۔ (ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن حبان۔ مستدرک)

ادب (۱۰) دعاء کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا (ترمذی۔ مستدرک۔ حاکم)

ادب (۱۱) دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے برابر اٹھانا (ابو داؤد۔ مسند احمد۔ حاکم)

ادب (۱۲) ادب و تواضع کے ساتھ بیٹھنا (مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

ادب (۱۳) اپنی محتاجی اور عاجزی کو ذکر کرو (ترمذی)

ادب (۱۴) دعاء کے وقت آسمان کی طرف نظر نہ اٹھانا (مسلم)

ادب (۱۵) اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ اور صفاتِ عالیہ ذکر کر کے دعاء کرنا (ابن حبان۔ مستدرک) اسماء الحسنیٰ آخر رسالہ میں لکھ دیئے گئے ہیں، وہاں دیکھ لیا جائے

ادب (۱۶) الفاظ دعاء میں قافیہ بندی کے تکلف سے بچنا (بخاری)

ادب (۱۷) دعاء اگر نظم میں ہو تو گانے کی صورت سے بچنا (حصن بروایت موصوف)

ادب (۱۸) دعاء کے وقت انبیاء علیہم السلام اور دوسرے مقبول و صالح بندوں کے ساتھ توسل کرنا یعنی یہ کہنا کہ یا اللہ ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما (بخاری۔ بزار۔ حاکم)

ادب (۱۹) دعاء میں آواز پست کرنا (صحاح ستہ۔ عن ابی موسیٰ رض)

ادب (۲۰) ان دعاؤں کے ساتھ دعاء کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں کیونکہ آپ نے دین و دنیا کی کوئی حاجت چھوڑی نہیں جس کی دعاء تعلیم نہ فرمائی ہو۔ (ابو داؤد نسائی۔ عن ابی بکرۃ الثقفی)

ادب (۲۱) ایسی دعا کرنا جو اکثر حاجات دینی و دنیوی کو حاوی و شامل ہو۔ (ابو داؤد)

ادب (۲۲) دعاء میں اول اپنے لیے دعاء کرنا اور پھر اپنے والدین اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو شریک کرنا (مسلم)

ادب (۲۳) اگر امام ہو تو تنہا اپنے لیے دعا نہ کرے بلکہ سب شرکاء جماعت کو دعا میں شریک کرے (ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)

روایت: ابوداؤد میں ہے کہ جو امام اپنے نفس کو دعا میں خاص کرے اس نے قوم سے خیانت کی۔ مراد یہ ہے کہ نماز کے اندر امام ایسی دعا نہ مانگے جو صرف اس کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو مثلاً یہ کہے کہ اللھم اشف ابنی یعنی اے اللہ میرے بیٹے کو شفا دے یا ارجع الی ضالتی یعنی میری گمشدہ چیز کو واپس دیدے بلکہ ایسی دعا مانگے جو سب مقتدیوں کو شامل ہو سکے۔ جیسے اللھم اغفر لی وارحمنی وغیرہ هذا ما افادہ شیخنا حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی دامت برکاتھم ولشراح الحدیث فیہ مقالات یاباھا نسق الحدیث واللہ اعلم۔

ادب (۲۴) عزم کے ساتھ دعا کرے (یعنی یوں نہ کہے کہ یا اللہ اگر تو چاہے تو میرا کام پورا کر دے (صحاح ستہ)

ادب (۲۵) رغبت وشوق کے ساتھ دعا کرے (ابن حبان۔ ابوعوانہ۔ عن ابی ہریرۃ رض)

ادب (۲۶) جس قدر ممکن ہو حضور قلب کی کوشش کرے اور قبول دعا کی امید قوی رکھے۔ (مستدرک۔ حاکم)

ادب (۲۷) دعا میں تکرار کرنا یعنی بار بار دعا کرنا (بخاری۔ مسلم) اور کم سے کم مرتبہ تکرار کا تین مرتبہ ہے (ابوداؤد۔ ابن السنی)

(ف) ایک ہی مجلس میں تین مرتبہ دعا کو مکرر کرے یا تین مجلسوں میں تکرار دونوں طرح تکرار دعا صادق ہے۔

ادب (۲۸) دعا میں الحاح واصرار کرے (نسائی۔ حاکم۔ ابوعوانہ)

۱؎ اس میں صیغہ مفرد ہونے کی وجہ سے شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ صیغہ مفرد میں بھی جماعت کی نیت ہو سکتی ہے ۱۲ منہ ۲؎ لیکن یہ تکرار انفراداً ہو جماعت کے ساتھ دعا ر ثانیہ اور ثالثہ جو بعض بلاد میں رائج ہے اس کا ثبوت صحابہ و تابعین او سلف سے نہیں ہے اس کا التزام بدعت ہے ۱۲ منہ

ادب(۲۹) کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے (مسلم. ترمذی)

ادب(۳۰) ایسی چیز کی دعا نہ کرے جو طے ہو چکی ہے (مثلاً عورت یہ دعا نہ کرے کہ میں مرد ہو جاؤں یا طویل آدمی یہ دعا نہ کرے کہ پست قد ہو جاؤں (نسائی)

ادب(۳۱) کسی محال چیز کی دعا نہ کرے (بخاری)

ادب(۳۲) اللہ تعالیٰ کی رحمت کو صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کی دعا نہ کرے (بخاری. ابوداؤد. نسائی. ابن ماجۃ)

ادب(۳۳) اپنی سب حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرے (مخلوق پر بھروسہ نہ کرے) — (ترمذی. ابن حبان)

ادب(۳۴) دعا کرنے والا بھی آخر میں آمین کہے اور سننے والا بھی (بخاری مسلم ابوداؤد. نسائی.

ادب(۳۵) دعا کے بعد دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر کر (ابوداؤد. ترمذی. ابن حبان. ابن ماجۃ)

ادب(۳۶) مقبولیت دعا میں جلدی نہ کرے یعنی یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی تھی اب تک قبول کیوں نہیں ہوئی. (بخاری. مسلم. ابوداؤد. نسائی. ابن ماجہ)

اوقاتِ اجابت (یعنی دعا قبول ہونے کے خاص وقت)

شروع رسالہ میں بحوالہ حدیث بتلایا گیا ہے کہ دعا ہر وقت قبول ہو سکتی ہے اور ہر وقت مقبولیت کی توقع ہے مگر جو اوقات اس جگہ لکھے جاتے ہیں ان میں مقبول ہو جانے کی توقع بہت زیادہ ہے، اس لیے ان اوقات کو ضائع نہ کرنا چاہیے.

شبِ قدر: رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ کی طاق راتیں یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹، اور ان میں بھی سب سے زیادہ ستائیسویں رات قابل اہتمام ہے (ترمذی. نسائی. ابن ماجہ. مستدرک).

یومِ عرفہ: بھی مقبولیت دعا کے لیے نہایت مبارک و مخصوص دن ہے (ترمذی)

ماہ رمضان المبارک: رمضان کے تمام دن اور رات برکات و خیرات کے ساتھ مخصوص ہیں، سب میں دعا قبول کی جاتی ہے (بزار عن عبادۃ بن الصامت رض)

شب جمعہ: بھی نہایت مبارک اور مقبولیتِ دعا کے لیے مخصوص ہے۔ (ترمذی۔ حاکم۔ عن ابن عباس رض)

روز جمعہ: (ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ابن حبان۔ حاکم)

ہر رات: میں یہ اوقات قبولیتِ دعا کے لیے مخصوص ہیں۔ ابتدائی تہائی رات (احمد، ابویعلی) آخری تہائی رات (مسند احمد) آدھی رات (طبرانی) سحر کا وقت (صحاح ستہ)

ساعتِ جمعہ: احادیث صحیحہ میں ہے کہ جمعہ کے روز ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ اس میں جو دعا کی جاوے قبول ہوتی ہے۔ مگر اس گھڑی کے تعین میں روایات اور اقوال علما مختلف ہیں اور محققین کے نزدیک فیصلہ یہ ہے کہ یہ گھڑی جمعہ کے دن دائر سائر رہتی ہے۔ کبھی کسی وقت میں آتی ہے مگر تمام اوقات میں سے زیادہ روایات اور اقوال صحابہ و تابعین وغیرہم سے دو وقتوں کو ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

اوّل جس وقت سے امام خطبہ کے لیے بیٹھے نماز سے فارغ ہونے تک (مسلم عن ابی موسی الاشعری رض والنووی)

(ف) مگر درمیان خطبہ میں دعا زبان سے نہ کرے کہ ممنوع ہے بلکہ دل ہی دل میں دعا مانگے یا خطبہ میں جو دعائیں خطیب کرتا ہے ان پر دل ہی دل میں آمین کہا جاوے۔ اور دوسرا وقت عصر کے وقت غروب آفتاب تک ہے (ترمذی، احمد، عن عبداللہ بن سلام رض، جمع الترمذی وغیرہ)

(ف) اس لیے صاحب حاجت کو چاہیے کہ دونوں وقتوں کو دعا میں مشغول رکھے کہ اتنی بڑی نعمت کے مقابلہ میں دونوں وقت تھوڑی دیر رہنا کوئی مشکل چیز نہیں فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

* * *

مقبولیتِ دعاء کے خاص حالات

جس طرح مخصوص اوقات مقبولیتِ دعاء میں اثر رکھتے ہیں اسی طرح انسان کے بعض حالات کو بھی حق تعالیٰ نے مقبولیتِ دعاء کے لیے مخصوص فرمایا جن میں کوئی دعا رد نہیں کی جاتی، وہ حالات یہ ہیں۔

اذان کے وقت (ابوداؤد۔ مستدرک)

اذان واقامت کے درمیان (ابوداؤد ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

حیّ علی الصلوٰۃ حیّ علی الفلاح کے بعد اس شخص کے لیے جو کسی مصیبت میں گرفتار ہو اس وقت دعاء کرنا بہت مجرب ومفید ہے (مستدرک)

جہاد میں صف باندھنے کے وقت (ابن حبان۔ طبرانی۔ مؤطا)

جہاد میں گھمسان لڑائی کے وقت (ابوداؤد)

فرض نمازوں کے بعد (ترمذی۔ نسائی)

سجدہ کی حالت میں (مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی ف۔ مگر نوافل میں نہیں۔

تلاوتِ قرآن کے بعد (ترمذی) اور بالخصوص ختم قرآن کے بعد (طبرانی۔ بیہقی۔ اور بالخصوص پڑھنے والے کی دعاء بہ نسبت سننے والوں کے زیادہ مقبول ہے (ترمذی۔ طبرانی)

آبِ زمزم پینے کے وقت (مستدرک۔ حاکم)

میت کے پاس حاضر ہونے وقت یعنی جو شخص نزع کی حالت میں ہو اس کے پاس آنے کے وقت بھی دعاء قبول ہوتی ہے (مسلم و سنن اربعہ)

مرغ کے آواز کرنے کے وقت (بخاری۔ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی)

مسلمانوں کے اجتماع کے وقت (صحاح ستہ عن عطیۃ الانصاریۃ)

مجالس ذکر میں (بخاری۔ مسلم۔ ترمذی)

امام کے ولا الضالین **کہنے کے وقت** (مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ

ف۔ بظاہر امام جزری کی مراد اس سے وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے باب التشہد

میں ذکر کی ہے وَاِذَا قرءَ غیرِ المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین. یُجِبْکُمُ اللہ تعالیٰ یعنی امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، حق تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائینگے اس سے معلوم ہوا کہ اس موقع پر دعا سے مراد صرف آمین کہنا ہے، دوسری دعائیں مراد نہیں۔ (اور آمین بھی آہستہ سے دل میں کہنا بہتر ہے)

اقامتِ نماز کے وقت (طبرانی ابن مردویہ)

بارش کے وقت (ابوداؤد۔ طبرانی۔ ابن مردویہ عن سہل بن سعد الساعدی، امام شافعیؒ کتاب الام میں فرماتے ہیں کہ میں نے بہت سے صحابہ وتابعین کا یہ عمل سنا ہے کہ بارش کے وقت خصوصیت سے دعا مانگتے تھے۔

بیت اللہ پر نظر پڑنے کے وقت (ترمذی وطبرانی)

سورۂ انعام کی آیۃ کریمہ: وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ میں دونوں اسم اللہ کے درمیان جو دعا کی جائے وہ بھی مقبول ہوتی ہے۔ امام جزریؒ فرماتے ہیں ہم نے اس کا بارہا تجربہ کیا ہے اور بہت سے علماء سے اس کا مجرب ہونا منقول ہے۔

مکاناتِ اجابت (یعنی دعا قبول ہونے کی خاص جگہیں)

تمام مقاماتِ متبرکہ میں مقبولیتِ دعا کی زیادہ امید ہے، اور حضرت حسن بصریؒ نے اہل مکہ کی طرف ایک خط میں تحریر فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں پندرہ جگہ دعا کی مقبولیت مجرب ہے **طوافؔ** میں اور **ملتزمؔ** کے پاس (یعنی دروازہ بیت اللہ اور حجر اسود کے درمیان جو جگہ ہے اس میں) اور **میزابِ رحمت** یعنی بیت اللہ شریف کے پرنالہ کے نیچے، اور **بیت اللہ** کے اندر اور **چاہِ زمزم** کے پاس اور **صفا ومروہ** پہاڑوں کے اوپر اور **سعی کرنے کے میدان میں** (جو صفا ومروہ کے درمیان ہے) اور **مقام ابراہیم** کے پیچھے اور **عرفات** میں اور **مزدلفہ** میں اور **منیٰ** میں اور تینوں جمرات کے پاس

(جمرات وہ تین پتھر ہیں جو منیٰ میں نصب کیے ہوئے ہیں جن پر حجاج کنکریاں مارتے ہیں، امام جزری فرماتے ہیں کہ اگر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں (یعنی روضۂ اقدس کے پاس) دعا قبول نہ ہوگی تو کہاں ہوگی)

وہ لوگ جن کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے

مضطر یعنی مصیبت زدہ کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے (بخاری۔ مسلم۔ ابوداؤد) **مظلوم**۔ اگرچہ فاسق و فاجر ہو اس کی دعا بھی قبول ہوتی ہے (مسند احمد۔ بزار۔ ابن ابی شیبہ)، بلکہ اگر مظلوم کافر بھی ہو تو اس کی بھی دعا رد نہیں ہوتی (مسند احمد ابن حبان)، **والد کی دعا**۔ اولاد کیلیے (ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ) **عادل بادشاہ** کی دعا بھی مقبول ہوتی ہے (ترمذی۔ ابن ماجہ۔ ابن حبان)، **نیک آدمی** کی دعا مقبول ہے (بخاری۔ مسلم۔ ابن ماجہ) **اولاد جو والدین کی فرمانبردار ہو** اس کی بھی دعا قبول ہوتی ہے (مسلم)، **مسافر** کی دعا بھی مقبول ہے (ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ بزار)، **روزہ دار کی دعا** روزہ افطار کرنے کے وقت (ترمذی۔ ابن ماجہ۔ ابن حبان)، **غائبانہ دعا** ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان کے لیے بھی مقبول ہے (مسلم۔ ابوداؤد۔ ابن ابی شیبۃ) **حجاج کی دعا** جب تک وہ وطن میں واپس آویں (جامع ابی منصور)۔

حدیث صحیح میں ہے کہ تمام پریشانی اور مشکلات کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا قنوت نازلہ پڑھا کرتے تھے۔ فجر کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد امام بلند آواز سے یہ دعا پڑھے اور نمازی آمین کہیں گے۔ اس دعا کے لیے تکبیر نہ ہو اور نہ ہاتھ اٹھائے جائیں۔ دعا کے بعد تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ نمازی سجدہ میں جائیں۔ یہ دعا حصنِ حصین شریف اور دوسری کتب حدیث میں بھی ہے۔ اہل علم سے بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ، فی یوم عاشورہ ۱۳۸۱ھ۔

اللّٰھم تقبل دعواتنا وامن روعاتنا واقل عن عثراتنا وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

****

مقام تالیف : ———— کراچی
اشاعت اوّل : —— شعبۂ نشر و اشاعت دار العلوم کراچی

"یہ مختصر رسالہ دار العلوم کی طرف سے مفت تقسیم کے لئے ہر سال رمضان المبارک میں شائع ہوتا ہے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رمضان المبارک کے روزے رکھنا اسلام کا تیسرا فرض ہے۔ جو اس کے فرض ہونے کا انکار کرے مسلمان نہیں رہتا اور جو اس فرض کو ادا نہ کرے وہ سخت گناہگار فاسق ہے

روزہ کی نیت | نیت کہتے ہیں دل کے قصد و ارادہ کو۔ زبان سے کچھ کہے یا نہ کہے۔

روزہ کے لئے نیت شرط ہے۔ اگر روزہ کا ارادہ نہ کیا اور تمام دن کچھ کھایا پیا نہیں تو روزہ نہ ہوگا۔

مسئلہ: رمضان کے روزے کی نیت رات سے کر لینا بہتر ہے اور رات کو نہ کی ہو تو دن کو بھی زوال سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک کر سکتا ہے بشرطیکہ کچھ کھایا پیا نہ ہو۔

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے | ۱ ـــــ کان اور ناک میں دوا ڈالنا۔ ۲ ـــــ قصداً منہ بھر قے کرنا۔ ۳ ـــــ کلی کرتے ہوئے حلق میں پانی چلا جانا۔ ۴ ـــــ عورت کو چھونے وغیرہ سے انزال ہو جانا۔ ۵ ـــــ کوئی ایسی چیز نگل جانا جو عادۃً کھائی نہیں جاتی جیسے لکڑی، لوہا، کچا گیہوں کا دانہ وغیرہ ۶ ـــــ لوبان یا عود وغیرہ کا دھواں قصداً ناک یا حلق میں پہنچانا، بیڑی، سگریٹ حقہ پینا اسی حکم میں ہیں۔ ۷ ـــــ بھول کر کھا پی لیا اور یہ خیال کیا کہ اس سے روزہ ٹوٹ گیا ہوگا پھر قصداً کھا پی لیا۔ ۸ ـــــ رات سمجھ کر صبح صادق کے بعد سحری کھا لی۔ ۹ ـــــ دن باقی تھا مگر غلطی سے یہ سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہو گیا ہے روزہ

افطار کر لیا (تنبیہ) ان سب چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مگر صرف قضا واجب ہوتی ہے، کفارہ لازم نہیں ہوتا۔ ۱۰ ــــــ جان بوجھ کر بدون بھولنے کے بی بی سے صحبت کرنے یا کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا بھی لازم ہوتی ہے اور کفارہ بھی ــــــ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے ورنہ ساٹھ روزے متواتر رکھے بیچ میں ناغہ نہ ہو ورنہ پھر شروع سے ساٹھ روزے پورے کرنے پڑیں گے اور اگر روزہ کی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلاوے۔ آج کل شرعی غلام یا باندی کہیں نہیں ملتے اس لئے آخری دو صورتیں متعین ہیں۔

وہ چیزیں جن سے روزہ ٹوٹتا نہیں مگر مکروہ ہو جاتا ہے

۱ ــــــ بلا ضرورت کسی چیز کو چبانا یا نمک وغیرہ چکھ کر تھوک دینا، ٹوتھ پیسٹ یا منجن یا کوئلہ سے دانت صاف کرنا بھی روزہ میں مکروہ ہیں۔ ۲ ــــــ تمام دن حالتِ جنابت میں بغیر غسل کئے رہنا۔ ۳ ــــــ فصد کرانا، کسی مریض کے لئے اپنا خون دینا جو آج کل ڈاکٹروں میں رائج ہے یہ بھی اس میں داخل ہے۔ ۴ ــــــ غیبت یعنی کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا یہ ہر حال میں حرام ہے۔ روزہ میں اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے۔ ۵ ــــــ روزہ میں لڑنا جھگڑنا، گالی دینا خواہ انسان کو ہو یا کسی بے جان چیز کو یا جاندار کو، ان سے بھی روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔

وہ چیزیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور مکروہ بھی نہیں ہوتا ــــ!

۱ ــــــ مسواک کرنا۔ ۲ ــــــ سر یا مونچھوں پر تیل لگانا۔ ۳ ــــــ آنکھوں میں دوا، یا سرمہ ڈالنا۔ ۴ ــــــ خوشبو سونگھنا۔ ۵ ــــــ گرمی اور پیاس کی وجہ سے غسل کرنا۔ ۶ ــــــ کسی قسم کا انجکشن یا ٹیکہ لگوانا۔ ۷ ــــــ بھول کر کھانا پینا۔ ۸ ــــــ حلق میں بلا اختیار دھواں یا گرد و غبار یا مکھی وغیرہ کا چلا جانا۔ ۹ ــــــ کان میں پانی ڈالنا بلا قصد چلا جانا۔ ۱۰ ــــــ خود بخود قے آجانا۔ ۱۱ ــــــ سوتے ہوئے احتلام (غسل کی حاجت) ہو جانا۔

۱۲ ـــــ دانتوں میں سے خون نکلے، مگر حلق میں نہ جائے تو روزہ میں خلل نہیں آیا۔

۱۳ ـــــ اگر خواب میں یا صحبت سے غسل کی حاجت ہوگئی اور صبح صادق ہونے سے پہلے غسل نہیں کیا اور اسی حالت میں روزہ کی نیت کر لی تو روزہ میں خلل نہیں آیا۔

وہ عذر جن سے رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے

۱ ـــــ بیماری کی وجہ سے روزہ کی طاقت نہ ہو، یا مرض بڑھنے کا شدید خطرہ ہو تو روزہ نہ رکھنا جائز ہے، بعد رمضان اس کی قضا لازم ہے۔ ۲ ـــــ جو عورت حمل سے ہو اور روزہ میں بچہ کو یا اپنی جان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھے، بعد میں قضا کرے۔ ۳ ـــــ جو عورت اپنے یا کسی غیر کے بچہ کو دودھ پلاتی ہے، اگر روزہ سے بچے کو دودھ نہیں ملتا تکلیف پہنچتی ہے تو روزہ نہ رکھے پھر قضا کرے۔ ۴ ـــــ مسافر شرعی (جو کم از کم اڑتالیس میل کے سفر کی نیت پر گھر سے نکلا ہو) اس کے لئے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے پھر اگر کچھ تکلیف و دقت نہ ہو تو افضل یہ ہے کہ سفر ہی میں روزہ رکھ لے اگر خود اپنے آپ کو یا اپنے ساتھیوں کو اس سے تکلیف ہو تو روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہے۔ ۵ ـــــ بحالت روزہ سفر شروع کیا تو اس روزہ کا پورا کرنا ضروری ہے اور اگر کچھ کھانے پینے کے بعد سفر سے وطن واپس آگیا تو باقی دن کھانے پینے سے احتراز کرے۔ اور اگر ابھی کچھ کھایا پیا نہیں تھا کہ وطن میں ایسے وقت واپس آگیا جب کہ روزہ کی نیت ہو سکتی ہے یعنی زوال سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تو اس پر لازم ہے کہ روزہ کی نیت کر لے۔ ۶ ـــــ کسی کو قتل کی دھمکی دے کر روزہ توڑنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے لئے توڑ دینا جائز ہے پھر قضا کر لے۔ ۷ ـــــ کسی بیماری یا بھوک پیاس کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ کسی مسلمان دیندار ماہر طبیب یا ڈاکٹر کے نزدیک جان کا خطرہ لاحق ہو تو روزہ توڑ دینا جائز بلکہ واجب ہے اور پھر اس کی قضا لازم ہوگی۔ ۸ ـــــ عورت کے لئے ایام حیض میں اور بچہ کی پیدائش کے بعد جو خون آتا ہے یعنی نفاس اس کے دوران میں روزہ رکھنا جائز نہیں۔ ان ایام میں روزہ نہ رکھے بعد میں قضا کرے۔ بیمار، مسافر، حیض

نفاس والی عورت جن کے لئے رمضان میں روزہ رکھنا اور کھانا پینا جائز ہے ان کو بھی لازم ہے کہ رمضان کا احترام کریں، سب کے سامنے کھاتے پیتے نہ پھریں۔

روزہ کی قضا ۱ــــــ کسی عذر سے روزہ قضا ہو گیا تو جب عذر جاتا ہے جلد ادا کر لینا چاہیئے۔ زندگی اور طاقت کا بھروسہ نہیں۔ قضا روزوں میں اختیار ہے کہ متواتر رکھے یا ایک ایک دو دو کر کے رکھے۔ ۲ــــــ اگر مسافر سفر سے لوٹنے کے بعد یا مریض تندرست ہونے کے بعد اتنا وقت نہ پائے کہ جس میں قضا شدہ روزے ادا کرے تو قضا اس کے ذمہ لازم نہیں۔ سفر سے لوٹنے اور بیماری سے تندرست ہونے کے بعد جتنے دن ملیں اتنے ہی کی قضا لازم ہوگی۔

سحری روزہ دار کو آخر رات میں صبح صادق سے پہلے پہلے سحری کھانا مسنون اور باعث برکت و ثواب ہے۔ نصف شب کے بعد جس وقت بھی کھائیں سحری کی سنت ادا ہو جائے گی۔ لیکن بالکل آخر شب میں کھانا افضل ہے۔ اگر مؤذن نے صبح سے پہلے اذان دے دی تو سحری کھانے کی ممانعت نہیں جب تک صبح صادق نہ ہو جائے سحری سے فارغ ہو کر روزہ کی نیت دل میں کر لینا کافی ہے اور زبان سے بھی یہ الفاظ کہہ لے تو اچھا ہے بِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ۔

افطاری آفتاب کے غروب ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد افطار میں دیر کرنا مکروہ ہے۔ ہاں جب ابر وغیرہ کی وجہ سے اشتباہ ہو تو دو چار منٹ انتظار کر لینا بہتر ہے اور تین منٹ کی احتیاط بہرحال کرنا چاہیئے۔

کھجور اور خرمے سے افطار کرنا افضل ہے اور کسی دوسری چیز سے افطار کریں تو اس میں بھی کوئی کراہت نہیں۔ افطار کے وقت یہ دعا مسنون ہے اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ اور افطار کے بعد یہ دعا پڑھے ذَهَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔

تراویح ۱ــــــ رمضان المبارک میں عشاء کے فرض اور سنت کے بعد بیس رکعت سنت مؤکدہ ہے۔ ۲ــــــ تراویح کی جماعت سنت علی الکفایہ

ہے۔ محلہ کی مسجد میں جماعت ہوتی ہو اور کوئی شخص علیحدہ اپنے گھر میں اپنی تراویح پڑھ لے
تو سنت ادا ہو گئی، اگرچہ مسجد اور جماعت کے ثواب سے محروم رہا اور اگر محلہ کی مسجد میں
جماعت نہ ہوئی تو سب کے سب ترک سنت کے گنہگار ہوں گے۔ ۳ ——— تراویح
میں پورا قرآن مجید ختم کرنا بھی سنت ہے۔ کسی جگہ حافظِ قرآن سنانے والا نہ ملے یا
ملے مگر سنانے پر اجرت و معاوضہ طلب کرے تو چھوٹی سورتوں سے نماز تراویح ادا
کریں، اُجرت دے کر قرآن نہ سنیں کیونکہ قرآن سنانے پر اجرت لینا اور دینا حرام
ہے۔ ۴ ——— اگر ایک حافظ ایک مسجد میں بیس رکعت پڑھ چکا ہے اس کو دوسری
مسجد میں اسی رات تراویح پڑھنا درست نہیں۔ ۵ ——— جس شخص کی دو چار
رکعت تراویح کی رہ گئی ہوں تو جب امام وتر کی جماعت کرائے اس کو بھی جماعت
میں شامل ہو جانا چاہیے، اپنی باقی ماندہ تراویح بعد میں پوری کرے۔ ۶ ———
قرآن کو اس قدر جلد پڑھنا کہ حروف کٹ جائیں بڑا گناہ ہے، اس صورت میں نہ امام
کو ثواب ہوگا، نہ مقتدی کو۔ ۷ ——— جمہور علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ نابالغ کو تراویح
میں امام بنانا جائز نہیں۔

اعتکاف ۱ ——— اعتکاف اس کو کہتے ہیں کہ اعتکاف کی نیت کر کے
مسجد میں رہے اور سوائے ایسی حاجات ضروریہ کے جو مسجد میں پوری نہ ہو سکیں
(جیسے پیشاب، پاخانہ کی ضرورت یا غسل واجب اور وضو کی ضرورت) مسجد سے
باہر نہ جائے۔ ۲ ——— رمضان کے عشرۂ اخیر میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ علی
الکفایہ ہے۔ یعنی اگر بڑے شہروں کے محلہ میں اور چھوٹے دیہات کی پوری بستی میں
کوئی بھی اعتکاف نہ کرے تو سب کے اوپر ترکِ سنت کا وبال رہتا ہے اور کوئی ایک
بھی محلہ میں اعتکاف کرے تو سب کی طرف سے سنت ادا ہو جاتی ہے۔ ۳ ———
بالکل خاموش رہنا اعتکاف میں ضروری نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ البتہ نیک کلام کرنا اور
لڑائی جھگڑے اور فضول باتوں سے بچنا چاہیے۔ ۴ ——— اعتکاف میں کوئی
خاص عبادت شرط نہیں، نماز، تلاوت یا دین کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا یا جو عبادت

دل چاہے کرتا رہے ۔ ۵ ـــــ جس مسجد میں اعتکاف کیا گیا ہے ، اگر اس میں جمعہ نہیں ہوتا، تو نمازِ جمعہ کے لئے اندازہ کرکے ایسے وقت مسجد سے نکلے جس میں وہاں پہنچ کر سنتیں ادا کرنے کے بعد خطبہ سُن سکے ۔ اگر کچھ زیادہ دیر جامع مسجد میں لگ جائے ،تب بھی اعتکاف میں خلل نہیں آتا ۔ ۶ ـــــ اگر بلا ضرورت طبعیؔ شرعی تھوڑی دیر کو بھی مسجد سے باہر چلا جائے گا تو اعتکاف جاتا رہے گا خواہ عمداً نکلے یا بھول کر ۔ اس صورت میں اعتکاف کی قضا کرنی چاہیئے ۔ ۷ ـــــ اگر آخر عشرہ کا اعتکاف کرنا ہو تو ۲۰ رتاریخ کو غروب آفتاب سے پہلے مسجد میں چلا جائے اور جب عید کا چاند نظر آجائے تب اعتکاف سے باہر ہو ۔ ۸ ـــــ غسلِ جمعہ یا محض ٹھنڈک کے لئے غسل کے واسطے مسجد سے باہر نکلنا مُعتکف کو جائز نہیں ۔

شب قدر چونکہ اس امت کی عمریں بہ نسبت پہلی امتوں کے چھوٹی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک رات ایسی مقرر فرمادی ہے کہ جس میں عبادت کرنے کا ثواب ایک ہزار مہینہ کی عبادت سے بھی زیادہ ہے ، لیکن اس کو پوشیدہ رکھا تاکہ لوگ اس کی تلاش میں کوشش کریں اور ثواب بے حساب پائیں ۔ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں شب قدر ہونے کا زیادہ احتمال ہے یعنی ۲۱ ویں ۲۳ ویں ، ۲۵ ویں ، ۲۷ ویں ، ۲۹ ویں شب ۔ اور ۲۷ ویں شب میں سب سے زیادہ احتمال ہے ۔ ان راتوں میں بہت محنت سے عبادت اور توبہ و استغفار اور دعا میں مشغول رہنا چاہیئے ۔ اگر تمام رات جاگنے کی طاقت یا فرصت نہ ہو تو جس قدر ہو سکے جاگے اور نفل نماز یا تلاوتِ قرآن یا ذکر و تسبیح میں مشغول رہے اور کچھ نہ ہو سکے تو عشاء اور صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنے کا اہتمام کرے ، حدیث میں آیا ہے کہ یہ بھی رات بھر جاگنے کے حکم میں ہو جاتا ہے ، ان راتوں کو صرف جلسوں تقریروں میں صرف کرکے سو جانا بڑی محرومی ہے ، تقریریں ہر رات ہو سکتی ہیں عبادت کا یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا ۔

البتہ جو لوگ رات بھر عبادت میں جاگنے کی ہمت کریں وہ شروع میں کچھ وعظ

سُن لیں، پھر نوافل اور دعا میں لگ جائیں تو دُرست ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہٗ
دار العلوم کراچی ۱۴

ترکیب نمازِ عید

اول زبان یا دل سے نیت کرو کہ دو رکعت نمازِ عید واجب مع چھ زائد تکبیروں کے پیچھے اس امام کے۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لو اور سُبْحَانَکَ تم پڑھو پھر دوسری اور تیسری تکبیر میں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دو۔ چوتھی میں باندھ لو اور جس طرح ہمیشہ نماز پڑھتے ہو پڑھو۔ دوسری رکعت میں سورت کے بعد جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہہ کر پہلی، دوسری اور تیسری دفعہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دو اور چوتھی تکبیر کہہ کر بلا ہاتھ اُٹھائے رکوع میں چلے جاؤ۔ باقی نماز حسب دستور تمام کرو۔ خطبہ سُن کر واپس جاؤ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

مسائلِ زکوٰۃ

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

مسئلہ:۔ اگر کسی کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہے یا اس میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر روپیہ یا نوٹ ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ نقد روپیہ بھی سونے چاندی کے حکم میں ہے اسی طرح سامانِ تجارت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

مسئلہ :۔ کارخانے اور مل وغیرہ کی مشینوں پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے لیکن ان میں جو مال تیار ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح جو خام مال کارخانہ میں سامان تیار کرنے کے لئے رکھا ہے اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے (درمختار و شامی)

مسئلہ :۔ سونے چاندی کی ہر چیز پر زکوٰۃ واجب ہے، زیور، برتن، حتیٰ کہ سچا گوٹہ، ٹھپہ، اصلی زری، سونے چاندی کے بٹن، ان سب پر زکوٰۃ فرض ہے، اگرچہ ٹھپہ گوٹہ اور زری کپڑے میں لگے ہوئے ہوں۔

مسئلہ :۔ کسی کے پاس کچھ روپیہ، کچھ سونا یا چاندی اور کچھ مالِ تجارت ہے لیکن علیٰحدہ علیٰحدہ بقدر نصاب ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے تو سب کو ملا کر دیکھیں اگر اس مجموعہ کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ فرض ہوگی اور اگر اس سے کم رہے تو زکوٰۃ فرض نہیں۔ (ہدایہ)

مسئلہ :۔ ملوں اور کمپنیوں کے شیئرز پر بھی زکوٰۃ فرض ہے بشرطیکہ شیئرز کی قیمت بقدر نصاب ہو یا اس کے علاوہ دیگر مال مل کر شیئر ہولڈر مالک نصاب بن جاتا ہو۔ البتہ کمپنیوں کے شیئرز کی قیمت میں چونکہ مشینری اور مکان اور فرنیچر وغیرہ کی لاگت بھی شامل ہوتی ہے جو درحقیقت زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اس لئے اگر کوئی شخص کمپنی سے دریافت کر کے جس قدر رقم اس کی مشینری اور مکان اور فرنیچر وغیرہ میں لگی ہوئی ہے اس کو اپنے حصے کے مطابق شیئرز کی قیمت میں سے کم کر کے باقی کی زکوٰۃ دے تو یہ بھی جائز اور درست ہے۔ سال کے ختم پر جب زکوٰۃ دینے لگے اس وقت جو شیئرز کی قیمت ہوگی وہی لگے گی (درمختار و شامی)

مسئلہ :۔ پراویڈنٹ فنڈ جو ابھی وصول نہیں ہوا اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے لیکن ملازمت چھوڑنے کے بعد جب اس فنڈ کا روپیہ وصول ہوگا، اس وقت اس روپیہ پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ بشرطیکہ یہ رقم بقدر نصاب ہو یا دیگر مال کے ساتھ مل کر بقدر نصاب ہو جاتی ہو وصولیابی سے قبل کی زکوٰۃ پراویڈنٹ کی رقم پر واجب نہیں، یعنی پچھلے سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

مسئلہ :۔ صاحب نصاب اگر کسی سال کی زکوٰۃ پیشگی دے دے تو یہ بھی جائز ہے، البتہ اگر بعد میں سال پورا ہونے کے اندر مال بڑھ گیا تو اس بڑھے ہوئے مال کی زکوٰۃ علیٰحدہ دینا ہوگی (در مختار و شامی)

جس قدر مال ہے اس کا چالیسواں حصہ (۱/۴۰) دینا فرض ہے یعنی ڈھائی فیصد مال دیا جائے گا۔ سونے، چاندی اور مال تجارت کی ذات پر زکوٰۃ فرض ہے اس کا ۱/۴۰ دے اگر قیمت دے تو یہ بھی جائز ہے مگر قیمت خرید نہ لگے گی، زکوٰۃ واجب ہونے کے وقت جو قیمت ہوگی اس کا ۱/۴۰ دینا ہوگا (در مختار ج ۲)

مسئلہ :۔ ایک ہی فقیر کو اتنا مال دے دینا کہ جتنے مال پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے مکروہ ہے لیکن اگر دے دیا تو زکوٰۃ ادا ہوگئی اور اس سے کم دینا بغیر کراہت کے جائز ہے (ہدایہ ج ۱)

مسئلہ :۔ زکوٰۃ ادا ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ جو رقم کسی مستحق زکوٰۃ کو دی جائے وہ اس کی کسی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ :۔ ادائیگی زکوٰۃ کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کسی مستحق زکوٰۃ کو مالکانہ طور پر دے دی جائے جس میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہو، اس کے مالکانہ قبضہ کے بغیر زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

تمت بالخیر

حُکمُ الاِقساط فی حِیلۃِ الاِسقاط

میت کی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اور مرنے کے بعد دوسرے حقوق کے ادا کرنے کا شرعی طریقہ

حیلۂ اسقاط کی شرعی حیثیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی؛

میت کی فوت شدہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے واجبات و فرائض کی ادائیگی یا کفارہ کس طرح کیا جاسکتا ہے جس سے وہ گناہ سے سبکدوش ہوجائے، اس کا بیان کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، جس کا کچھ خلاصہ فائدہ عوام کے لئے اس رسالہ کے آخر میں لکھ دیا جائے گا۔

لیکن آج کل بہت سے شہروں اور دیہات میں لوگوں نے ایک رسم نکالی ہے جس کو دَور یا اسقاط کہتے ہیں، اور جاہلوں کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ اس رسم کے ذریعہ تمام عمر کی نماز، روزے اور زکوٰۃ و حج اور تمام فرائض و واجبات سے سبکدوشی ہوجاتی ہے اور اس رسم کو ایسی سخت پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے جیسے تجہیز و تکفین کا کوئی اہم فرض ہو، جو کوئی نہیں کرتا اس کو طرح طرح کے طعنے دیتے ہیں۔

بلاشبہ فقہاء کے کلام میں دَور و اسقاط کی صورتیں مذکور ہیں، لیکن وہ جن شرائط کے ساتھ مذکور ہیں، عوام نہ اُن شرائط کو جانتے ہیں، نہ ان کی کوئی رعایت کی جاتی ہے، بلکہ فوت شدہ فرائض و واجبات سے متعلقہ تمام احکام شرعیہ کو نظر انداز کر کے اس رسم کو تمام فرائض و واجبات سے سبکدوشی کا ایک آسان نسخہ بنالیا گیا ہے جو چند پیسوں میں حاصل ہوجاتا ہے، پھر کسی کو کیا ضرورت رہی کہ عمر بھر نماز روزہ کی محنت اٹھائے۔

اس مسئلہ کے متعلق کچھ عرصہ ہوا کہ ایک سوال مخدوم محترم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب دامت برکاتہم مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور کے پاس آیا تھا، آپ نے جواب لکھنے کے لئے میرے سپرد فرمایا، یہ جواب کسی قدر مفصل اور کافی ہو گیا، اس لئے اس رسم میں ابتلاء عام کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا کہ اس کو بصورت رسالہ شائع کر دیا جائے، خدا کرے کہ یہ مسلمانوں کو جاہلانہ رسوم سے بچانے میں مفید ثابت ہو۔ واللہ الموفق والمعین۔

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ ہمارے علاقہ میں یک حیلہ مروج ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ جنازہ کے بعد کچھ لوگ دائرہ بناتے ہیں، میت کے وارث ایک قرآن شریف اور اس کے ساتھ کچھ نقد باندھتے ہیں، اور دائرہ میں لاتے ہیں، امام مسجد جو دائرہ میں ہوتا ہے وہ لیتا ہے، اور یہ الفاظ اس پر پڑھتا ہے کل حق من حقوق اللہ من الفرائض والواجبات والکفارات والمنذورات بعضہا ادیت وبعضہ لم تؤد الآن عاجز عن ادائہا واعطیت ہذہ المنحۃ الشریفۃ علیٰ ہذہ النقودات فی حیلۃ الاسقاط رجاءً من اللہ تعالیٰ ان یغفر لہ اور ایک دوسرے کی ملک کرتا ہے۔ تین دفعہ اس کو پھیرا جاتا ہے، بعدہ نصف امام کو اور نصف غرباء کو تقسیم کیا جاتا ہے، زید ایک امام مسجد ہے، اس نے اس مروجہ حیلہ کو چھوڑ دیا ہے اور کہتا ہے کہ اس مروجہ حیلہ کا ثبوت ادلہ شرعیہ سے کوئی نہیں، لہٰذا یہ بات بدعت ہے۔ زید کے ترک پر زید کو لوگ ملامت کرتے ہیں، اور زید باوجود حنفی المذہب ہونے کے اس کو وہابی کہتے ہیں اور اس حیلہ کے جواز پر آباء و اجداد کی دلیل لاتے ہیں، آیا زید حق پر ہے یا باطل پر، اس مروجہ حیلہ کا کیا حکم ہے زید اس رواج اور اس التزام و اصرار کو ختم کرنے کا شرعاً حق دار اور مصیب ہوگا یا نہیں نیز بعض صورتوں میں مشترک ترکہ میں سے روپیہ دیا جاتا ہے، جس میں بعض ورثہ موجود نہیں ہوتے نیز بعض دفعہ یتیم بچے رہ جاتے ہیں کیا یہ مال حیلہ میں دیا جا سکتا ہے یا نہیں اور دائرہ والے لے سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا بدلائل الشریعۃ۔

الجواب

حیلہ اسقاط یا دور بعض فقہاء کرام نے ایسے شخص کے لئے تجویز فرمایا تھا جس کے کچھ نماز روزے وغیرہ اتفاقاً فوت ہو گئے، قضاء کرنے کا موقع نہیں ملا، اور موت کے وقت وصیت کی لیکن اس کے ترکہ میں اتنا مال نہیں جس سے تمام فوت شدہ نماز روزہ وغیرہ کا فدیہ ادا کیا جا سکے، یہ نہیں کہ جس کے ترکہ میں مال موجود ہو اس کو تو وارث بانٹ کھائیں، اور تھوڑے سے پیسے لے کر یہ حیلہ حوالہ کر کے خدا و خلق کو فریب دیں، در مختار، شامی وغیرہ کتب فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اور ساتھ ہی اس حیلہ کی شرائط میں اس کی تصریحات واضح طور پر فرمائی ہیں کہ جو رقم کسی کو صدقہ کے طور پر دی جائے اس کو اس رقم کا حقیقی طور پر مالک و مختار بنا دیا جائے کہ جو چاہے کرے، ایسا نہ ہو کہ ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ پر دینے کا محض ایک کھیل کیا جائے، جیسا عموماً آج کل اس حیلہ میں کیا جاتا ہے، کہ نہ دینے والے کا یہ قصد ہوتا ہے کہ جس کو وہ دے رہے ہیں وہ صحیح معنی میں اس کا مالک و مختار ہے اور نہ لینے والے کو یہ تصور و خیال ہو سکتا ہے کہ جو رقم میرے ہاتھ میں دی گئی ہے میں اس کا مالک و مختار ہوں۔

دو تین آدمی بیٹھتے ہیں اور ایک رقم کو باہمی ہیرا پھیری کا ایک ٹوٹکا سا کر کے اُٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے میت کا حق ادا کر دیا، اور وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گیا حالانکہ اس لغو حرکت سے میت کو نہ تو کوئی ثواب پہنچا، نہ اُس کے فرائض کا کفارہ ادا ہوا، کرنے والے مفت میں گناہ گار ہوئے۔

رسائل ابن عابدین میں اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ منۃ الجلیل کے نام سے شامل ہے اس میں تحریر ہے:۔

ویجب الاحتراز من ان یدیرھا جنبی الا بوکالۃ کما ذکرنا وان یکون الوصی او الوارث کما علمت، ویجب الاحتراز من ان یلاحظ الوصی عند دفع الصرۃ للفقیر الھزل او الحیلۃ بل یجب ان یدفعھا عازما علی تملیکہا منہ حقیقۃ لا تحیلا ملاحظا ان الفقیر اذا ابی عن ھبتہا الی الوصی کان لہ ذلک ولا یجبر علی الھبۃ (منۃ الجلیل فی اسقاط

الغرض اس حیلہ کی ابتدائی بنیاد ممکن ہے کہ کچھ صحیح اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہو لیکن جس طرح کا رواج اور التزام آج کل چل گیا ہے، وہ بلاشبہ ناجائز اور بہت سے مفاسد پر مشتمل قابل ترک ہے، چند مفاسد اجمالی طور پر لکھے جاتے ہیں۔

(۱) بہت مواقع میں اس کے لئے جو قرآن مجید اور نقد رکھا جاتا ہے وہ میت کے متروکہ مال میں سے ہوتا ہے، اور اس کے حق دار وارث بعض موجود نہیں ہوتے یا نابالغ ہوتے ہیں تو ان کے مشترکہ سرمایہ کو بغیر اُن کی اجازت کے اس کام میں استعمال کرنا حرام ہے، حدیث میں ہے لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منہ اور نابالغ تو اگر اجازت بھی دیدے تو وہ شرعاً نامعتبر ہے اور ولی نابالغ کو ایسے تبرعات میں اس کی طرف سے اجازت دینے کا اختیار نہیں بلکہ ایسے کام میں اس مال کا خرچ کرنا حرام ہے بنص قرآن شریف آیت کریمہ ان الذین یاکلون اموال الیتمی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارًا (ترجمہ "جو لوگ یتیموں کے مال ظلماً خرچ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں" سے ثابت ہے کہ ایسے مال کا دینا اور لینا دونوں حرام ہیں۔

(۲) اگر بالفرض مال مشترک نہ ہو یا سب وارث بالغ ہوں، اور سب نے اجازت بھی دی ہو تو تجربہ شاہد ہے کہ ایسے حالات میں یہ معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا کہ اُن سب نے بطیب خاطر اجازت دی ہے یا برادری اور کنبہ کے طعنوں کے خوف سے اجازت دی ہے، اور اس قسم کی اجازت حسب تصریح حدیث مذکور کالعدم ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض یہ سب باتیں بھی نہ ہوں سب بالغ ورثا نے بالکل خوش دلی کے ساتھ اجازت دے دی ہو یا کسی ایک ہی شخص وارث یا غیر وارث نے اپنی ملک خاص سے اس کا انتظام کیا ہے تو مفاسد ذیل سے وہ بھی خالی نہیں۔ مثلاً اس حیلہ کی فقہی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو اوّل یہ قرآن اور نقد دیا جاتا ہے اس کی ملک کر دیا جائے اور پوری وضاحت سے اس کو تبلا دیا جائے کہ اب تم مالک ومختار ہو جو چاہو کرو پھر وہ اپنی خوشی سے بلا کسی رسمی دباؤ یا لحاظ ومروّت کے میت کی طرف سے کسی دوسرے شخص کو اسی طرح دیدے اور مالک بنادے اور پھر وہ شخص اسی طرح کسی تیسرے چوتھے کو دے دے لیکن مروجہ رسم میں اس کا کوئی لحاظ

نہیں ہوتا، اوّل تو جس کو دیا جاتا ہے، نہ دینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی ملک ہو گیا، اور وہ اس میں مختار ہے نہ لینے والے کو اس کا کوئی خطرہ پیدا ہوتا ہے جس کی عملی علامت یہ ہے کہ اگر یہ شخص اس وقت یہ نقد لے کر چل دے اور دوسرے کو نہ دے تو دینے والے حضرات ہرگز اس کو برداشت نہ کریں، اور ظاہر ہے اس صورت میں تملیک صحیح نہیں ہوتی، اور بدون تملیک کے کوئی قضا یا کفارہ یا فدیہ معاف نہیں ہوتا، اسی لئے یہ حرکت بے کار ہو جاتی ہے۔

(۴) مذکورہ صورت میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس شخص کو مالک بنایا جائے وہ مصرف صدقہ ہو، صاحبِ نصاب نہ ہو مگر عام طور پر اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا عموماً ائمہ مساجد جو صاحبِ نصاب ہوتے ہیں، انہی کے ذریعہ یہ کام کیا جاتا ہے اس لئے بھی یہ سارا کاروبار لغو و غلط ہو جاتا ہے، میت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

(۵) اور اگر بالفرض مصرفِ صدقہ کا بھی صحیح انتخاب کر لیا جائے اور ان کو پورا مسئلہ بھی معلوم ہو کہ وہ قبضہ کرنے کے بعد اپنے آپ کو مالک و مختار سمجھے پھر میت کی خیر خواہی کے پیشِ نظر وہ دوسرے کو اور اسی طرح دوسرا تیسرے چوتھے کو دیتا چلا جائے تو آخر میں وہ جس شخص کے پاس پہنچتا ہے وہ اس کا مالک و مختار ہے، اس سے واپس لے کر آدھا امام کو اور آدھا دوسرے فقراء کو تقسیم کرنا ملک غیر میں بلا اس کی اجازت کے تصرف کرنا ہے، جو ظلم اور حرام ہے، حسب تصریح حدیث مذکور۔

(۶) اور بالفرض یہ آخری شخص اس کی تقسیم اور حصے بخرے لگانے پر آمادہ بھی ہو جائے اور فرض کرو کہ اس میں دباؤ سے نہیں دل سے ہی راضی ہو جائے تو پھر بھی اس طرح کے حیلہ کا ہر میت کے لئے التزام کرنا اور جیسے تجہیز و تکفین جیسے واجبات شرعیہ ہیں، اسی طرح اسی درجہ میں اس کو اعتقاداً ضروری سمجھنا یا عملاً ضروری کے درجہ میں التزام کرنا یہی احداث فی الدین ہے، جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں، اور جو اپنی معنوی حیثیت سے شریعت میں ترمیم و اضافہ ہے نعوذ باللہ

نیز اس حیلہ کے التزام سے عوام الناس اور جہلا کی یہ جرأت بھی بڑھ سکتی ہے کہ تمام عمر بھی نہ نماز پڑھیں، نہ روزہ رکھیں نہ حج کریں نہ زکوٰۃ دیں، مرنے کے بعد چند پیسوں کے خرچ

سے یہ سارے مفاد حاصل ہوجائیں گے، جو سارے دین کی بنیاد منہدم کر دینے کے مترادف ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو دین کے صحیح راستہ پر چلنے اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

مذکور الصدر اجمالی مفاسد کو دیکھ کر بھی یہ فیصلہ کر لینا کسی مسلمان کے لئے دشوار نہیں کہ یہ حیلے حوالے اور اس کی مروجہ رسوم سب ناواقفیت پر مبنی ہیں میت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں، اور کرنے والے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

محمد شفیع عفا اللہ عنہ، ربیع الاول ۱۳۷۰ھ

مسائل فدیۂ نماز وروزہ وغیرہ

مسئلہ جس شخص نے نماز روزہ یا حج زکوٰۃ وغیرہ کی کوئی وصیت کی تو یہ وصیت اس کے ترکہ کے صرف ایک تہائی حصہ میں جاری کرنا وارثوں پر لازم ہوگا، ایک تہائی ترکہ سے زائد کی وصیت ہو تو وہ سب وارثوں کی اجازت و رضامندی پر موقوف ہے اگر وہ سب یا اُن میں کوئی اجازت نہ دے تو مشترکہ ترکہ سے وصیت پوری نہیں کی جاسکتی، اور اگر وارثوں میں کوئی نابالغ ہے تو اس کی اجازت بھی معتبر نہیں، اس کے حصہ پر ایک تہائی سے زائد کی وصیت کا کوئی اثر نہ پڑنا چاہیے ہدایہ عالمگیری، شامی وغیرہ۔ **مسئلہ** جس شخص نے وصیت کی ہو اور مال بھی اتنا چھوڑا ہو کہ اس کے ایک تہائی میں ساری وصیتیں پوری ہوسکیں تو وصی اور وارثوں کے ذمہ واجب ہے کہ اس وصیت کو پورا کریں، اس میں کوتاہی کریں یا میت کا مال موجود ہوتے ہوئے اس کے نماز روزہ کے فدیہ میں حیلہ حوالہ پر اعتماد کر کے مال کو خود تقسیم کریں تو گناہ اُن کے ذمہ رہے گا **مسئلہ** وصیت کرنے کی صورت میں واجبات و فرائض کی ادائیگی کی یہ صورت ہوگی۔

۱- ہر روز کی نمازیں وتر سمیت چھ گنی جائیں گی، اور ہر نماز کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی یعنی ایک دن کی نمازوں کا فدیہ ساڑھے دس سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی۔

۲ ہر روزہ کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی، رمضان کے روزوں کے

علاوہ اگر کوئی نذر (منت) مانی ہوئی ہے تو اس کا بھی فدیہ دینا ہوگا۔

۳۔ زکوٰۃ جتنے سال کی اور جتنی مقدار مال کی رہی ہے اس کا حساب کر کے ادا کرنا ہوگا۔

۴۔ حج فرض اگر ادا نہیں کر سکا تو میت کے مکان سے کسی کو حج بدل کے لئے بھیجا جائے گا اور اس کا پورا کرایہ وغیرہ تمام مصارف ضروریہ ادا کرنے ہوں گے۔

۵۔ کسی انسان کا قرض ہے تو اس کو حق کے مطابق ادا کرنا ہوگا۔

۶۔ جتنے صدقۃ الفطر رہے ہوں ہر ایک کے پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کی جائے۔

۷۔ قربانی کرنی رہ گئی ہو تو اس سال میں ایک بکرے یا ایک حصۂ گائے کی قیمت کا اندازہ کر کے صدقہ کیا جائے (منحۃ الجلیل)

۸۔ سجدۂ تلاوت رہ گئے ہوں تو احتیاط اس میں ہے کہ ہر سجدہ کے بدلے پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت کا صدقہ کیا جائے۔

۹۔ اگر فوت شدہ نماز یا روزوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو تو تخمینہ سے حساب کیا جائیگا۔

یہ سب احکام اس صورت کے ہیں جس میں مرنے والے نے وصیت کر دی ہے اور بقدر وصیت مال چھوڑا ہو اور اگر وصیت ہی نہیں کی یا ادائے وصیت کے مطابق کافی ترکہ نہیں ہے تو وارثوں پر اس کے فرائض و واجبات کا فدیہ ادا کرنا لازم نہیں، ہاں وہ اپنی خوشی سے ہمدردی کرنا چاہیں تو موجب ثواب ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ خادم الحرم۔ کراچی

یہ رسم نہایت قبیح اور واجب ترک ہے	الجواب صحیح۔ ابو احمد عزیز الدین
بندہ احتشام الحق تھانوی	خطیب جامع مسجد راولپنڈی
للہ در المجیب اتی بتحقیق عجیب	الجواب صواب۔ محمد حسن
محمد ضیاء الحق مدرسہ اشرفیہ لاہور	خادم جامعہ اشرفیہ۔ لاہور

الجواب صحیح۔ خیر محمد جالندھری
خیر المدارس ملتان شہر

تاریخ تالیف ——— ۱۰ شوال سنہ ۱۳۸۶ھ
مقام تالیف ——— دار العلوم کراچی ۱۴
اشاعت اوّل ——— البلاغ ذیقعدہ سنہ ۱۳۹۳ھ
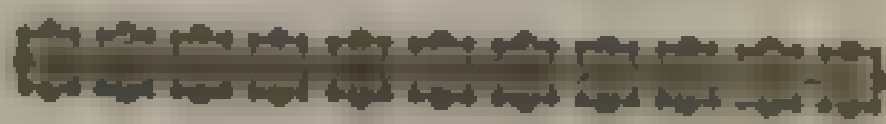
رویت ہلال کے احکام سے ناواقفیت کی وجہ سے عید کے موقع پر متعدد دفعہ خلفشار رہا۔ زیر نظر مضمون "رؤیت ہلال کے متعلق وہ احکام اور تجاویز مذکور ہیں جن پر عمل کر کے انتشار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس مسئلہ پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا ایک مستقل رسالہ "رویت ہلال" کے نام سے الگ ہے جو زیادہ مفصل ہے اور کئی بار شائع ہو چکا ہے۔

☆☆ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی

☆☆ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

☆☆ مولانا محمد یوسف بنوری صاحب

☆☆ مولانا مفتی رشید احمد صاحب

رؤیتِ ہلال کے شرعی احکام

اور اس مسئلہ میں ملک کو انتشار سے بچانے کی تجویز

کئی سال سے عید الفطر کے موقع پر پورے پاکستان میں عجیب طرح کا انتشار و افتراق پھیلتا ہے، مرکزی ہلال کمیٹی کے اعلان کا مقصد تو یہ تھا کہ سارے ملک میں ایک دن عید ہو اور واقعہ یہ ہونے لگا کہ ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبہ میں دو دو عیدیں ہونے لگیں یعنی عید کے دن جو اظہارِ محبت و مسرت کا دن ہے اس میں باہمی اختلاف اور جھگڑا و لڑائی کے مظاہرے ہونے لگے جس کو کوئی سمجھ دار انسان کسی ملک کے لئے پسند نہیں کر سکتا۔

اس سے زیادہ مضرت رساں وہ بحثیں ہیں جو عید کے بعد ہفتوں تک اخباروں میں چلتی ہیں، سرکاری حلقوں سے علماء کو مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی مقاصد کے لئے بالقصد انتشار پھیلاتے ہیں، دوسری طرف سے حکومت پر یہ الزام لگائے جاتے ہیں کہ حکومت جان بوجھ کر مسلمانوں کی عبادات کو مختل اور دینی معاملات کے ساتھ مذاق کرتی ہے

لیکن ذرا بھی غور اور انصاف سے کام لیا جائے تو یہ دونوں الزام غلط اور بالکل بے جا ہیں، علماء میں بہت بڑی تعداد ایسے علماء کی ہے جن کا سیاست سے کوئی

دُور کا بھی علاقہ نہیں اور نہ ان کی کسی ذاتی غرض کا کوئی شبہ ہو سکتا ہے، اسی طرح حکومت کے ارکان و افراد میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خود روزے رکھتے اور دینی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ ان پر کیسے یہ بدگمانی کی جا سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر خلقِ خدا کے روزوں کا وبال اپنے سر لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں، وجہ شاید یہ ہے کہ سرکاری حلقوں کے حضرات اس کو ایک خاص تہوار اور انتظامی معاملہ سمجھتے ہیں جس میں علماء کی کوئی مداخلت ان کو گوارا نہیں، دوسرے یہ کہ وہ اس معاملہ میں صرف خبرِ صادق جس پر سننے والوں کو یقین ہو جائے اعلان کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور اس فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اپنے یقین کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے صرف خبرِ صادق کافی نہیں ہوتی بلکہ شرعی شہادت ضروری ہے جس کے لئے خاص شرائط اور قواعد ہیں اور علماء یہ جانتے ہیں کہ ہماری عید عام قوموں کے تہواروں کی طرح ایک تہوار نہیں بلکہ ایک عبادت کا ختم اور دوسری عبادت کا شروع کرنا ہے جس میں شریعت کے بتلائے ہوئے اصول سے مختلف کوئی صورت جائز نہیں اور کوئی خبر کتنی ہی سچی اور قابلِ اعتماد ہو اور سننے والوں کو اس پر پورا یقین ہو مگر وہ اپنے اس یقین کو پورے ملک پر اس وقت تک مسلط اور لازم نہیں کر سکتا جب تک حجت شرعیہ اور باقاعدہ شہادت نہ ہو اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور شرعی اصول کے مطابق رؤیت ہلال کے اعلان کے لئے ملک کے ماہرین فتوی علماء کے مشورے سے ایسا ضابطہ کار بنایا جائے جس پر تمام علماء اور عوام کو اطمینان ہو سکے اور پھر اس ضابطہ کا سب کو پابند بنایا جائے اور اسی ضابطہ کے تحت ریڈیو پر اعلان کیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ایسا کر لیا گیا تو ملک کے کسی گوشہ سے سرکاری اعلان کے خلاف کوئی آواز نہ اُٹھے گی۔ ہر طبقہ کے علماء اس کی موافقت کریں گے اور ملک میں عیش و مسرت اور وحدت و اتفاق کے ساتھ ایک ہی دن عید ہوا کرے گی۔ اگرچہ شرعی حیثیت سے اس کی کوئی

اہمیت نہیں کہ پورے ملک میں عید ایک ہی دن ہو۔ اسلام کے قرون اولیٰ میں اس وقت کے موجودہ ذرائع مواصلات کو بھی اس کام میں استعمال کرنے اور عید ایک ہی دن منانے کا کوئی اہتمام نہیں ہوا اور ملک کے وسیع وعریض ہونے کی صورت میں شدید اختلاف مطالع کی مشکلات بھی اس میں پیش آسکتی ہیں۔

لیکن پاکستان کے عوام اور حکومت کی اگر یہی خواہش ہے کہ عید پورے پاکستان میں ایک ہی دن ہو تو شرعی اعتبار سے اس کی بھی گنجائش ہے۔ شرط یہ ہے کہ عید کا علان پوری طرح شرعی ضابطۂ شہادت کے تابع ہو۔

رؤیت ہلال کے لیے شرعی ضابطہ شہادت جس پر تقریباً امت کے چاروں مذہب حنفی، شافعی، مالکی حنبلی اور جمہور علمائے سلف و خلف کا اتفاق رہا ہے ذیل میں لکھا جاتا ہے جس کا مقصد ایک تو یہ ہے کہ انصاف پسند طبقہ یہ محسوس کرے کہ ہلال کمیٹی کے حالیہ اعلان سے علماء کا اختلاف درحقیقت کسی ضد یا سیاسی غرض کے لئے نہیں بلکہ اصولِ شرعیہ کی مجبوری سے عمل میں آیا۔ دوسرے یہ کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات توجہ فرما کر ملک کے ہر مکتبۂ فکر کے مستند علماء کے مشورہ سے اس ضابطہ کے تحت مرکزی ہلال کمیٹی کا ایسا ضابطہ کار بنا دیں جس پر ملک کے علماء اور عوام مطمئن ہو کر عمل کر سکیں۔ اس ضابطہ شرعیہ کی تفصیل لکھنے سے پہلے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے جو شہادت کی اصل بنیاد ہے۔

خبر صادق اور شہادت میں فرق

کسی معاملہ کے متعلق ایک ثقہ معتبر آدمی زبانی خبر دے یا ٹیلیفون پر بتلائے اور اس کی آواز پہچانی جائے یا خط میں لکھے اور خط پہچانا جائے تو مخاطب کو اس خبر کے سچے ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا بلکہ خود اس کو یقین کامل ہو جاتا ہے اور اس کے مقتضی پر عمل کرنا اپنی حد تک اس کے لئے جائز بھی ہے اور عام معاملات میں سادی دنیا اس پر عمل بھی کرتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اس یقین کو دوسروں پر لازم

اور مسلط کرنا چاہے اور چاہے کہ سب اس کو تسلیم کریں تو شریعت اور موجودہ قانون میں اس کے لئے ضابطۂ شہادت قائم ہونا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی قاضی یا حاکم اپنے یقین کو دوسروں پر مسلط نہیں کر سکتا۔

ایک جج کو ذاتی طور پر کسی مقدمہ کے متعلق ایک امر پر کتنا بھی یقین بلکہ مشاہدہ ہو مگر وہ اپنے یقین کی بنا پر مقدمہ کا فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک باقاعدہ شہادت کی شرائط پوری کر کے اسے ثابت نہ کرے اور اس شہادت میں کسی عدالت کے نزدیک ٹیلیفون کا بیان کافی نہیں سمجھا جاتا بلکہ گواہ کا عدالت میں حاضر ہونا شرط ہے دنیا کی عدالتوں کا موجودہ ضابطہ شہادت اس معاملہ میں بالکل قرآنی اور اسلامی ضابطہ کے مطابق ہے کہ شاہدوں کا قاضی یا حاکم کے سامنے حاضر ہونا ضروری ہے ٹیلیفون پر کسی خبر کا بیان کرنا کتنا ہی قابل اعتماد ہو شہادت کے لئے کافی نہیں۔

حالیہ واقعہ میں مرکزی ہلال کمیٹی کا فیصلہ علماء کے نزدیک اسی لئے ناقابل قبول ٹھہرا کہ ہلال عید کے لئے باتفاق اُمّت شہادت شرط ہے محض خبر صادق کافی نہیں اور مرکزی کمیٹی نے صرف ٹیلیفون کی خبر پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا اس کی کوشش نہیں کی کہ گواہ کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر گواہی دیتے یا کمیٹی کا کوئی معتمد عالم وہاں جا کر ان سے روبرو گواہی لیتا اور پھر شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کر لیتا اگر ایسا کر لیا جاتا تو کسی عالم کو اس سے اختلاف نہ ہوتا۔

ضابطۂ شہادت کی یہ باریکیاں موجودہ عدالتیں بھی جانتی ہیں اور مانتی ہیں مگر عوام کو ان میں فرق محسوس کرنا آسان نہیں اس لئے طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

ہلال عید کے متعلق شرعی ضابطۂ شہادت

جب چاند کی رؤیت عام نہ ہو سکے صرف دو چار آدمیوں نے دیکھا ہو تو یہ صورت حال[1] اگر ایسی فضا میں ہو کہ مطلع بالکل صاف ہو، چاند دیکھنے سے کوئی بادل یا دھواں غبار وغیرہ مانع نہ ہو تو ایسی صورت میں صرف دو تین آدمیوں کی رؤیت اور شہادت شرعاً

[1]

اس ضابطہ شہادت میں عملی اور انتظامی طور پر اگر کوئی مشکل پیش آسکتی ہے تو وہ صرف آخری صورت یعنی شہادت علی القضاء میں ہے کہ اس میں ایک شہری ذیلی کمیٹی کے فیصلہ کو مرکزی کمیٹی تک پہنچانے کے لئے دو گواہوں کا وہاں جانا ضروری ہے جو اگرچہ ہوائی جہاز کے دور میں کچھ مشکل نہیں تاہم ایک مشقت سے خالی نہیں۔

اس دشواری کا حل تلاش کرنے کے لئے مندرجہ ذیل علماء کے اجتماع میں غور کیا گیا یہ شہادت علی القضاء کس حد تک ضروری ہے اور آیا اس میں کوئی سہولت نکل سکتی ہے یا نہیں۔

مذاہب اربعہ اور جمہور علماء کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے یہ علماء اس نتیجہ پر پہنچے کہ اصولی طور پر تو ذیلی ہلال کمیٹی کا فیصلہ مرکزی ہلال کمیٹی کے لئے اسی وقت قابل تنفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ فیصلہ دوسرے قاضی کے پاس شرعی شہادت کے ساتھ دو گواہ لے کر پہنچیں، صرف ٹیلیفون وغیرہ پر اس کی خبر دے دینا کافی نہیں جمہور فقہاء امت حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ حنبلیہ کا اصل مذہب یہی ہے، ہدایہ کتاب الام امام شافعی رح مغنی ابن قدامۃ حنبلی وغیرہ میں اس کی تصریحات درج ہیں اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ حکومت اس اصول کے مطابق کوئی انتظام کرے لیکن علماء کے اس اجتماع میں اس پر غور کیا گیا کہ اگر حکومت اس میں دشواریاں محسوس کرے تو کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر اس کا ایک ایک حل یہ نکالا گیا کہ:

حکومت ہر بڑے شہر میں ذیلی کمیٹیاں قائم کرے ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسے مستند علماء کو ضرور لیا جائے جو شرعی ضابطہ شہادت کا تجربہ رکھتے ہیں اور ہر ذیلی کمیٹی کا کام صرف شہادت مہیا کرنا نہ ہو بلکہ اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے جب یہ ذیلی کمیٹی اگر باقاعدہ شہادتیں لے کر کوئی فیصلہ کر دیتی ہے تو فیصلہ شہادت کی بنا پر ہو چکا، اب صرف اعلان کا کام باقی ہے اس کے لئے شہادت ضروری نہیں بلکہ ذیلی کمیٹی کا کوئی ذمہ دار آدمی مرکزی کمیٹی کو ٹیلی فون پر محتاط طور پر جس میں کسی مخصوص

کا خطرہ نہ رہے ذیلی کمیٹی کے اس فیصلہ کی اطلاع دے دے اور مرکزی کمیٹی اس صورت میں اس کو اپنا فیصلہ کہہ کر نہیں بلکہ ذیلی کمیٹی کا فیصلہ بتلا کر اس طرح نشر کرے کہ مرکزی کمیٹی کے سامنے اگرچہ کوئی شہادت نہیں آئی بلکہ فلاں ذیلی کمیٹی نے جس میں فلاں فلاں علماء شریک ہیں شہادت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے ہم اس فیصلہ پر اعتماد کر کے اعلان کر رہے ہیں۔ اس صورت میں مرکزی کمیٹی کا یہ اعلان ٹیلیفون سے آئی ہوئی اطلاع پر درست ہو سکتا ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ	ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ
۱۰/۱۰/۸۶ھ	۱۳/شوال ۱۳۸۶ھ
محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ	رشید احمد عفی عنہ
۱۳/شوال ۱۳۸۶ھ	۱۳/شوال ۱۳۸۶ھ

ارجح الاقاویل

فی

احکم الموازین والمکاییل

اوزانِ شرعیہ

اس رسالہ میں تحریر فرمودہ اوزان ہندوستانی
سابقہ اوزان کے مطابق ہیں. ہنز ہیں گرام کے
جدید اعشاریہ نظام کے مطابق حساب لگالیا جائے

مقام تالیف ———— دیوبند

تاریخ تالیف ———— ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ

اشاعتِ اوّل ———— دارالاشاعت دیوبند ۱۳۶۱ھ

اشاعتِ دوم ———— دیوبند ۱۳۶۴ھ

اشاعت سوم ———— ادارۃ المعارف کراچی ۱۳۸۲ھ

اشاعت چہارم ———— 〃 〃 〃 ۱۳۹۱ھ

"اس مقالہ میں درہم، دینار، صاع، مُد، ذراع، میل وغیرہ کی مکمل تحقیق اور مروجہ اوزان و پیمانوں کے مطابق ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے نیز حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ کی تحقیق پر مفصل تنقید ہے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ لاسیما
علیٰ سیدنا محمد المصطفیٰ ومن بھدیہ اھتدیٰ

شریعت کے بہت سے احکام ناپ تول سے متعلق ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اوزان اور پیمانوں کے مطابق ارشاد فرمایا ہے۔ مثلاً

صاع، مُد، اوقیہ، درہم، دینار، مثقال وغیرہ

بلاد ہند و پاکستان میں دوسری طرح کے اوزان اور پیمانے رائج ہیں اس لئے ان احکام کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ شرعی اوزان اور پیمانوں کی مقداریں ہند و پاکستان کے مروجہ اوزان اور پیمانوں سے بتلائی جائیں

چاندی کا نصاب - باون تولہ چھ ماشہ
سونے کا نصاب - ساڑھے سات تولہ
ایک صاع = انشی تولہ کے سیر سے ساڑھے تین سیر
نصف صاع = " " " پونے دو سیر

لیکن حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر علماء لکھنؤ کی تحقیق اس بارہ میں متفاوت ہے اور تفاوت بھی معمولی نہیں کیونکہ چاندی کا نصاب ان کے نزدیک صرف چھتیس تولہ ساڑھے پانچ ماشہ اور سونے کا پانچ تولہ اڑھائی ماشہ اور نصف صاع تقریباً ایک سیر پندرہ تولہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اس تفاوت عظیم کا اثر اموال سے متعلقہ تمام احکام شرعیہ پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ اسی بناء پر عام مسلمانوں میں یہ سوال مدت سے دائر ہے پھر ۱۳۶۱ھ ہجری میں خصوصاً دارالافتاء دارالعلوم (دیوبند) میں بیک وقت اس کے متعلق بہت سے سوالات جمع ہو گئے۔ نیز رمضان المبارک میں رہبر دکن کے ایک پرچے سے معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد میں علماء

(۲) فی الدر المختار الدینار عشرون قیراطاً والدرهم اربعة عشر قیراطاً والقیراط خمس شعیرات فیکون الدرهم الشرعی سبعین شعیرة والمثقال مائة شعیرة اھ قال الشامی تحته شعیرة معتدلة لم تقشر وقطع من طرفیها مادق وطال (رد مختار مع الشامی ص ۳۰ ج ۲) ومثله فی البحر الرائق ص ۲۲۷ ج ۲) و مثله فی شرح الوقایه و مجمع الانهر وجامع الرموز۔

۲۔ در مختار میں ہے کہ دینار بیس قیراط اور درہم چودہ قیراط کا ہے اور قیراط پانچ جَو کا۔ پس درہم شرعی ستر جَو اور مثقال سو جَو کا ہو گیا۔

علامہ شامی نے اس قول کی شرح میں فرمایا کہ یہ جَو معتدل اور میانہ ہونے چاہئیں جن کا چھلکا نہ اتارا گیا ہو اور اُس کے دونوں طرف سے جو لمبا تنکا دم کی طرح ہوتا ہے وہ قطع کر دیا گیا ہو۔

اور یہی مضمون بحر الرائق، شرح وقایہ، مجمع الانہر، جامع الرموز میں بھی مذکور ہے۔

(۳) و فی الدر المختار الصاع المعتبر ما یسع الفاً و اربعین درهماً من ماش او عدس اھ۔ قال الشامی اعلم ان الصاع اربعة امداد والمد رطلان والرطل نصف من والمن بالدرهم مائة وستون درهماً وبالاستار اربعون۔ والاستار بکسر الهمزة بالدرهم ستة ونصف وبالمثقال اربعة ونصف کذا فی درر البحار فالمد والمن سواء کل منهما ربع صاع رطلان بالعراقی والرطل مائة وستون درهماً واختلف

۳۔ اور در مختار میں ہے کہ وہ صاع جو احکام شرعیہ میں معتبر ہے وہ پیمانہ ہے جس میں ایک ہزار ۴۰ درہم کے برابر ماش یا مسور سما جائے۔ علامہ شامی نے اس قول کی شرح میں لکھا کہ صاع چار مُد کا اور مُد دو رطل اور رطل نصف من (باصطلاح حجازی) اور ایک من درہم کے حساب سے ایک سو ساٹھ ۱۶۰ درہم ہے اور استار کے حساب سے ۴۰ استار اور اِستار بکسر ہمزہ بحساب درہم ساڑھے چھ درہم کی برابر اور بحساب مثقال ساڑھے چار مثقال کی برابر۔ کذا فی درر البحار۔ پس مُد اور من برابر ہیں ہر ایک اُن میں سے چوتھائی صاع کی برابر ہے جو دو رطل عراقی کے برابر ہے اور رطل ایک سو ساٹھ درہم کی برابر اور صاع کے وزن میں اختلاف ہے امام ابو حنیفہ اور امام محمد

فی الصاع فقال الطرفان ثمانیة ارطال بالعراقی وقال الثانی خمسة ارطال وثلث وقیل لا خلاف (الی قوله) وهذا الاشبه لان محمدا لم یذکر خلاف ابی یوسف ولو کان لذکره لانه اعرف بمذهبه (شامی ص ۹، ج ۲)

فرماتے ہیں کہ آٹھ رطل عراقی اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ پانچ رطل اور تہائی رطل کا ایک صاع ہوتا ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ائمہ حنفیہ کا، صاع کے متعلق کوئی اختلاف نہیں بلکہ بالاتفاق آٹھ رطل کا صاع ہوتا ہے اور یہی بات (یعنی اختلاف نہ ہونا ہی)، زیادہ قریب ہے کیونکہ امام محمدؒ نے اس میں ابو یوسفؒ کا کوئی خلاف نقل نہیں فرمایا اور اگر اختلاف ہوتا تو وہ ضرور ذکر کرتے کیونکہ وہ ان کے مذہب سے زیادہ واقف ہیں۔

❖ ❖ ❖

(۴) وفی شرح الوقایه ونصف صاع من العراقی فهو منوان علی ان المن اربعون استارا والاستار اربعة مثاقیل ونصف مثقال فالمن مائة وثمانون مثقالا اھ

۴۔ اور شرح وقایہ میں ہے کہ نصف صاع عراقی دو من کا ہے۔ اس طرح پر کہ ایک من ۴۰ استار کا اور استار ساڑھے چار مثقال پس ایک من ایک سو اسی مثقال کا ہو گیا۔

❖ ❖ ❖

(۵) قال العلامة محمد بن صالح المعروف بقاضی زاده ساکن المدینة فی نتائج النظر حاشیة الدرر الشعیرة ثلاث حبات من الارز فی المتانة وستة خرادل (مصباح)

۵۔ علامہ محمد بن صالح ساکن مدینہ نے نتائج النظر حاشیہ درر میں فرمایا ہے کہ ایک جو تین چاول کے برابر ہوتا ہے، اور چھ رائی کے دانوں کے برابر

❖ ❖ ❖

اور غایت البیان میں ہے:۔

(۶) الدینار عشرون قیراطا کل قیراط اثنا عشر ارزة والارزة خردلتان حبتان من الخردل البری (مصباح)

۶۔ دینار بیس قیراط کا اور قیراط بارہ چاول کا اور چاول دو رائی کے دانوں کی برابر ہوتا ہے رائی بھی جنگلی ہونی چاہیے۔

❖ ❖ ❖

اور اس تمام تحقیق و تفتیش اور بار بار کے وزن میں ستّر جَو (یعنی درہم) کا وزن چھبیس رتی ہے اور ستّو جَو (یعنی مثقال) کا وزن چھتیس رتی سے کم کسی طرح نہیں نکلتا۔

اب اس پر حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالحیؒ صاحب جیسے محقق اور ماہر علم کے حساب میں اتنا عظیم الشان فرق کیسے آیا۔ سو غور کرنے سے خیال آیا کہ شاید موصوف نے صرف چار جَو اور ایک رتی کا باہم وزن ہی فرمایا ہے اُس میں تفاوت نا معلوم ہونے کی بنا پر محسوس نہ ہوا پھر اُسی پر ستّر اور ستّو جَو کا حساب لگا کر درہم و مثقال کے وزن تو قلم فرما دیئے ستّر جَو اور ستّو جَو مجموعی طور پر وزن نہیں فرمایا ورنہ یہ مغالطہ ہرگز نہ رہتا۔ چنانچہ اس خیال کے امتحان کے لئے چار جَو اور ایک رتی کا وزن کیا تو اس خیال کی پوری تصدیق ہوگئی۔ کہ ظاہر نظر میں بالکل مساوی معلوم ہوئے۔ پھر اس کی مزید تقویت کے لئے صرف تین جَو اور ایک رتی کا وزن کیا تو وہ بھی اسی طرح ظاہر نظر میں برابر محسوس ہوئے۔ دونوں وزن میں فرق اس قدر خفی تھا کہ محسوس کرنا دشوار تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ دراصل ایک رتی کا وزن نہ پورے چار جَو ہیں نہ پورے تین جَو۔ بلکہ تین سے کسی قدر کم ہے اور یہ کمی صرف ایک رتی کے تولنے میں ظاہر نہیں ہوتی۔ جن حضرات نے ایک رتی کی مقدار چار جَو یا بعض[ه] نے تین جَو لکھی ہے وہ یا تو تقریبی ہے اور یا اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے صرف ایک رتی کا وزن دیکھا ہے اور قلیل وزن میں قلیل فرق محسوس نہیں ہوتا۔

الحاصل اس تدقیق و کاوش کے بعد یہ تو یقین ہوگیا کہ درہم کا وزن دو ماشہ ڈیڑھ رتی اور مثقال کا تین ماشہ ایک رتی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اب صرف اتنی بات باقی رہ گئی کہ احقر نے جو مختلف قسم کی گنگچیوں سے یا بذریعہ رتی ماشہ سے وزن کیا اور ہر قسم میں کچھ نہ کچھ فرق نکلا۔ ان میں سے کس وزن کو ترجیح دی جائے سو اوّل تو احقر کی اپنی تفتیش کے اعتبار سے بھی وہی وزن راجح اور صحیح ہے جو جمہور علماء ہندوستان کی تحقیق کے بالکل مطابق ہے یعنی ستّر جَو = چھبیس رتی اور ستّو جو = چھتیس رتی کے برابر ہیں۔ کیونکہ یہ وزن متوسط جَو اور متوسط گنگچیوں سے کیا گیا ہے۔ دوسرے

ه تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہی رحمہ سے بھی نقل کیا گیا ہے ۱۲ منہ

جمہور علماء کی تحقیق کے مطابق ہو جانا خود اس وزن کی ترجیح کے لئے کافی ہے کیونکہ ان اکابر علماء نے ساتویں صدی ہجری سے بارھویں تیرھویں صدی ہجری تک مختلف زمانوں مختلف بلاد میں اپنی اپنی تحقیق ضبط فرمائی ہے۔ جیسے کہ عنقریب اس کی تفصیل آتی ہے۔ اور سب کی تحقیقات مطابق ہیں۔ عادۃً یہ بات ناممکن ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی غلطی پر مجتمع ہو جاویں۔

قدیم علماء ہندوستان کی تحقیقات

مولانا ابو الفتح رکن دین بن حسام مفتی ناگوری جو قاضی القضاۃ شیخ حماد بن احمدؒ کی طرف سے بلاد نہر والہ (صوبہ گجرات) میں منجانب حکومت اسلامیہ مفتی مقرر تھے اور اسی زمانہ میں بڑی تفتیش سے فتاویٰ حمادیہ تصنیف فرمایا تھا۔ اس میں اکابر علمائے ہندوستان کی تحقیقات اوزان شرعیہ کے بارہ میں نقل فرمائی ہیں۔ اس میں بحوالہ حاشیہ مولانا معین الدین از شرح کنز نقل کیا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ شرح کنز کونسی اور کس زمانہ کی تصنیف ہے مگر اتنا ظاہر ہے کہ یہ بزرگ قدیم علمائے ہندوستان میں سے ہیں اور بوزن بلدنا جو ان کی عبارت مندرجہ ذیل میں آتا ہے اس سے مراد دہلی اور اس کے مضافات ہیں جیسا کہ اس عبارت سے پہلے اسی کتاب میں درہم بلدنا اعنی حضرۃ دہلی مذکور ہے۔

والقیراط حبۃ واربعۃ اخماس	اور قیراط ایک حبہ (رتی) اور ایک حبہ (رتی)
حبۃ فیکون وزن الدرھم خمسۃ	کے پانچ حصوں میں سے چار حصے ہیں اس لئے
وعشرین حبۃ	وزن درہم کا پچیس رتی اور پانچواں حصہ رتی
وخمس حبۃ وکل تولجۃ	کا ہو گیا اور ہر تولہ تین درہم اور بیس رتی اور
ثلثۃ دراھم وعشرین حبۃ وخمس	دو خمس رتی کا ہو گیا
حبۃ لان تولجۃ ستۃ وتسعون	کیونکہ تولہ آج کل چھیانوے رتی کا ہے
حبۃ لان کل تولجۃ فی اصطلاحنا	اس لئے کہ تولہ ہماری اصطلاح میں بارہ ماشہ

اثنا عشر ماھجۃ و کل ماھجۃ ثمانیۃ حبۃ فعلی ھذا یکون نصاب الفضۃ بوزن بلادنا اثنین وخمسین تولجۃ ونصف تولجۃ فالواجب تولجۃ و ربع تولجۃ وست حبات ونصاب الذھب بوزن بلادنا سبع تولجات ونصف تولجۃ والواجب ثمن تولجۃ ونصف ثمن تولجۃ وذلک بالماھجۃ ماھجتان وربع ماھجۃ وھذا ھو التحقیق فی ھذا الباب

(فتاوی حمادیہ ص ۳۴۳ ج ۱)

کا ہے ـــــــ اور ہر ماشہ آٹھ رتی کا۔ پس اس بناء پر چاندی کا نصاب ہمارے بلاد کے وزن کے اعتبار سے ساڑھے باون تولہ ہوا اور مقدار زکوٰۃ واجبہ کی اس میں سے ایک تولہ تین ماشہ چھ رتی ہوئی۔ اور نصاب سونے کا ہمارے بلاد کے وزن سے ساڑھے سات تولہ ہو گیا اور مقدار واجب اُس میں سے سوا دو ماشہ ہوگی اس بارہ میں یہی تحقیق ہے۔

(فتاوی حمادیہ)

✤ ✤ ✤ ✤

مولانا معین الدین کی مذکورہ بالا تحقیق بعینہ وہ ہے جو حضرات دہلی نے اور جمہور علمائے ہندوستان نے بیان کی ہے۔ نیز اسی فتوی حمادیہ میں ایک واقعہ ۷۹۴ھ کا شیخ بہاؤ الدین ابراہیم بن عبد اللہ تاجر ملتانی کا نقل کیا ہے جنھوں نے ہندوستانی اوزان میں درہم و دینار اور صاع و مُد کی مکمل تحقیق فرمائی ہے اور مکہ معظمہ سے درہم شرعی اور دینار اور مُد اور صاع کے معتبر و مستند پیمانے ہندوستان لا کر دہلی کے دارالضرب (ٹکسال) میں اُن کو وزن کرایا اور محضر (کرادیا۔ ان کی بعینہٖ عبارت یہ ہے۔

من شرح الھدایۃ وحکی ان ابراھیم بن عبد اللہ التاجر الملتانی لما دخل مکۃ سنۃ اربع وتسعین وست مائۃ بالغ فی تحقیق الدرھم بوزن سبعۃ والمثقال

شرح ہدایہ میں ہے کہ ابراہیم بن عبد اللہ تاجر ملتانی جب سن چھ سو چورانوے ہجری میں مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو درہم بوزن سبعہ (جو احکام شرعیہ میں معتبر ہے) اور مثقال اور صاع اور مُد کی تحقیق میں بڑی کوشش کی اور مکہ معظمہ سے ایک

سے یہ واقعہ مصباح المنیر میں شیخ محمد قایم سندھی نے بھی نقل کیا ہے ۱۲ منہ

والصاع والمد وأتى
ببدرهم مكة
ومثقالهما وصاعها ومدها و
وزنها وحرزها بدار الضرب
في حضرة دهلي اجلتها الله تعالى
فصار الدرهم الشرعي ثلث
ماشجة واربع شعيرات وربع
شعير والمثقال الشرعي درهما
من دراهم بلدنا وخمس درهم
ونصف شعير وعشرها والمد
ثلثة أساتير وثلث استار باستار
بلدنا والصاع ثلثة عشر استاراً
وثلث استار باستار بلدنا وهذا
ليس بلازم للاعتماد والتعويل عليه
وان اعتمد بعض علماء عصرنا لانه
اشتبه صاع عمر رض في زمن
الحجاج وقد قرب ذلك الزمان
من عهد النبي صلى الله عليه وسلم
فكيف يعتمد على صاع اتى به في هذا
العصر وقد تطاول الزمان
وتغير المكائيل والصيعان

ایک درہم اور مثقال اور صاع اور مُد لے
کر آئے پھر ان کا وزن کیا اور دہلی کی ٹکسال
میں اُن کو محفوظ کرا دیا۔
چنانچہ درہم شرعی تین ماشہ اور سوا چار
جَو کی برابر اور مثقال شرعی دہلی کے مروجہ
درہم سے ایک درہم اور پانچواں حصّہ درہم
اور نصف جَو اور دسواں حصّہ جَو کا ہوا اور
مُد تین استار اور ایک تہائی استار ہمارے
بلدہ (دہلی) کے استار کے حساب سے
مگر یہ (صاع مد کا وزن) قابل اعتماد نہیں اگرچہ
بعض علماء نے اس پر بھی اعتماد کیا ہے
وجہ بے اعتمادی کی یہ ہے کہ حجاج کے زمانہ
میں حضرت عمر رض کا صاع مشتبہ ہو گیا تھا حالانکہ
یہ زمانہ عہدِ نبوت سے بالکل قریب تھا تو
آج اُس صاع پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے جو
اس قدر زمانہ طویل کے بعد وہاں سے لایا
گیا۔ اس مدت میں معلوم نہیں وہاں کے
کیل اور صاع میں کیا کیا تغیرات ہوئے
ہوں گے۔

(فتاوی حمادیہ ص ۴۲ ج ۱)

اس میں حمادیہ کا یہ کہنا تو صحیح ہے کہ ان اوزان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عہد نبوی
سے بُعد کی وجہ سے تغیر و تبدل کے امکانات بہت ہیں لیکن یہاں صرف یہی بنیاد نہیں

بلکہ فقہاء سابقین کی شہادات موجود ہیں۔ اس لئے تائید کے درجہ میں اس کو بھی پیش کرنے میں تو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

شیخ ابراہیم تاجر ملتانی کی تحقیق جو ساتویں ہجری میں بڑے اہتمام سے کی گئی ہے یہ بھی درہم و مثقال کے وزن میں بعینہٖ وہ ہے جو حضرات دہلی اور جمہور علماء ہند کی تحقیق ہے کیونکہ اس میں درہم کا وزن تین ماشہ اور سوا چار جو بیان کیا ہے اور جمہور نے تین ماشہ ایک رتی اور خمس رتی لکھا ہے سو ۴ ۱/۴ جو کی ایک رتی اور خمس رتی ہونا ظاہر ہے۔ اسی طرح مثقال کا وزن دہلی کا ایک درہم پورا اور پانچواں حصہ درہم اور ایک نصف اور ایک عشر جو لکھا ہے اور دہلی کا درہم اس وقت چار ماشہ کا تھا جیسا کہ فتوٰی حمادیہ میں عبارت مذکورہ سے پہلے اس کی تصریح بالفاظ ذیل موجود ہے:

و درهم بلدنا اعني حضرة دهلي اربعة وستون شعيرا لانه اربعة ماشج وكل ماشجة ستة عشر شعيرا (ص ۴۲)

اور درہم ہمارے شہر یعنی دہلی کا چونسٹھ جو کا ہے کیونکہ درہم چار ماشہ کا ہے اور ہر ماشہ سولہ جو کا (حمادیہ)

اس سے معلوم ہوا کہ مثقال کا وزن ماشہ رتی کے حساب سے چار ماشہ اور چھ رتی تقریباً ہوتا ہے اس میں متاخرین دہلی کی تحقیق سے صرف دو رتی زائد ہیں وہ علماء لکھنؤ کی تحقیق سے یہ اور بھی زیادہ ابعد ہے اور بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی قدس سرہ جن کی وفات ۱۲۲۵ھ ہجری کی ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور حضرت شاہ صاحب نے ہی ان کو بیہقی وقت کا خطاب دیا ہے۔ اپنے زمانہ میں حکومت کی طرف سے قاضی بھی رہے ہیں ان کی کتاب مالا بد منہ میں ہے۔

"نصاب زر بیست مثقال است کہ ہفت و نیم تولہ باشد و نصاب نقرہ دو صد درہم است کہ پنجاہ و شش سکہ دہلی وزن آں می شود"

(مالا بد منہ ص ۹۱)

اور حضرت نواب قطب الدین صاحب دہلوی شارح مشکوٰۃ ۱۲۵۴ھ میں اپنی کتاب مظاہر حق میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"درہم تین ماشہ ایک رتی اور پانچواں حصہ رتی کا ہوتا ہے پس دو سو درہم میں چاندی چھ سو تیس ماشہ ہوتی ہے اور ان پر زکوٰۃ کے پانچ درہم ہیں، اور پانچ درہم میں چاندی ہے پندرہ ماشہ چھ رتی پس اگر روپیہ میں بارہ بارہ ماشہ کے جیسے کلدار سکے کل کے اور ڈبل اور پنکی دار تو چھ سو تین ماشہ کے ساڑھے باون روپیہ ہوئے اس پر زکوٰۃ کا ہوا ایک روپیہ بارہ ماشہ کا۔ اور پانچ آنہ اور اگر روپیہ ہیں ساڑھے گیارہ ماشہ کے مثلاً لکھنؤ وغیرہ کے تو چون روپیہ بارہ آنہ چھ پائی اور چھ جزو تیئیس پائی کے ہیں سے ہوئے ان پر ایک روپیہ ساڑھے گیارہ ماشہ کا اور پانچ آنہ دس پائی اور بائیس جزو تیئیس جزو پائی کے ہیں سے زکوٰۃ ہوئی حسب ذیل تفصیل

شمار درہم	تعیین زکوٰۃ	وزن چاندی	تعیین زکوٰۃ	سکہ بارہ ماشہ کا	زکوٰۃ سکہ
۲۰۰ درہم	۵ درہم	۶۳۰ ماشہ	۱۵ ماشہ ۶ رتی	[illegible]	[illegible]

۱ روپیہ کا زکوٰۃ [illegible] روپیہ اور [illegible] کی یعنی سونے کی

[illegible] پائی بیس مثقال یہاں کے حساب سے ساڑھے سات

تولہ کے ہوتے ہیں (مظاہر حق ص ۱۰۸ ج ۲)

اور شیخ محمد ہاشم سندھی نے رسالہ مصباح منیر میں شیخ عیسیٰ سندھی برہان پوری شطاری کے رسالہ مفتاح الصلوٰۃ سے نقل کیا ہے:

"مقدار صدقہ فطر نصف صاع است کہ عبارت از چہار رطل باشد داں دو سیر شاہجہانی شود چوں از گندم یا آرد یا ستو باشد و یک صاع بدہد اگر از خرما یا جو باشد و وجوب آں بر صاحب نصاب است یعنی ہر کہ پنجاہ و دو درہم تو در نقرہ یا بہائے آں سوائے مسکن بودن و پارچہ پوشیدن داشتہ

باشد انتہیٰ"

نیز علامہ ہداد نے حاشیہ ہدایہ میں شرح کنز کے حوالہ سے نقل کیا ہے:۔

لان التولجة فی اصطلاحنا اثنا عشر ماشجة وکل ماشجة ثمان حبات فعلیٰ هذا یکون نصاب الفضة بوزن بلادنا اثنین وخمسین تولجة وربع تولجة وست حبات ونصاب الذهب یوزن بلادنا سبع تولجات ونصف تولجة هذا هو التحقیق فی هذا الباب

اس لئے کہ تولہ ہماری اصطلاح میں بارہ ماشہ کا اور ماشہ آٹھ رتی کا ہے۔ اس بناء پر چاندی کا نصاب ہمارے بلاد ہندوستان وغیرہ میں سوا باون تولہ چھ رتی ہے اور سونے کا نصاب ہمارے بلاد کے وزن میں ساڑھے سات تولہ ہے۔ اس معاملہ میں تحقیق سے یہی ثابت ہوتا ہے

اور مصباح منیر میں یہی تحقیق مولانا معین الدین عمرانی کی حاشیہ کنز سے نقل کی ہے نیز شرح صراط مستقیم فصل زکوٰۃ سے نقل کیا ہے:۔

"درہم مبلغ آں بحساب تولہ۔ پنجاہ ودو تولہ باشد۔ وبست مثقال زر بوزن ایں دیار ہفت ونیم تولجہ بود انتہیٰ۔ اقول الصواب ان یقول فی نصاب الفضة پنجاہ ودو ونیم تولجہ باشد آہ"

نیز مصباح منیر فصل سادس میں ہے کہ ہمارے ملک میں غیر مسلموں سے جو درہم بطور بطور جزیہ لئے جاتے تھے اور اُن پر درہم شرعی لکھا ہوا تھا۔ ہم نے ان کا وزن کیا تو تین ماشہ اور آٹھواں حصہ ماشہ کا اور پانچواں حصہ رتی کا پایا جس سے اس قول کی تائید ہوئی کہ مثقال ۴ ۱/۲ ماشہ کا ہوتا ہے۔

اطبّاء ہندوستان کی تحقیق

اشرف الحکماء جناب حکیم محمد شریف خاں دہلوی جو تیرھویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے نامور امام طب مانے گئے ہیں۔ اُن کی کتاب علاج الامراض فارسی کے آخر میں اوزان کی بحث پر ایک مستقل فصل ہے جس کے آخر میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اوزانے کہ دریں بلاد متعارف است بدیں طریق ست کہ از چہار خردلہ یک برنج اعتبار می کنند و از چہار برنج یک جو و از دو جو یک رتی و از ہشت رتی یک ماشہ و از سہ و نیم ماشہ یک درہم و از چہار و نیم ماشہ یک مثقال و از دوازدہ ماشہ یک تولہ و از چہار دہ ماشہ یک دام عالمگیری و از بست و یک ماشہ یک دام پختہ و از سی دام پختہ یک سیر اکبری و از چہل دام پختہ یک سیر شاہجہانی و از چہل و چہار دام پختہ یک سیر عالمگیری و از چہل و ہشت دام پختہ یک سیر فرخ شاہی مروج است۔ واللہ اعلم بالصواب (علاج الامراض فارسی ص ۳۰۲)

اس تحقیق میں بھی درہم و مثقال تقریباً وہی اوزان ہیں جو قدیم علماء ہندوستان کی تحقیق ہے۔ اگرچہ رتی کا وزن دو جو تبلایا گیا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ اس وقت جو بڑے ہوں یا تحقیق کرنے والوں کے سامنے بڑے آئے ہوں۔ علاوہ ازیں اس سے اتنا تو بدرجہ اولیٰ معلوم ہوا کہ ایک رتی چار جو کی نہیں ہے۔

(ف) اس تحقیق میں ہندوستانی سیر کے اوزان مختلفہ بھی ضبط میں آگئے جو بحساب تولہ حسبِ ذیل نکلتے ہیں اس کے ساتھ موجودہ وقت کے سیر بھی کچھ لکھ دیئے گئے:۔

سیر اکبری	سیر شاہجہانی	سیر عالمگیری	سیر فرخ شاہی	سیر انگریزی
۵۲½ تولہ	۷۰ تولہ	۷۷ تولہ	۸۴ تولہ	۸۰ تولہ

مخزن میں درہم و مثقال کا وزن اس سے متفاوت لکھا ہے لیکن وہ تفاوت غالباً اس پر مبنی ہے کہ تولہ دہلی اور بنگال کا متفاوت ہے دہلی کے بارہ ماشہ اور بنگال کے دس برابر ہیں جیسا کہ خود مخزن میں اس کی تصریح موجود ہے۔ تولہ کا وزن متفاوت ہونے سے ماشہ میں اُس کے تفاوت سے درہم و مثقال میں فرق ہوجاتا ہے۔

اہلِ لُغت کی تحقیق

ہفت قلزم۔ جس کے مصنف ہندوستان کے مشہور علماء لغت میں سے ہیں انہوں نے بھی درہم کا وزن سہ ماشہ و چہار جو لکھا ہے۔

مکاکیک۔

وکل مکوک خمسۃ عشر رطلا وکل رطل مائۃ وثمانیۃ وعشرون درھما۔ انتہیٰ

اس تمام بحث و تفتیش کا حاصل یہ تھا کہ درہم اور مثقال کا صحیح وزن تولہ اور ماشہ سے کیا ہے۔ اس کے بعد اصل مقصود کو دیکھنا چاہئے کہ چاندی سونے کا نصاب کیا ہوا۔ اور صدقۃ الفطر کی مقدار کیا ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے۔

چاندی سونے کا صحیح نصاب

جب کہ یہ متفق علیہ ہے کہ چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے اور تحقیق مذکور سے ثابت ہو گیا کہ ایک درہم کا وزن تین ماشہ ایک رتی اور ایک پانچواں حصہ رتی ہے تو حساب لگانے سے نتیجہ نکل آیا کہ چاندی کا نصاب باون تولہ ۶ ماشہ ہے اور چونکہ فی الوقت روپیہ ہمارے زمانہ میں ساڑھے گیارہ ماشہ کا ہے تو روپیہ سے چون روپیہ بارہ آنے چھ پائی صحیح تیئیس پائی (۶ ۲۳/۲ پائی) نصاب زکوٰۃ ہوا۔

اسی طرح یہ بھی مسلّم ہے کہ سونے کا نصاب شرعی بیس مثقال ہیں اور تحقیق مذکورہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشہ ہے تو نصاب سونے کا تولہ کے حساب سے ساڑھے سات تولہ ہو گیا جیسا کہ تیرھویں صدی کے بزرگان دین نے تحریر فرمایا ہے اور شیخ بہاء الدین تاج طائی کی تحقیق کے موافق تقریباً چالیس رتی یعنی پانچ ماشہ وزن زائد ہو جاتی ہے یعنی سات تولہ گیارہ ماشہ سونا نصاب زکوٰۃ ہوا سو احتیاط اسی میں ہے کہ ساڑھے سات تولہ کو نصاب سمجھ کر اس پر زکوٰۃ دیدے اور جو شخص ساڑھے سات تولہ سونے کا مالک ہو اس کو مصرف زکوٰۃ نہ بنایا جاوے۔

فائدہ: درہم شرعی کا جو وزن اوپر بیان کیا گیا ہے تمام احکام شرعیہ میں جہاں کہیں درہم بولا گیا ہے یہی درہم شرعی مراد ہوگا۔ اسی لئے عورت کے مہر کی کم سے کم مقدار جو حنفیہ کے نزدیک دس درہم ہے دو تولہ ساڑھے سات ماشہ

چاندی ہوئی اور مہر فاطمی جس کی مقدار منقول پانچ سو درہم ہے کما فی عامۃ روایات الحدیث۔
اس کی مقدار موجودہ روپے سے ایک سو اکتیس تولہ تین ماشہ ہوئی۔

صاع کا وزن اور صدقۃ الفطر کی مقدار صحیح

یہ تو مسلم اور متفق علیہ ہے کہ صدقۃ الفطر کی مقدار گندم سے نصف صاع اور جو سے ایک صاع ہے اور یہ بھی حنفیہ کے نزدیک طے شدہ ہے کہ صاع سے صاع عراقی مراد ہے اور ایک صاع عراقی آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ پھر صاع اور رطل کا وزن تولہ وغیرہ کے حساب سے معلوم کرنے کے لئے چند طریق ہیں۔

اوّل بذریعہ مثقال تو حسب تصریح فقہاء جس کا حوالہ ابتداء میں گزر چکا ہے ایک رطل نوے مثقال کا اور نوے کو آٹھ میں ضرب دی گئی تو سات سو بیس (۷۲۰) مثقال صاع کا وزن ہو گیا اور تحقیق مذکور سے ثابت ہو گیا کہ ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے تو پورا صاع (۳۲۴۰) ماشہ یعنی دو سو ستر تولہ کا اور نصف صاع (۱۳۵) ایک سو پینتیس تولہ کا ہو گیا۔ جو اسّی تولہ کے انگریزی سیر کے حساب سے تین سیر چھ چھٹانک کا پورا صاع اور ڈیڑھ سیر تین چھٹانک کا نصف صاع ہوا۔

دوسرا طریقہ بذریعہ درہم حسب تصریح در مختار وغیرہ کامل صاع ایک ہزار چالیس درہم کا ہے اور درہم حسب تحقیق مذکور تین ماشہ ایک رتی اور ۱/۵ رتی کا ہے تو پورا صاع دو سو تہتر تولہ ہو گیا اور نصف صاع ۱۳۶ تولہ ۶ ماشہ کا ہوا یعنی اسّی تولہ کے انگریزی سیر سے پورا صاع تین سیر چھ چھٹانک تین تولہ ہو گیا اور نصف صاع ڈیڑھ سیر تین چھٹانک ڈیڑھ تولہ ہوا۔ ان دونوں حسابوں میں پورے صاع پر تین تولہ کا اور نصف صاع پر ڈیڑھ تولہ کا فرق آتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس نے صاحب در مختار کے موافق درہم سے حساب کیا تو دو سو تہتر تولہ کا صاع نکلا اور جس نے شارح وقایہ صدر الشریعۃ کے موافق مثقال سے حساب

لگایا تو دو سو ستر تولہ نکلا۔

تیسرا طریقہ بذریعہ مُد مُد بضم المیم بھی ایک پیمانہ کا نام ہے اور حسب تصریح شامی وغیرہ ایک صاع چار مُد کا ہوتا ہے۔ پھر مُد کا وزن ہندوستانی اوزان کے حساب سے معلوم کرنے کے لئے چند صورتیں ہیں۔ اوّل اُن علماء کے اقوال جنھوں نے مُد کو گندم وغیرہ سے بھر کر پھر وزن کیا اور اپنی تحقیق لکھی۔ اس میں ایک تو وہی قول ہے جو شیخ بہاؤ الدین تاجر ملتانی کے واقعہ میں بحوالہ حمادیہ گزر چکا ہے اس میں ایک مُد تین اِستار اور ایک تہائی اِستار کا اور صاع کو تیرہ اِستار اور ایک تہائی استار کا بوزن دہلی قرار دیا ہے۔ لیکن چوں کہ دہلی کے استار کا وزن معلوم نہیں اس لئے یہ صورت کافی نہیں ہوتی۔

دوسرے سیّدی وسندی حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے رسالہ الطرائف والظرائف حصہ دوم ص ۱۲ میں ہے۔

"ایک مُد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب (نانوتوی، اول صدر مدرس دار العلوم دیوبند) کے پاس تھا جس کی مسلسل سند حضرت زید بن ثابت رضؓ کے مُد تک (جو انھوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُد سے ناپ کر بنایا تھا) پہنچتی ہے اُس کو حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے دو مرتبہ بھر کر وزن کیا (کیونکہ نصف صاع دو مُد کا ہوتا ہے) تو ۸۰ تولہ کے سیر سے ۱½ سیر ۱½ چھٹانک ہوا تھا۔ (الطرائف ص ۱۲)

اس حساب سے پورے صاع کا وزن دو سو اسّی تولہ چھ ماشہ اور نصف صاع کا ایک سو چالیس تولہ تین ماشہ ہوتا ہے ——— اور علامہ شامی نے بیان کیا ہے کہ ایک مُد دو سو ساٹھ درہم کی برابر ہوتا ہے اور دو سو ساٹھ درہم کا وزن تحقیق مذکورہ کے موافق آٹھ سو اُنیس ماشہ یعنی اڑسٹھ تولہ تین ماشہ ہوتا ہے اور چونکہ پورا صاع چار مُد کا ہے تو اُس کو چار میں ضرب دینے سے پورے دو سو تہتّر تولہ وزن صاع کا نکل آیا اور نصف صاع ایک سو چھتیس تولہ چھ ماشہ کا ہوا۔ اور یہ بعینہٖ وہ حساب ہے جو اوپر بذریعہ درہم بیان کیا

گیا ہے۔

چوتھا طریق بذریعہ اِستار

اس کے متعلق بحث سابق گزر چکی ہے کہ ایک مُد یا ایک من یا دو رطل، کیونکہ یہ تینوں چیزیں ہم وزن ہیں چالیس اِستار کے برابر ہیں اور ایک استار ساڑھے چھ درہم یا ساڑھے چار مثقال کے برابر ہے اب اگر درہم سے حساب استار کا لگایا جائے اور پھر اُس سے مُد وغیرہ کا تو چالیس استار کے دو سو ساٹھ درہم ہوتے ہیں اور دو سو ساٹھ درہم کے اڑسٹھ تولہ تین ماشہ ہوتے ہیں جو ایک مُد یا دو رطل کا وزن ہے اور جب پورا صاع معلوم کرنے کے لئے اُس کو چار میں ضرب دی گئی تو وہی دو سو تہتر تولہ کا حساب آگیا اور اگر استار کا حساب مثقال سے کیا جاوے تو چالیس استار کے ایک سو اسی مثقال ہوئے جس کے آٹھ سو دس ماشہ یعنی ساڑھے سڑسٹھ تولہ ہو گئے اس کو پورا صاع بنانے کے لئے چار میں ضرب دی تو دو سو ستر تولہ ہو گئے یہ بعینہ وہی حساب ہے جو سب سے پہلے بذریعہ مثقال بیان کیا گیا ہے۔

الغرض صاع کو اوزان ہندیہ تولہ ماشہ کی طرف منتقل کرنے کے چار طریقے جو اُوپر مذکور ہوئے اُن سب کا نتیجہ یہ ہے کہ جس حساب میں کسی جگہ مثقال سے حساب لگایا گیا تو دو سو ستر تولہ کا صاع آتا ہے اور جس جگہ درہم سے حساب کیا تو دو سو تہتر تولہ، فقہ کی تصریحات مذکورہ میں اُلٹ پلٹ کر یہی دو صورتیں برآمد نکلتی ہیں جن میں پورے صاع پر صرف تین تولہ کا اور نصف صاع پر ڈیڑھ تولہ کا فرق آتا ہے۔ صرف وہ حساب جو بحوالہ الطرائف دو مُد کے وزن کا لکھا گیا ہے اُس سے دو سو اسی تولہ چھ ماشہ کا صاع معلوم ہوتا ہے جس میں ساڑھے دس تولہ کا پورے صاع پر اور سوا پانچ تولہ کا نصف صاع پر فرق آتا ہے۔ اس طرح پر تین حساب تھوڑے تھوڑے فرق سے حاصل ہو گئے

اوّل۔ بذریعہ مثقال پورا صاع دو سو ستر تولہ نصف صاع ایک سو پینتیس تولہ۔

دوم۔ بذریعہ دراہم۔ پورا صاع دو سو تہتر تولہ نصف صاع ایک سو چھتیس تولہ چھ ماشہ

سوم۔ بذریعہ مد۔ حضرت مولانا محمد یعقوب پورا صاع دو سو اسی تولہ چھ ماشہ نصف صاع ایک سو چالیس تولہ تین ماشہ۔

ان میں سے جس حساب کو بھی اختیار کر لیا جاوے صدقہ فطر ادا ہو جاوے گا۔ لیکن آخری حساب میں چونکہ زیادتی ہے اس لئے اُس کے موافق ادا کرنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ اور جب تولہ ماشہ کے حساب سے صاع اور نصف صاع کا وزن معلوم ہو گیا تو اپنے اپنے شہروں کے سیر اور چھٹانک کا حساب لگا لینا سہل ہے۔ لیکن چونکہ عام طور پر انگریزی سیر اسّی تولہ کا رائج ہو گیا ہے اور ہمارے بلاد میں عموماً صدقۃ الفطر گیہوں سے دیا جاتا ہے اس لئے اُس کا حساب بالتصریح لکھ دینا مناسب ہوا۔

گندم سے صدقۃ الفطر کی مقدار واجب نصف صاع ہے اور نصف صاع پہلے حساب سے اسّی تولہ کے سیر سے ڈیڑھ سیر تین چھٹانک کا ہوا۔ اور دوسرے حساب سے ڈیڑھ سیر تین چھٹانک ڈیڑھ تولہ اور تیسرے حساب سے پونے دو سیر تین ماشہ ہوا جن میں زائد سے زائد سوا پانچ تولہ کی زیادتی ہے۔ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ اسّی تولہ کے سیر سے پونے دو سیر گندم ایک صدقۃ الفطر میں نکالے جاویں۔

تنبیہ: مولانا لکھنوی نے جو وزن صاع کا ایک سیر پندرہ تولہ قرار دیا ہے عہ جہاں تک احقر نے تفتیش کی وہ کسی حساب سے درست نہیں نکلا دروجہ اس مغالطہ کی وہی معلوم ہوتی ہے جو وزن درہم کی تحقیق میں عرض کی گئی ہے کہ صرف ایک رتی کو جَو کے ساتھ تولا گیا اس میں خفیف سا فرق محسوس نہ ہوا۔

پھر جَو جَو کی رتی قرار دے کر محض حساب کے ذریعہ اُس کو صاع تک پہنچا دیا گیا ستر جَو کو ایک مرتبہ وزن کر لیا جاتا تو یہ مغالطہ باقی نہ رہتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اصل مقصود اس تحریر کا اتنا ہی تھا کہ سونے چاندی کے نصاب زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی مقدار کی تحقیق ہو جاوے لیکن جب کہ درہم دمشقی کے وزن کی تحقیق ہو گئی اور عام طور سے جو وزن کتب فقہ میں ذکر کئے جاتے ہیں وہ درہم دمشقی ہی کی طرف لوٹتے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ جس قدر الفاظ کتب فقہ میں

عہ یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا نے دوسرے ائمہ کے موافق صاع عراقی کے بجائے صاع حجازی اختیار فرمایا ہو جو آدھے سیر سے پانچ تولہ سے کچھ زائد کا ہوتا ہے مگر جمہور حنفیہ نے چونکہ صاع عراقی کو ہی ان معاملات میں اختیار کیا ہے اس لئے ہم نے حساب اُسی کا لگایا ہے۔ واللہ اعلم محمد شفیع۔

دربارۂ اوزان مستعمل ہیں ان سب کے وزن تولہ، ماشہ کے حساب سے لکھ دیے جاویں تاکہ فقہاء کی مراد کو رائج الوقت وزن کے مطابق سمجھنے میں دشواری پیش نہ آوے اس لیے ان سب کو ایک جدول کی صورت میں لکھ دیا گیا ہے۔ واللہ الموفق والمعین۔

نقشہ رائج الوقت اوزان کے مطابق

اوزان فقہیہ	اوزان ہندیہ	کیفیت
طسوج	تقریباً پون رتی	اصل یہ ہے کہ طسوج دو جو کا ہے اور ایک رتی ۲ جو سے کچھ کم ہے بجز جو [illegible]
قیراط	۱ ۱/۴ رتی یعنی تقریباً پونے دو رتی	حسب تصریح فقہاء ایک قیراط ۵ جو، درہم ۱۴ قیراط کا ایک درہم ہے درہم ۷۰ رتی کا ہے اس حساب سے قیراط ۱ ۱/۴ رتی کا ہوا۔
دانق یا دانگ	تقریباً ۷ رتی	اصل یہ ہے کہ دانق ۴ قیراط ہے کہ فی قیراط ۵ جو برابر اور ایک قیراط پونے ۲ رتی ہے تو ۴ قیراط ۷ رتی کے ہوئے۔
درہم	۳ ماشہ ایک رتی و ۱/۵ رتی کا	۷۰ جو درہم کا وزن حسب تصریح فقہاء ہے، ماشہ سے وزن کیا گیا تو یہی وزن ہے۔
مثقال	۴ ماشہ ۴ رتی	مثقال کا وزن حسب تصریح فقہاء ۱۰۰ جو ہے ہمارے اوزان سے بھی یہی آتا ہے۔
رطل	۳۴ تولہ ڈیڑھ ماشہ	حسب تصریح شامی وغیرہ رطل کا وزن ۱۳۰ درہم ہے جس کا وزن بحساب تولہ یہی نکلتا ہے
مُد	۶۸ تولہ ۳ ماشہ	" " مُد کا وزن ۲۶۰ درہم " " " "
مَن	۶۸ تولہ ۳ ماشہ	" " من کا وزن بھی " " " " "
استار	بحساب درہم ایک تولہ ۸ ماشہ ۴/۵ رتی بحساب مثقال ایک تولہ ۸ ماشہ ۲ رتی	" ایک استار ساڑھے ۶ درہم ہے اور اس کا وزن یہی نکلتا ہے ایک استار ساڑھے ۴ مثقال ہے جس کا وزن ایک تولہ ۸ ماشہ ۲ رتی ہے۔
اوقیہ	ساڑھے دس تولہ	اوقیہ کا وزن درہم سے حسب تصریح فقہاء ۴۰ درہم ہے جس کا ہندی وزن یہی نکلتا ہے
صاع	بحساب درہم ۲۷۰ تولہ بحساب مثقال ۲۷۲ تولہ	اس کی مفصل تحقیق اصل رسالہ میں گزر چکی ہے۔
نصف صاع	بحساب درہم ۱۳۵ تولہ بحساب مثقال ۱۳۶ تولہ ۶ ماشہ	" " " " "
وسق	بحساب درہم ۵ من ڈھائی سیر ۸۰ تولہ کے سیر سے بحساب مثقال ۵ من پونے ۵ سیر " " "	صاع کا وزن جو اوپر مذکور ہوا اس سے حساب لگایا گیا ہے۔ کیونکہ ایک وسق حسب تصریح فقہاء ۶۰ صاع کا ہے۔

خاتمہ

یہ رسالہ ۵ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ کو تھانہ بھون میں شروع کیا تھا، ۷ ذی قعدہ کو وہاں سے واپسی ہوگئی، رسالہ درمیان میں رہ گیا اتفاقاً ۱۱ ذی قعدہ کو پھر قصبہ شاملی ضلع مظفرنگر میں مدرسہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ کی تقریب پر آنا پڑا اور یہاں کچھ وقت مل گیا، بعونہ تعالیٰ رسالہ کی تکمیل ہوگئی، حق تعالیٰ مفید و نافع اور شبہات کیلیے دافع فرمائے آمین۔ وقد کان ذلک یوم السبت لاثنتی عشرۃ خلت من ذیقعدۃ سنہ ۱۳۶۱ھ

۱۰ شعبان ۱۳۶۵ھ میں اس پر نظر ثانی اور کچھ اضافات ہوئے۔ والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

العبد الضعیف
محمد شفیع
الدیوبندی عفا اللہ عنہ
خادم دار الافتاء بدار العلوم الدیوبندیۃ سابقاً

ضمیمہ

مساحاتِ شرعیہ ور پیمانہائے ہندیہ

ذراع :- عرب میں دو قسم کے ذراع مستعمل تھے ایک ذراع کرباس (کپڑے ناپنے کا گز) دوسرا ذراع مساحت (زمین وغیرہ ناپنے کا گز)

ذراع مساحت حسب تصریح قاضی خاں وغیرہ سات مشت (مٹھی) ہیں جن میں ہر ایک مٹھی کے ساتھ انگوٹھا کھڑا ہو (کذا فی البحر الرائق ص ۱۸ بحث امیاہ. اور یہ مٹھی جس پر انگوٹھا کھڑا ہو آج کل کی پیمائش کے حساب سے چھ انچ ہوتی ہے کیوں کہ اس طرح کی دو مٹھی کا فٹ قرار دیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ذراع مساحت ساڑھے تین فٹ یا بیالیس انچ کا ہوتا ہے جو انگریزی گز سے چھ انچ زیادہ ہے لیکن فقہاء کے کلام میں عموماً جس جگہ ذراع کا لفظ بولا گیا ہے ذراع مساحت مراد نہیں بلکہ ذراع کرباس مراد ہوتا ہے۔ اور بعض مواضع میں فقہاء کا اختلاف بھی ہے کہ بعض نے اس میں ذراع کرباس مراد لیا ہے۔ بعض نے ذراع مساحت جیسا کہ ، دہ در دہ (پانی) کثیر کی بحث میں اور دہ در دہ کی تعیین میں قاضی خاں نے ذراع مساحت کو اختیار کیا ہے لیکن جمہور فقہاء صاحب ہدایہ اور عامہ متون و شروح نے اس جگہ بھی ذراع کرباس ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور ذراع کرباس بھی دو قسم کا مشہور ہے۔ متقدمین میں ۳۲ انگشت کا ذراع معروف ہے اور متاخرین میں ۲۴ انگشت کا۔ انگشت سے مراد ہے کہ ۴ انگلیاں ملا کر رکھی جاویں۔ اور انگوٹھا ان کے ساتھ شامل نہ کیا جاوے۔ پھر چند ان کے برابر دوسری طرح ہم یہاں تک کہ ۳۲ یا ۲۴ ہو جاویں۔ اور چونکہ ایک مشت (مٹھی) بھی ۴ انگشت کی ہوتی ہے اس لئے متقدمین کا ذراع آٹھ مشت (مٹھی) اور متاخرین کا چھ مشت کا ہوگا۔ عامہ کتب مذہب متون و شروح اور فتاوی میں متاخرین کا ذراع مستعمل ہے اسی پر سب

حسابات شرعیہ قائم کئے گئے ہیں یعنی ۶ مشت یا ۲۴ انگشت کا ایک ذراع ۔ و ذمث لما فی تیمم الھندیۃ بعد قولہ اقرب لاقوال کل ذراع اربع وعشرون اصبعًا وعرض کل اصبع ست حبات شعیر ملصقۃ ظھرًا لبطن ھکذا فی التبیین (عالمگیری مصری ص ۲۸ ج ۱) وفی میاہ البحر الرائق اختلف المشائخ فی الذراع علی ثلثۃ اقوال ففی التجنیس المختار ذراع الکرباس واختلف فیہ ففی کثیر من الکتب انہ ست قبضات لیس فوق کل قبضۃ اصبع قائمۃ فھو اربع وعشرون اصبع بعدد حروف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ والمراد بالاصبع القائمۃ ارتفاع الابہام کما فی غایۃ البیان (بحر ص ۸۰ ج ۱) ومثلہ فی تیمم البحر عن الینابیع وذکر انہ ذراع العامۃ وفی حاشیۃ البحر للشامی ھناک انہ ھو المعمول وعزاہ الی الرملی صاحب الخیریۃ (بحر ص ۱۴۷ ج ۱)

عبارات مرقومہ بالا سے واضح ہوگیا کہ قول معتمد فقہاء رحمہم اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ پانی کی مساحت کے متعلق دہ دردہ کے مسئلہ میں ذراع کرباس معتبر ہے اور اس کی صحیح و راجح پیمائش ۲۴ انگلیاں یا ۶ مشت ہے اور یہ بعینہٖ وہ مقدار ہے جس کو ہمارے عرف میں ایک ہاتھ کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ مُغرب میں جس میں خاص فقہی کے لغت جمع کئے گئے ہیں ، والذراع من المرفق الی الاصابع ثم سمی بہا الخشبۃ التی یذرع بہا (الی قولہ) و الذراع المکسرۃ ست قبضات وھی ذراع العامۃ وانما وصفت بذلک لانھا نقصت عن ذراع الست بقبضۃ وھو بعض الاکاسرۃ ولاۃ فرس وکانت ذراعہ سبع قبضات (مغرب ص ۱۹۱ ج ۱)

مُغرب کی اس تحریر سے یہ معلوم ہوگیا کہ بحرالرائق بحث المیاہ میں جو قول ولوالجی سے نقل کیا ہے کہ سات مشت کا ایک ذراع ہوتا ہے یہ اس قدیم ذراع کی پیمائش ہے جو آخری کسریٰ ملک فارس کا ذراع ہے اور اسلام میں عام طور پر جو ذراع رائج ہوا وہ ایک مٹھی کم یعنی ۶ مٹھی یا ۲۴ انگلیوں کا ذراع ہے اور یہی معتبر و مستند ہے اور عرب

اور فقہاء کی سذاجت و سادگی کا بھی یہی مقتضیٰ ہے کہ اُن کے کلام میں ذراع سے مراد یہی ذراع ہو کیونکہ وہ ذراع طبعی (یعنی ایک ہاتھ) کی صحیح مقدار ہے، اور یہ ذراع انگریزی گز سے نصف یعنی ڈیڑھ فٹ یا ۱۸ - اِنچ ہوتا ہے جیسا کہ عام طور پر حکومتی حساب میں اس کی تصریحات الفاظِ ذیل میں موجود ہیں۔

۹، اِنچ = ایک بالشت، ۲ بالشت یا ۱۸، اِنچ = ایک ہاتھ، ۲ ہاتھ = ایک گز
ایک گز = ۳ فٹ یا ۳۶، اِنچ۔

خلاصہ یہ کہ رائج الوقت انگریزی گز اور فٹ کے اعتبار سے

ذراع مساحت = ایک گز ۶ - اِنچ یا ساڑھے تین فٹ یا بیالیس اِنچ
ذراع کرباس = نصف گز یا ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ اِنچ

اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ پانی کے مسائل میں ذراع کرباس معتبر ہے نیز نمازی کے آگے سُترہ جو ایک ذراع ہونا حسب تصریح فقہاء ضروری ہے اس میں بھی یہی ذراع کرباس معتبر ہے۔

میل:- میل اصل لغت عرب میں منتہائے بصر کو کہا جاتا ہے۔ کمافی الصحاح والمغرب وغیرہما اور اصطلاحِ فقہاء میں ایک تہائی فرسخ کو میل کہا جاتا ہے۔ پھر اُس کی مقدار میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔

اوّل چار ہزار گز۔ اور یہی قول معتمد و مختار ہے اور عامہ شروح و فتاوی میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے (کما سیاتی نقلہ)

دوسرے تین ہزار گز۔ یہ قول متقدمین کا ہے اور درحقیقت اس کا مدار اس پر ہے کہ متقدمین کا گز بہ نسبت متاخرین کے اِسی قدر بڑا ہے کہ ان کے چار ہزار گز اُن کے تین ہزار کی برابر ہوتے ہیں جیسا کہ لفظ ذراع کی تحقیق میں گزر چکا ہے کہ متقدمین کا ذراع بتیس انگشت کا ہے اور متاخرین کا چوبیس انگشت کا جن کا حساب کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو مسافت چوبیس انگشت کے ذراع سے چار ہزار ذراع ہوگی وہ بتیس انگشت کے ذراع سے تین ہزار ہو جائے گی۔

تیسرا قول وہ ہے جو صاحب بحرالرائق نے بحوالہ ینابیع نقل کیا ہے کہ ایک میل چار ہزار قدم کا ہے اور ایک قدم ڈیڑھ ذراع کا (بذراع عامہ) جس کے حساب سے ایک میل چھ ہزار ذراع کا ہو جاتا ہے لیکن علامہ شامی نے حاشیہ بحر کے اسی مقام پر بحوالہ زیلعی وغیرہ اس قول کو رد کر دیا ہے کہ معتمد علیہ وہی قول ہے جو زیلعی وغیرہ نے نقل کیا ہے یعنی چار ہزار گز۔

چوتھا قول وہ ہے جو صدر الشریعہ شارح وقایہ نے بلفظ قیل ذکر کیا ہے اور محشین نے اس کو ابن شجاع کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ یہ کہ میل ساڑھے تین ہزار گز سے چار ہزار گز تک ہے۔ مراد اس قول کی یہ ہے کہ ساڑھے تین ہزار سے زائد چار ہزار گز تک بھی ایک ہی میل کہا جائے گا۔ معمولی کمی بیشی کی وجہ سے احکام میں فرق نہ کیا جائے گا۔ یا یہ اشارہ متاخرین کے اختلاف کی طرف ہے اور بہرحال تو صدر الشریعہ نے اس قول کو بلفظ قیل ذکر کر کے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

الغرض ثابت ہوا کہ قول راجح اور مختار اور معتمد یہی ہے کہ میل چار ہزار گز کا ہے جس میں گز متاخرین کا اعتبار کر کے چوبیس انگشت کا قرار دیا گیا ہے جو انگریزی گز سے نصف یعنی اٹھارہ انچ ہے (وہذہ بعض تصریحات الفقہاء علی اختیارہ) فی تیمم الھندیۃ اقرب الاقوال ان المیل وھو ثلث الفرسخ اربعۃ آلاف ذراع کل ذراع اربعۃ وعشرون اصبعًا اھ (عالمگیری ص ۲۸ ج ۱ طبع مصر)

وفی منحۃ الخالق علی البحر الرائق للشامی. عن الزیلعی والجوھرۃ ان قدر المیل اربعۃ آلاف ذراع (الی اخرہ) ورأیت فی القلادۃ الجوھریۃ ماصورتہ قال صاحبنا ابو العباس احمد شہاب الدین بن عماد رحمہ اللہ والیہ یرجع فی ھذا الباب البرید اربعۃ فراسخ والفراسخ ثلثۃ امیال والمیل الف باع والباع اربعۃ اذرع والذراع اربعۃ وعشرون اصبعًا والاصبع ست شعیرات موضوعۃ بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرذون اھ. کلامہ وھو موافق لما فی الزیلعی وقد نظم ذلک

بعضهم فقال ؎

ان البريد من الفراسخ اربع ‏ ‏ ولفرسخ فثلاث اميال ضعوا

والميل الف اى من الباعات قل ‏ ‏ والباع اربع اذرع فتتبعوا

ثم الذراع من الاصابع اربع ‏ ‏ من بعدها العشرون ثم الاصبع

ست شعيرات فظهر شعيرة ‏ ‏ منها الى بطن لاخرى توضع

ثم الشعيرة ست شعرات فقل ‏ ‏ من شعر بغل ليس فيها مدفع

قول فتحصل من هذا كله ان ما نقله الزيلعي هو المعول انتهى كلام الرملي ملخصاً (حاشيه بحر الرائق ص ۱۴۲ ج ۱)

وذكر هذا كله مولانا عبد الحی اللكهنوی فی السعاية مفصلا و اختار ما ذكرنا فی تحقيق الميل (سعاية ص ۴۹۲)

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ میل کے بارہ میں قول مختار فقہائے کرام کا یہ ہے کہ چوبیس انگشت کے گز سے چار ہزار گز کا ایک میل ہے تو انگریزی گز سے دو ہزار گز کا میل شرعی ہوا کیونکہ ۲۴، انگشت کا ذراع ایک ہاتھ یعنی ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ کا ہے جیسا کہ ذراع کی تحقیق میں بحوالہ حکر یتی گزر گیا ہے۔

انگریزی میل اور شرعی میل میں فرق

انگریزی میل حسب تصریح چیمبرز آٹھ فرلانگ کا ہوتا ہے اور ہر فرلانگ دو سو بیس (۲۲۰) گز تو انگریزی میل سترہ سو ساٹھ (۱۷۶۰) گز کا ہو گیا معلوم ہوا کہ شرعی میل انگریزی میل سے دو سو چالیس (۲۴۰) گز بڑا ہے۔

فرسخ :- بفتح فاء وسکون راء وفتح سین تین میل کی مسافت کا نام ہے۔ جیسا کہ عبارات میں گزر گیا۔

برید :- چار فرسخ یا بارہ میل کی مسافت کو کہا جاتا ہے اور نہایہ میں ابن اثیر نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ دراصل فارسی بریدہ دم کا مختصر ہے کیوں کہ ڈاک لے جانے

کے لئے بریدہ دم خچر استعمال کئے جاتے تھے۔ مختصر کرکے برید کہنے لگے۔ پھر اُس کے سوار کو بھی برید کہا جانے لگا یہاں تک کہ یک سوار کی مقررہ مسافت کا بھی برید نام ہو گیا۔

مسافتِ سفر کی تحقیق

سفر شرعی کی مسافت کی تعیین میں صحابہ و تابعین، ور ائمہ مجتہدین کے مذاہب، مختلف ہیں جن کی تفصیل عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی بھی اس بارہ میں روایات مختلف ہیں مگر راجح اور صحیح مذہب امام اعظمؒ کا یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جاوے بلکہ تین دن و تین رات میں جس قدر مسافت انسان پیدل چل کر بآسانی طے کر سکے یا اونٹ کی سواری پر بآسانی طے کرے وہ مقدار مسافت سفر شرعی ہے۔ اور حسب تصریح ابن ہمام بیل کی سواری کا بھی یہی حکم ہے۔ اور حسب تصریح بحر الرائق اونٹ سے بھی قافلہ کا اونٹ مراد ہے تیز رو سانڈنی مراد نہیں۔

اور تین دن تین رات کا یہ مطلب نہیں کہ دن رات چلے بلکہ مراد صرف دن میں چلنا ہے اور وہ بھی پورے دن چلنا نہیں بلکہ جس قدر عادۃً متوسط قوت کا آدمی بآسانی چل سکتا ہے جس کو بعض فقہاء نے صبح سے زوالِ آفتاب تک مقدر فرمایا ہے۔

(کما ذکرہ الشامی و مثلہ فی البحر عن المعراج)

اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے سفر شرعی کی مسافت تین منزل قرار دی ہے۔ صاحبِ ہدایہ اس کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ اس روایت کا حاصل بھی تقریباً وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی تین دن کی مسافت اس کے بعد فرمایا۔

ولا معتبر بالفراسخ هو الصحیح　　　یعنی فرسخ اور میلوں کی تعیین کا کوئی اعتبار نہیں صحیح مذہب یہی ہے

❊　❊　❊

اسی لئے عام متون و شروح میں جمہور مشائخ حنفیہ کا مختار یہی ہے کہ میلوں کی تعیین نہ کی جاوے۔

فتح القدیر، عمدۃ القاری، البحر الرائق، شامی، درمختار وغیرہ سب کا اسی پر اتفاق ہے۔ اس کے خلاف بعض فقہاء نے فراسخ یا میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے۔ حضرت امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ ۴۸ میل سے کم میں قصر نہ کرے اور یہی امام احمدؒ کا مذہب ہے۔ اور امام شافعی سے بھی ایک روایت یہی ہے (عمدۃ القاری ص ۵۲۱ ج ۳)

اور مشائخ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ جس کے تریسٹھ میل ہوتے ہیں بعض نے اٹھارہ فرسخ جس کے چوّن میل ہوتے ہیں۔ اور بعض نے پندرہ فرسخ جس کے پینتالیس میل ہوتے ہیں مسافت قصر قرار دی۔ عمدۃ القاری میں اٹھارہ فرسخ کے قول پر فتوی نقل کیا ہے۔ اور البحر الرائق میں بھی بحوالہ نہایہ اسی قول پر فتوی نقل کیا ہے۔ اور شامی اور بحر نے بحوالہ مجتبیٰ اکثر ائمہ خوارزم کا فتویٰ پندرہ فرسخ کی روایت پر ذکر کیا ہے (بحر ص ۱۴۰ ج ۱)

اور شیخ محقق ابن ہمام نے شرح ہدایہ میں میلوں کی تعیین معتبر نہ ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تین دن تین رات کی مسافت جو اصل مذہب ہے وہ راستوں کے اختلاف سے مختلف ہو سکتی ہے کیوں کہ صاف راستہ میں اگر انسان ایک دن میں سولہ میل چل سکتا ہے تو دشوار گزار راستہ میں بارہ میل بمشکل طے ہوتے ہیں اور پہاڑی راستوں میں تو آٹھ دس میل بھی طے کرنا مشکل ہوتا ہے اس لئے میلوں کی تعیین مناسب نہیں بلکہ جیسا راستہ ہو اُس کے اندازے سے جس قدر میل بآسانی تین دن میں پیادہ طے ہو سکیں وہی مسافت قصر ہے (فتح القدیر ص ۳۹۴ ج ۱)

لیکن ہندوستان کے عام بلاد میں چونکہ راستے تقریباً مساوی ہیں پہاڑی یا دشوار گزار نہیں ہیں اس لئے علماء ہندوستان نے میلوں کے ساتھ تعیین کردی ہے۔

پھر جن حضرات فقہاء نے میلوں یا فراسخ کے ساتھ مسافت قصر کی تعیین فرمائی ہے اُن میں مختلف اقوال ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس لئے محققین علماء ہندوستان نے

۴۸ میل انگریزی کو مسافت قصر قرار دے دیا ہے جو اقوال فقہاء مذکورین کے قریب قریب ہے۔ اور اصل مدار اس کا اسی پر ہے کہ اتنی ہی مسافت تین دن تین رات میں پیادہ مسافر بآسانی طے کر سکتا ہے اور فقہاء حنفیہ کے مفتیٰ بہ اقوال میں سے جو منتویٰ ائمہ خوارزم کا پندرہ فرسخ کا نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً اس کے بالکل مطابق ہے کیونکہ پندرہ فرسخ کے ۴۵ میل شرعی ہوتے ہیں اور شرعی میل انگریزی میل سے دو سو چالیس گز بڑا ہوتا ہے۔ تو ۴۵ میل شرعی ۴۸ میل انگریزی سے کچھ زیادہ متفاوت نہیں رہتے۔

اور ۴۸ میل کی تعیین پر ایک حدیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے جو دارقطنی نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

یا اهل مكة لا تقصروا الصلوٰة في ادنى من اربعة برد من مكة الى عسفان (عمدة القاری ص ۵۲۱ ج ۳)	اے اہل مکہ چار برید سے کم میں نماز کا قصر مت کرو جیسے مکہ سے عسفان تک۔

وذكره ابن اثير في النهاية

اس روایت کی سند میں اگرچہ ایک راوی ضعیف ہے (کما ذکرہ العینی) تاہم چوں کہ مدار اصل مذہب کا تین دن کی مسافت پر ہے اس کو محض تائید کے لئے پیش کیا گیا ہے اور تائید میں ضعیف حدیث بھی کافی ہے اس لئے استدلال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام العلماء حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے ایک استفتاء کے جواب میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی بعینہٖ نقل یہ ہے۔

سوال:۔ کتنی مسافت سفر میں نماز قصر کرنا چاہیئے بحسب احادیث صحیحہ؟

الجواب:۔ چار برید جس کی سولہ سولہ میل کی تین منزل ہوتی ہیں۔ حدیث موطا مالک سے ثابت ہوتی ہیں مگر مقدار میل کی مختلف ہے۔ لہٰذا تین منزل جامع سب اقوال کو ہو جاتی ہیں فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ رشید احمد عفی عنہ

سوال:۔ فرسخ اور میل کی تحدید معتبر کیا ہے؟

الجواب:۔ فرسخ تین میل کا اور میل چار ہزار قدم کا لکھتے ہیں۔ مگر یہ سب تقریبی امور

ہیں۔ اصل میں اس مسافت کا نام ہے کہ نظر مستشل کرے۔ اور یہ بھی مختلف ہے وقت اور محل اور رائی (دیکھنے والے) کے اعتبار سے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ حصّہ اوّل ص ۲۵)

الغرض مذہب مختار کے مطابق مسافتِ قصر تین منزل یا ۴۸ میل انگریزی ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

خلاصہ اس تمام ضمیمہ کا بصورتِ جدول یہ ہے

نام پیمانہ عربی	پیمائش ہندی	کیفیت
ذراع شرعی	ڈیڑھ فٹ یا اٹھارہ انچ	اصل میں ۲۴ انگشت یا ایک ہاتھ ہے جس کی پیمائش ڈیڑھ فٹ ہوتی ہے۔
میل شرعی	ایک میل انگریزی اور ۲۴۰ گز	کمامر تحقیقہ
فرسخ	۳ میل انگریزی اور ۷۲۰ گز یا ۳ میل شرعی	کمامر
برید	۱۲ میل انگریزی	

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وبہ فی الاول والاخر نستعین وھو نعم الوکیل ونعم المعین۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۷ ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ

تصدیقات علماء کرام

تقریظ و تصدیق از سیدی و سندی حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ تھانوی قدس سرہٗ

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ احقر اشرف علی عفی عنہ نے رسالہ اوزانِ شرعیہ کو باستیعاب دیکھا فقدانِ قوت و نقصان وقت کے سبب ماخذ و مبانی پر پوری تطبیق سے تو معذور رہا لیکن بقول شاعر عربی و عارف پارسی ۔ سبوح لہا منہا علیہا شواھد و اے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب الخ۔ خود رسالہ اپنی صحت و صدق کی شہادت کا کفیل ہے جس کی بنا پر عین مطالعہ کے وقت بے ساختہ اس کا لقب ادجر الاقاویل فی اصح الموازین و المکائیل قلب پر وارد ہوا حق تعالیٰ سے اس کی مقبولیت اور نافعیت کی دعا کرتا ہوں فقط۔ ۲ الثانی من ذی الحجۃ ۱۳۶۱ھ فی الخانقاہ الامدادیۃ من تھانہ بھون صینت ابد الزمن من الشرور و الفتن۔

تقریظ و تصدیق از شیخ التفسیر و الحدیث حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہم

سابق صدر مہتمم دار العلوم دیوبند

برادر محترم جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ رسالہ میں نے پڑھا بے حد محظوظ و مستفید ہوا۔ اس قدر تحقیق و کاوش آپ ہی کا حصہ تھا حق تعالیٰ جزائے خیر دے۔ مجھے اس کے مضمون سے اتفاق ہے۔ شبیر احمد عثمانی۔ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ

تصدیقات علماء مظاہر علوم سہارنپور

نحمدہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ

میں بھی رسالہ "ادجر الاقاویل" کے مطالعہ سے مشرف ہوا مفتی صاحب کی تحقیق میرے نزدیک صحیح اور اکثر علماء ہندوستان کی تصریحات کے مطابق ہے۔

۱۳۵۶ھ ہجری میں حیدر آباد دکن سے ایک صاحب نے مفتی حیدر آباد دکن اور مفتی دار العلوم دیوبند کے فتاوٰی کا خلاصہ تحقیق صاع کے متعلق لکھ کر بھیجا تھا اور ہم سے رائے طلب کی تھی۔ ہم نے اس وقت بھی مفتی دار العلوم دیوبند کی تصویب کرتے ہوئے مفتی حیدر آباد کی تحقیق سے اختلاف کیا تھا۔ اب بھی ہمارے نزدیک "رسالہ" ارجح الاقاویل میں صاع ونصاب کی جو تحقیق کی گئی ہے علماء حیدر آباد کو اس مسئلہ پر دوبارہ غور کرنا چاہئے اور اپنی تحقیقات کو شائع کرنا چاہئے۔

سعید احمد غفرلہٗ

خادم دار الافتاء مظاہر علوم سہارن پور

۴ محرم الحرام ۶۲ھ

بندہ ضعیف عبد اللطیف ناظم وخادم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کی رائے اور تحقیق کو صحیح اور ارجح سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ مفتی صاحب موصوف کو جزائے خیر دے۔ ۴ صفر ۶۲ھ ہجری

حامداً ومصلیاً ومسلماً۔ امابعد، احقر رسالہ ارجح الاقاویل فی اصح الموازین والمکاییل (مولفہ محترم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ حضرت مؤلف دام مجدہ نے تحقیق وتدقیق محنت وتفتیش کے ساتھ اس رسالہ کی تصنیف سے مسلمانوں کی شدید ضرورت کو پورا کیا فجزاہ اللہ تعالیٰ عنی وعن سائر المستفیدین احسن الجزاء اللہ تعالیٰ اس سعی ومحنت کو قبول فرمائے۔

بندہ ناکارہ عبد الرحمٰن غفرلہٗ

خادم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ۳ محرم ۱۳۹۱ھ

تقریظ وتصدیق از حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی از دار المصنفین اعظم گڑھ

رسالہ مقادیر شرعیہ نظر سے گزرا بڑی ضروری تحقیق فرمائی۔ آپ اجازت دیں تو اس کی تلخیص

معارف میں شائع کر دوں۔ میں خود اس میں بہت متردد تھا مگر چونکہ حساب سے مجھے فطرۃً لگاؤ نہیں۔ اس لئے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر میلان ہوتا تھا۔ مولانا مجد صاحب مرحوم کی بھی تحقیق مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ فرنگی محلی سے مختلف تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

والسلام!

سید سلیمان

۲۴؍ فروری ۱۹۴۳ء۔

تقریظ از حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ تھانوی دامت برکاتہم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ وبعد فقد تشرفت بمطالعۃ الرسالۃ المبارکۃ الملقبۃ بأرجح الأقاویل فی أصح الموازین والمکائیل" للمحبی وحبیبی الفاضل المقدام الفقیہ العلام مولانا محمد شفیع الدیوبندی المفتی بأجل مدارس الإسلام فسررت بہا مسرۃ من رأیٰ ہلال العید۔ ووجدت بہا وجد من ادرک الفقید۔ فللہ درہ من محقق قد اتیٰ بما لا یحتمل المزید من تحقیق انیق۔ ومن مصیب قد دق لاستخراج الدرر من لجۃ بحر عمیق، لازال مشمولا برعایۃ الحق واعانۃ التوفیق واللہ خیر موفق لہ ومعین وصلی اللہ علیٰ سید المرسلین خاتم النبیین سیدنا النبی محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

وانا الفقیر الی اللہ الصمد

عبدہ المذنب ظفر احمد

العثمانی التھانوی عفا عنہ ربہ القوی

۳؍ محرم ۱۳۶۲ھ

مکتوب جناب عبدالرشید صاحب مدرس مدرسہ الٰہیہ بھوپال در تقریظ رسالہ

جناب مکرم و محترم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

"المفتی" جلد ۸ کا نمبر ۸ پہنچا اس میں مقادیر شرعیہ کی جو دو جواب تحقیق کی گئی ہے اس پر میں کہاں تک آپ کو دعائیں دوں۔

اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و علم و عمل میں بہت ہی بہت برکت فرمائے۔ آمین ثم آمین!

میں مولانا فرنگی محلی مرحوم و مغفور سے بہت زیادہ حسن ظن و حسن و عقیدت رکھتا ہوں اس لئے عقیدۃً اُن کی تحقیق کو ارجح و اقوی سمجھے ہوئے تھا لیکن خدا جانے کیوں عمل ہمیشہ جمہور علماء کے فتویٰ و مسلک کے موافق رہا۔ مسئلہ ہمیشہ اُسی پرانے مسلک کے موافق بتاتا رہا۔ مرحوم و مغفور کی تحقیق پر اتنا اعتماد تھا کہ کبھی مزید تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، اب آپ کی اس تحقیق کو دیکھ کر آنکھیں کھلیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے غلطی سے زبردستی بچائے رکھا۔ اب اس وقت مجھے مولانا تھانوی و حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہما اور آپ پر بہت اعتماد ہے۔ ان میں سے آپ سے کسی قدر بے تکلف بھی ہو گیا ہوں اس لئے عرض کرتا ہوں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ حقوق الزوجین بھی ملاحظہ فرما کر اُس پر بھی ایک بسیط تبصرہ تحریر فرمائیں۔ مجھے اُن کی رائے کچھ صحیح و درست معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہ رسالہ دیوبند میں دستیاب ہو جائے گا۔ ورنہ دفتر ترجمان القرآن سے منگوا لیجئے۔

المفتی کے بند ہونے کا رنج و قلق اس کے دوبارہ جاری ہونے تک باقی رہے گا۔ میں اگر کسی قابل ہوتا تو اس نقصان میں کوئی حصہ اپنے ذمہ لیتا مگر یہ تو مجھ سے کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ میں بقیہ چندہ کو فی الواقع باقی سمجھ کر اُس کی واپسی چاہوں میرے نزدیک ہر خریدار پر آپ کا فاضل ہے اس لئے میری طرف سے تو آپ بالکل بے فکر و مطمئن رہیں۔ میں نہ نقدی چاہتا ہوں نہ کتاب۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو آنکھیں دے کہ وہ علماء کے اخلاص و دیانت کو دیکھیں اور اس سے سبق لیں۔ فقط

اضعف العباد
مسکین عبدالرشید عفی عنہ
سابق مدرس مدرسہ سلیمانیہ حال مدرس مدرسہ الٰہیہ بھوپال
سہ شنبہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ ۵ جنوری ۱۹۴۳ء

از مولانا عبدالماجد صاحب مدیر "صدق" لکھنؤ

ادجز الاقاویل فی اصح الموازین والمکائیل۔ از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ ۲۴ صفحے خود مصنف ہی کے پاس سے دیوبند ضلع سہارن پور کے پتہ سے غالباً ٹکٹ بھیجنے پر مل جائے۔

کتاب شریعت کے باب الاحکام میں حوالے مختلف مقداروں اور پیمانوں کے ملتے ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ میں سونے چاندی کا نصاب، صدقۂ فطر میں صاع کا وزن، سفر شرعی میں مسافت وغیرہا۔ اور اس باب میں فقہاء و علماء ہند نے بڑی کوشش و کاوش سے ہندی وزن و پیمانے درج کئے ہیں۔ لیکن بشری تحقیق مسامحت سے کہاں خالی رہ سکتی ہے۔ بعض اقوال میں باہم اختلاف بھی ملتا ہے۔ اب مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی نے از سر نو ان مسائل کو اپنا موضوع تحقیق بنایا ہے ——— اور حق یہ ہے کہ سعی و کاوش کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی تحقیق کی تصدیق پر تو حضرت مولانا تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے جید علماء کی مہریں ثبت ہیں۔ باقی جہاں تک تدقیق و موشگافی کا تعلق ہے اس کا اندازہ تو ہم عامیوں کو بھی ہو سکتا ہے اور اس کی داد دل سے بے ساختہ نکلتی ہے۔ رشک کے ساتھ حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں بھی ایسے ایسے عنوانات پر اس درجہ تحقیق کر ڈالنے والے موجود ہیں۔

احکام عید الاضحیٰ

و

قربانی

****

مقام تالیف: ــــــــــــــ کراچی
اشاعت اوّل: ـــــ شعبہ نشر واشاعت دارالعلوم، کراچی ۱۴

"ایک مختصر رسالہ جو عوام الناس کے فائدے کے لئے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتا رہتا ہے"

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے عشرۂ ذی الحجہ سے بہتر کوئی زمانہ نہیں۔ ان میں ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر اور ایک رات میں عبادت کرنا شب قدر کی عبادت کے برابر ہے (ترمذی وابن ماجہ)

قرآن مجید سورۂ والفجر میں اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کی قسم کھائی ہے، وہ دس راتیں جمہور کے قول پر یہی عشرۂ ذی الحجہ کی راتیں ہیں، خصوصاً نویں تاریخ یعنی عرفہ کا دن، اور عرفہ اور عید کی درمیانی رات ان تمام ایام میں بھی خاص فضیلت رکھتے ہیں، یعنی نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا ایک سال گذشتہ اور ایک سال آیندہ کا کفارہ ہے اور عید کی رات میں بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہنا بہت بڑی فضیلت اور ثواب کا موجب ہے۔

تکبیر تشریق اَللّٰہُ اَکْبَرُ. اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ عرفہ یعنی نویں تاریخ کی صبح سے تیرھویں تاریخ کی عصر تک ہر نماز کے بعد بآواز بلند ایک مرتبہ یہ تکبیر پڑھنا واجب ہے فتویٰ اس پر ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے والے اور تنہا پڑھنے والے اس میں برابر ہیں، اسی طرح مرد وعورت دونوں پر واجب ہے البتہ عورت بآواز بلند تکبیر نہ کہے آہستہ کہے (شامی)

تنبیہ اس تکبیر کو متوسط بلند آواز سے کہنا ضروری ہے بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں، پڑھتے ہی نہیں، یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

نمازِ عید عیدالاضحیٰ کے روز یہ چیزیں مسنون ہیں صبح کو سویرے اٹھنا، غسل و مسواک کرنا، پاک، صاف، عمدہ کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا۔ عیدگاہ کو جاتے ہوئے تکبیر مذکور الصدر بآواز بلند پڑھنا۔ نماز عید دو رکعت ہیں، مثل دوسری نمازوں کے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر رکعت کے اندر تین تین تکبیریں زائد ہیں۔

پہلی رکعت میں سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ الخ پڑھنے کے بعد قرأت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے ان زائد تکبیروں میں کانوں تک ہاتھ اٹھانا چاہیے۔ پہلی رکعت میں دو تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیں، تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں۔ دوسری رکعت میں تینوں تکبیروں کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے جائیں، چوتھی تکبیر کے ساتھ رکوع میں چلے جائیں۔ نماز عید کے بعد خطبہ سننا سنت ہے۔

قربانی قربانی ایک اہم عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا، مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے۔ اسی طرح آج تک بھی دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے، بتوں کے نام پر یا مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں۔ سورۂ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی، قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہیئے (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا یہی مفہوم ہے۔ دوسری ایک آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد ہجرت دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا، ہر سال برابر قربانی کرتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظمہ کے لئے مخصوص نہیں، ہر شخص پر، ہر شہر میں بعد تحقق شرائط واجب ہے (ترمذی) اور مسلمانوں کو اس کی

تاکید فرماتے تھے۔ اسی لئے جمہورِ اسلام کے نزدیک قربانی واجب ہے (شامی)

قربانی کس پر واجب ہوتی ہے؟ قربانی ہر مسلمان عاقل، بالغ مقیم پر واجب ہوتی ہے جس کی ملک میں ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کا مال اس کی حاجاتِ اصلیہ سے زائد موجود ہو۔ یہ مال خواہ سونا، چاندی یا اس کے زیورات ہوں یا مالِ تجارت یا ضرورت سے زائد گھر یلو سامان یا مسکونہ مکان سے زائد کوئی مکان وغیرہ ہو (شامی)

قربانی کے معاملہ میں اس مال پر سال بھر گذرنا بھی شرط نہیں، بچہ اور مجنون کی ملک میں اگر اتنا مال ہو تو بھی اس پر اس کی طرف سے اس کے ولی پر قربانی واجب نہیں، اسی طرح جو شخص شرعی قاعدے کے موافق مسافر ہو اس پر بھی قربانی لازم نہیں (شامی)

مسئلہ:- جس شخص پر قربانی واجب نہ تھی، اگر اس نے قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا تو اس کی قربانی واجب ہوگئی (شامی)

قربانی کے دن قربانی کی عبادت صرف تین دن کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے دنوں میں قربانی کی کوئی عبادت نہیں، قربانی کے دن ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخیں ہیں، اس میں جب چاہے قربانی کر سکتا ہے، البتہ پہلے دن کرنا افضل ہے۔

قربانی کے بدلے میں صدقہ وخیرات اگر قربانی کے دن گذر گئے، ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہیں کر سکا تو قربانی کی قیمت فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانوروں کی قیمت صدقہ کر دینے سے یہ واجب ادا نہ ہوگا۔ ہمیشہ گناہگار رہے گا کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا، ایسے ہی صدقہ خیرات کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور تعامل اور پھر تعامل صحابہ اس پر شاہد ہیں۔

قربانی کا وقت جن بستیوں یا شہروں میں نماز جمعہ و عیدین جائز ہے۔ وہاں نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں، اگر کسی نے نماز سے پہلے قربانی کر دی تو اس پر دوبارہ قربانی لازم ہے، البتہ چھوٹے گاؤں جہاں جمعہ و عیدین کی نمازیں نہیں ہوتیں، یہ لوگ دسویں تاریخ کی صبح صادق کے بعد قربانی کر سکتے ہیں؛ ایسے ہی اگر کسی عذر کی وجہ سے نماز عید پہلے دن نہ ہو سکے تو نماز عید کا وقت گذر جانے کے بعد قربانی درست ہے۔ (درمختار)

مسئلہ:۔ قربانی رات کو بھی جائز ہے، مگر بہتر نہیں (شامی)

قربانی کے جانور بکرا، دنبہ، بھیڑ، ایک ہی شخص کی طرف سے قربانی کیا جا سکتا ہے، گائے، بیل، بھینس، اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ایک کافی ہے بشرطیکہ سب کی نیت ثواب کی ہو، کسی کی نیت محض گوشت کھانے کی نہ ہو۔

مسئلہ:۔ بکرا، بکری ایک سال کا پورا ہونا ضروری ہے، بھیڑ اور دنبہ اگر اتنا فربہ اور تیار ہو کہ دیکھنے میں سال بھر کا معلوم ہو تو وہ بھی جائز ہے، گائے، بیل بھینس دو سال کی، اونٹ پانچ سال کا ہونا ضروری ہے، ان عمروں سے کم کے جانور قربانی کے لئے کافی نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر جانوروں کا فروخت کرنے والا پوری عمر بتاتا ہے اور ظاہری حالات سے اس کے بیان کی تکذیب نہیں ہوتی تو اس پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

مسئلہ:۔ جس جانور کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہوں یا بیچ میں سے ٹوٹ گیا ہو اس کی قربانی جائز ہے، ہاں سینگ جڑ سے اُکھڑ گیا ہو جس کا اثر دماغ پر ہونا لازم ہے تو اس کی قربانی درست نہیں (شامی)

مسئلہ:۔ خصی (بدھیا) بکرے کی قربانی جائز بلکہ افضل ہے (شامی)

مسئلہ:۔ اندھے، کانے، لنگڑے جانور کی قربانی درست نہیں، اسی طرح ایسا مریض و لاغر جانور جو قربانی کی جگہ تک اپنے پیروں نہ جا سکے، اس کی قربانی بھی جائز نہیں ہے۔

مسئلہ :- جس جانور کا تہائی سے زیادہ کان یا دُم وغیرہ کٹی ہوئی ہو اس کی قربانی جائز نہیں (شامی)

مسئلہ :- جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں، یا اکثر نہ ہوں اس کی قربانی جائز نہیں (شامی، درمختار) اسی طرح جس جانور کے کان پیدائشی طور پر بالکل نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ :- اگر جانور صحیح سالم خریدا تھا۔ پھر اس میں کوئی عیب مانع قربانی پیدا ہو گیا تو اگر خریدنے والا غنی صاحب نصاب نہیں ہے تو اس کے لئے اس عیب دار جانور کی قربانی جائز ہے اور اگر یہ شخص غنی صاحب نصاب ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس جانور کے بدلے دوسرے جانور کی قربانی کرے (درمختار وغیرہ)

قربانی کا مسنون طریقہ اپنی قربانی کو خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرا سکتا ہے، مگر ذبح کے وقت وہاں خود بھی حاضر رہنا افضل ہے۔

مسئلہ :- قربانی کی نیت صرف دل سے کرنا کافی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں، البتہ ذبح کرنے کے وقت بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرْ کہنا ضروری ہے سنت ہے کہ جب جانور کو ذبح کرنے کے لئے روبہ قبلہ لٹائے تو یہ آیت پڑھے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور ذبح کرنے کے بعد یہ دُعا پڑھے اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ وَّخَلِیْلِكَ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِمَا السَّلَامُ

آدابِ قربانی قربانی کے جانور کو چند روز پہلے سے پالنا افضل ہے۔

مسئلہ :- قربانی کے جانور کا دودھ نکالنا یا اس کے بال کاٹنا جائز نہیں اگر کسی نے ایسا کر لیا تو دودھ اور بال یا اُن کی قیمت کو صدقہ کرنا واجب ہے (بدائع)

مسئلہ :- قربانی سے پہلے چھری کو خوب تیز کرے اور ایک جانور کو دوسرے

جانور کے سامنے ذبح نہ کرے، اور ذبح کے بعد کھال اتارنے اور گوشت کے ٹکڑے کرنے میں جلدی نہ کرے، جب تک پوری طرح جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے۔

متفرق مسائل

عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں لیکن جس شہر میں کئی جگہ نماز عید ہوتی ہو تو شہر میں کسی جگہ بھی نماز عید ہو گئی تو پورے شہر میں قربانی جائز ہو جاتی ہے (بدائع)

مسئلہ: قربانی کے جانور کے اگر ذبح سے پہلے بچہ پیدا ہو گیا یا ذبح کے وقت اس کے پیٹ سے زندہ بچہ نکل آیا تو اس کو بھی ذبح کر دینا چاہیئے (بدائع)

جس شخص پر قربانی واجب تھی اگر اس نے قربانی کا جانور خرید لیا پھر وہ گم ہو گیا یا چوری ہو گیا یا مر گیا تو واجب ہے کہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے۔ اگر دوسری قربانی کے بعد پہلا جانور مل جائے تو بہتر یہ ہے کہ اس کی بھی قربانی کر دے لیکن اس کی قربانی اس پر واجب نہیں، اگر یہ شخص غریب ہے جس پر پہلے سے قربانی واجب نہ تھی، نفلی طور پر اس نے قربانی کے لئے جانور خرید لیا، پھر وہ مر گیا یا گم ہو گیا تو اس کے ذمہ دوسری قربانی واجب نہیں۔ ہاں اگر گم شدہ جانور قربانی کے دنوں میں مل جائے تو اس کی قربانی کرنا واجب ہے اور ایام قربانی کے بعد ملے تو اس جانور یا اس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے (بدائع)

قربانی کا گوشت ۱۔۔۔ جس جانور میں کئی حصہ دار ہوں تو گوشت وزن کر کے تقسیم کیا جائے، اندازہ سے تقسیم نہ کریں۔

۲۔۔۔ افضل یہ ہے کہ قربانی کا گوشت تین حصے کر کے ایک حصہ اپنے اہل و عیال کے لئے رکھے، ایک حصہ احباب و اعزہ میں تقسیم کرے، ایک حصہ فقراء و مساکین میں تقسیم کرے اور جس شخص کے عیال زیادہ ہوں وہ تمام گوشت خود بھی رکھ سکتا ہے۔

۳ــــ قربانی کا گوشت فروخت کرنا حرام ہے۔

۴ــــ ذبح کرنے والے کی اجرت میں گوشت یا کھال دینا جائز نہیں۔ اجرت علیحدہ دینی چاہیئے۔

قربانی کی کھال ۱ــــ قربانی کی کھال کو اپنے استعمال میں لانا مثلاً مصلیٰ بنا لیا جائے، یا چمڑے کی کوئی چیز ڈول وغیرہ بنوالیا جائے، یہ جائز ہے لیکن اگر اس کو فروخت کیا تو اس کی قیمت اپنے خرچ میں لانا جائز نہیں۔ بلکہ صدقہ کرنا اس کا واجب ہے اور قربانی کی کھال کو فروخت کرنا بدون نیت صدقہ کے جائز بھی نہیں۔ (عالمگیری)

۲ــــ قربانی کی کھال کسی خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں، اسی لئے مسجد کے مؤذن یا امام وغیرہ کے حق الخدمت کے طور پر ان کو کھال دینا درست نہیں۔

۳ــــ مدارس اسلامیہ کے غریب اور نادار طلباء ان کھالوں کا بہترین مصرف ہیں کہ اس میں صدقہ کا ثواب بھی ہے، احیائے علم دین کی خدمت بھی مگر مدرسین ملازمین کی تنخواہ اس سے دینا جائز نہیں۔

واللّٰہ الموفق والمعین
بندہ محمد شفیع عفا اللّٰہ عنہ کراچی

رَافِعُ التَّلَاحِیْ
عَنْ
جُلُوْدِ الْأَضَاحِیْ

چرمِ قربانی کے احکام

اشاعتِ اوّل — دار الاشاعت دیوبند سنہ ۱۳۵۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ چرمِ قربانی کے متعلق بعض علماء بریلی فرماتے ہیں کہ قربانی کرنے والا یا بعینہٖ یا قیمت چرم کا رخیہ میں دینے کی نیت سے بیچ کر مہتمم مدرسہ یا متولی مسجد کو دیدے اور چرم قربانی وصول ہونے کی صورت میں مہتمم و متولی بیچ کر مدرسہ و مسجد میں خواہ تنخواہ ہو یا غیر تنخواہ صرف کرے سب جائز ہے۔ کیا یہ مسئلہ صحیح ہے اگر نہیں تو مدلل ارشاد فرمایا جاوے تاکہ مخالف پر حجت قائم ہو سکے اور قوم گمراہی سے محفوظ رہے۔ بینوا توجروا فقط۔

الجواب

(۱) فی العالمگیریۃ یتصدق بجلدھا او یعمل منہ نحو غربال و جراب (الی قولہ) ولا یبیعہ بالدراھم لینفق الدراھم علی نفسہ وعیالہ واللحم بمنزلۃ الجلد فی الصحیح حتی لا یبیعہ بما لا ینتفع بہ الا بعد استھلاکہ ولو باعھا بالدراھم لیتصدق بھا جاز لانہ قربۃ کالتصدق کذا فی

التبیین وھکذا فی الھدایۃ والکافی (عالگیری کتاب الاضحیۃ باب ۶ ص ۳۱۲ ج ۵)۔
(۲) وفی الھدایۃ لو باع الجلد او اللحم بالدراھم او بما لا ینتفع بہ الا بعد استھلاکہ تصدق بثمنہ لان القربۃ انتقلت الی بدلہ ص ۳۳۴ ج ۲ وفی حواشی الھدایۃ من الکافی ۔ انتقلت القربۃ الیہ فوجب التصدق (۳) وفی الدر المختار فان بیع اللحم او الجلد بہ ای بمستھلک او بدراھم تصدق بثمنہ ومفادہ صحۃ البیع مع الکراھۃ واقرہ الشامی ص ۲۲۸ ج ۵۔ (۴) وفی البدائع لا یحل بیع جلدھا وشحمھا ولحمھا (الی قولہ) من الدراھم والدنانیر والماکولات والمشروبات ولا ان یعطی اجر الجزار والذابح منھا لما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من باع جلد اضحیۃ فلا اُضحیۃ لہ (الی قولہ) فان باع شیئاً من ذلک نفذ بیعہ عند ابی حنیفۃ ومحمد رح وعند ابی یوسف لا ینفذ لما ذکرنا فیما قبل الذبح ویتصدق بثمنہ لان القربۃ ذھبت عنہ فیتصدق بہ ولانہ استفادہ بسبب محظور وھو البیع فلا یخلو عن خبث فکان سبیلہ التصدق (بدائع ص ۸۱ ج ۵) (۵) وفی الخلاصۃ و لا باس ببیعہ بالدراھم لیتصدق بھا ولیس لہ ان یبیعہ بالدراھم لینفقھا علی نفسہ ولو فعل ذلک یتصدق بثمنہ (خلاصۃ الفتاوی ص ۳۲۲ ج ۴) (۶) وفی البحر و یاکل من لحم الاضحیۃ ویوکل ویدخر (الی قولہ) ولما جاز ان یأکل منہ وھو غنی فالاولی ان یجوز لہ اطعام غیرہ وان کان غنیاً انتھیٰ ثم قال ولا یبیعہ بالدراھم لینفق الدراھم علیٰ نفسہ وعیالہ (الی قولہ) ولو باعھا بالدراھم لیتصدق بھا جاز لانہ قربۃ کالتصدق بالجلود واللحم وقولہ علیہ السلام من باع جلد اضحیۃ فلا اضحیۃ لہ یفید کراھیۃ البیع واما المبیع فجائز لوجود الملک والقدرۃ علی التسلیم (بحر ص ۱۷۸ ج ۸)

عبارات مذکورہ بالا سے قربانی کے چمڑے اور گوشت کے متعلق احکام ذیل ثابت ہوئے۔

(الف) گوشت اور چمڑا جب تک خود موجود ہے اس میں قربانی کرنے والے کو تین قسم
کے اختیار شرعاً حاصل ہیں۔

(۱) خود کھانا اور استعمال کرنا

(۲) دوسرے احباب اغنیاء کو کھلانا اور استعمال کرانا۔

(۳) فقراء اور مساکین پر صدقہ کر دینا جیسا کہ عبارت بحر مندرجہ ۶ سے معلوم ہوا
نیز آیت قرآنی میں منصوص ہے فکلوا منہا و اطعموا البائس الفقیر۔

(ب) اور اگر قربانی کا چمڑا یا گوشت (علی القول المختار) نقد روپیہ کے عوض یا کسی
ایسی چیز کے عوض فروخت کر دیا جس سے نفع اٹھانا اس کی اصل کے قائم رہتے ہوئے
ممکن نہ ہو جیسے کھانے پینے کی چیزیں تو اس صورت میں صرف تیسری صورت متعین ہو جاتی
ہے یعنی صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ خود کھانا یا اغنیاء کو کھلانا جائز نہیں رہتا۔
خواہ صدقہ کرنے ہی کی نیت سے فروخت کیا ہو یا اپنے کھانے پینے کے لئے۔ بہر حال
صدقہ کرنا اس کا واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ تمام عبارات مذکورۃ الصدر میں اس کی تصریح
ہے بالخصوص عبارت خلاصہ مندرجہ ۵ و عبارت بحر ۶ میں بوضاحت مذکور ہے۔

(ج) یہ بھی معلوم ہوا کہ فروخت کرنا قربانی کے گوشت یا چمڑے کا اگر صدقہ کرنے
کی نیت سے ہو تو جائز ہے اور اگر اپنے کھانے پینے کی غرض سے ہو تو گناہ ہے لیکن بیع
صحیح ہو جاتی ہے جیسا کہ ہدایہ اور بدائع میں اس کی تصریح ہے۔ رہا بعض کا یہ شبہ کہ جب
گناہ اور ناجائز ہے تو بیع کیسے صحیح ہو جائے گی سو یہ محض عامیانہ شبہ ہے۔ جس شخص کو
فقہ حنفی سے کوئی مناسبت ہے وہ ایسا شبہ نہیں کر سکتا کیونکہ فقہ حنفی میں سینکڑوں
نظائر اس کے موجود ہیں کہ باوجود فعل ناجائز ہونے کے عقد جائز ہو جاتا ہے جیسے جمعہ کی
اذان کے بعد بیع و شراء ناجائز اور گناہ ہے لیکن اگر کسی نے کر لی باوجود گناہ گار ہونے
کے بیع نافذ ہو جاتی ہے اور مبیع اس کی ملک میں آ جاتی ہے اس کے علاوہ اور سینکڑوں نظائر
اس کے فقہ میں موجود ہیں ایسا شبہ وہی کر سکتا ہے جو یا تو فقہ سے بالکل ناواقف ہو یا منکر ہو
خلاصہ یہ کہ اگر اپنے استعمال کی نیت سے فروخت کر دیا تو باوجود گناہ گار ہونے کے بیع

نافذ ہوگئی۔ اور صدقہ کرنا اُس کی قیمت کا بہر دو صورت واجب ہوجاتا ہے جیسا کہ عبارت خلاصہ وبحر مندرجہ نمبر ۵ و نمبر ۶ سے واضح ہوچکا اور اس تفصیل کی بنا پر عبارات فقہاء اور حدیث ممانعت بیع کا ظاہری تعارض بھی رفع ہوگیا۔ کیونکہ ممانعت حدیث اُس شخص کے لئے ہے جو اپنے کھانے پینے کے لئے فروخت کرتا ہے اور جو فقراء پر صدقہ کرنے کے لئے فروخت کرے وہ اس میں داخل نہیں۔ اور جب عبارات مذکورہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ چرم قربانی فروخت کرنے کے بعد اُس کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوجاتا ہے خواہ بہ نیت صدقہ ہی فروخت کی ہو یا اپنی ہی ضرورت میں خرچ کرنے کے لئے۔ تو یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس کا مصرف صرف فقراء و مساکین وغیرہ ہیں اغنیاء نہیں۔ لما فی الخلاصۃ وفی مجموع النوازل قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لا تحل الصدقۃ لغنی ولا لغیر بنی ہاشم محمول علی الصدقۃ الواجبۃ (الی قولہ) اما اذا اطلق لفظ الصدقۃ فھی صدقۃ واجبۃ (خلاصۃ الفتاویٰ ص ۲۴۵ ج ۱) وفی رد المحتار (وھو) ای مصرف الزکوٰۃ) مصرف ایضا لصدقۃ الفطر والکفارۃ والنذر وغیر ذلک من الصدقات الواجبۃ کما فی القہستانی (شامی ص ۶۳ ج ۲)

تحریر مذکور سے یہ واضح ہوگیا کہ چرم قربانی کو اگر فروخت کر دیا جاوے تو اس کی قیمت کا صدقہ واجب ہوجاتا ہے اور مصرف اس کا صرف فقراء و مساکین ہوئے اغنیاء کو نہیں دیا جاسکتا اور اسی طرح مدرسین وغیرہ کی تنخواہوں میں بھی صرف نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ صدقہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی مسکین کو بدون کسی معاوضہ کے دیا جاوے۔ اگر تنخواہوں میں دیا گیا تو اُجرت ہوجاوے گی اور اگر غنی کو دیا گیا تو حقیقۃً ہبہ ہوگا گو لفظاً صدقہ کہا جاوے۔

ہاں گوشت و پوست جب کہ خود موجود ہوں تو ان کا خود کھانا اور استعمال کرنا یا کسی غنی کو دے دینا اس کو شریعت نے جائز رکھا ہے وُہ بھی اس حیثیت سے کہ بنص حدیث یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی مہمانی ہے اور ظاہر ہے کہ مہمان کو کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے فروخت کر دینے کی نہیں اسی مضمون کو بدائع میں بالفاظ ذیل ذکر فرمایا ہے:۔

ولانہا من ضیافۃ اللہ تعالیٰ عزشانہ التی اضاف بہا عبادہ ولیس

للضیف ان یبیع من طعام الضیافۃ شیئاً (بحر ص ۱۸۰ ج ۵)

اور بریلوی فتویٰ میں جس قدر عبارتیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے کسی ایک لفظ سے بھی ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چرم قربانی فروخت کر دینے کے بعد بھی اغنیاء کو دینا جائز ہے بلکہ ان سب عبارتوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا گوشت اور چمڑا بعینہٖ اغنیاء کو بھی دینا جائز ہے جس میں کسی کو خلاف نہیں۔

اور حدیث ابو داؤد فکلوا وادخروا و اتجروا میں اگر (اتجروا) بالتاء المشددۃ کی روایت بھی تسلیم کی جاوے تو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کی اجازت اس سے ثابت ہوگی پھر قیمت کا حکم اس میں مذکور نہیں ثانیاً و ائتجروا کے معنی بھی علامہ ابن الاثیر نے نہایہ میں صدقہ دینا بیان کئے ہیں۔ ولفظہ وحدیث الاضاحی کلوا وادخروا وائتجروا ای تصدقوا طالبین الاجر۔ نیز دوسری روایت حدیث اسی معنی کی تائید کرتی ہے جو مسلم میں بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور ہے کلوا وادخروا وتصدقوا (تخریج ہدایہ ص ۲۰۸ ج ۲) اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ابی داؤد میں صحیح روایت وائتجروا بالہمزۃ کی ہے۔

خلاصہ جواب

یہ ہے کہ چرم قربانی فروخت کرنے سے پہلے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور اغنیاء کو ہدیۃً بھی دے سکتا ہے اور فقراء و مساکین پر صدقہ بھی کر سکتا ہے لیکن اگر روپیہ پیسوں کے عوض فروخت کر دیا تو خواہ کسی نیت سے فروخت کیا ہو۔ اس کا صدقہ کر دینا واجب ہو جاتا ہے۔ اور اس کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں۔ اغنیاء کو دینا یا مؤذنین ومدرسین کی تنخواہوں میں دینا جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کتبہٗ

احقر محمد شفیع غفر لہٗ

خادم دار الافتاء دار العلوم دیوبند ۱۳۱۰ھ

اليواقيت فی
احکام المواقيت

مواقیتِ احرام اور ان کے مسائل

جس میں حج میں احرام باندھنے کا صحیح طریقہ جگہ اور وقت کے بتلانے کے علاوہ حجِ بیت اللہ سے متعلق بہت سے علمی و فقہی و تحقیقی مسائل بیان فرمائے گئے ہیں۔

مقامِ تالیف ________ کراچی

زمانۂ تالیف ________ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۰ھ

اشاعت اوّل ________ ماہنامہ البلاغ شوال

ذوالقعدہ ۱۳۸۸ھ

"اس مقالے کا اصل مقصد اس مسئلہ کی تحقیق ہے کہ ہند و پاک سے جانے والے عازمینِ حج کو کس جگہ سے احرام باندھنا چاہیے اور کیا اُن کے لئے جدّہ داخلِ میقات ہے؟ اس کے ضمن میں دوسرے متعلقہ احکام اور مسائل بھی جمع کر دیئے گئے۔"

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مواقیتِ احرام کا مسئلہ

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امّا بعد

حق تعالیٰ جل شانہ نے تمام عالم میں سے بیت اللہ کی زمین کو عزت و شرف کے لیے مخصوص فرما کر اس پر اپنا بیت بنایا جو دنیا میں سب سے زیادہ معظم و مکرم ہے۔ اس کی تعظیم و شرف کے اظہار کے لیے اس کے گرد یکے بعد دیگرے کئی حلقے قائم فرمائے اور ہر ایک حلقے کے ساتھ کچھ آداب و احکام مخصوص فرمائے۔

سب سے پہلا اور بیت اللہ سے متصل حلقہ مسجد حرام کا ہے جس کے اندر بیت اللہ واقع ہے۔ اس کے خاص آداب و احکام ہیں۔ جن میں کچھ تو وہ ہیں جن میں دنیا کی دوسری مساجد بھی شریک ہیں اور کچھ اس مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً، اس میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہوتا ہے۔ بیت اللہ کا طواف مسجد کے اندر ہوتا ہے۔ اور مسجد حرام سے باہر کوئی سات چکر لگائے، طواف ادا نہیں ہوگا (غنیۃ الناسک)۔

دوسرا حلقہ پہلے سے زیادہ وسیع شہر مکہ مکرمہ کا ہے۔ اس کے بھی خاص آداب و احکام اور پابندیاں ہیں، مثلاً یہ کہ پورا شہر مکہ بھی مسجد حرام کی طرح عام پناہ گاہ ہے۔ اس

میں کسی مجرم کو بھی جو حرم سے باہر جرم کر کے حرم میں داخل ہو گیا، وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کو مجبور کیا جائے گا کہ حرم سے نکلے، نکلنے کے بعد سزا دی جائے گی۔ اس میں کسی جانور کا شکار جائز نہیں، اس کے درختوں کا اور عام گھاس کا کاٹنا بھی جائز نہیں مگر اس کی پابندیاں پہلے حلقے یعنی مسجد حرام سے کم ہیں۔

تیسرا بڑا حلقہ حرم کا ہے جو پہلے دونوں حلقوں پر مشتمل ہے، حرم شریف کے حدود مکہ مکرمہ کے چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے سے معین و محدود ہیں۔

جدہ کی طرف سے جانے والوں کے لیے حد حرم حدیبیہ[۱] کے قریب ہے جہاں دو ستون علامت حرم کے لیے قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس تیسرے حلقے کے احترام و آداب اور شرعی پابندیاں بھی تقریباً وہی ہیں جو دوسرے حلقے کی بیان ہو چکی ہیں۔ البتہ شرف مکانی کے درجات بیت اللہ کے قرب و بعد کے اعتبار سے متفاوت ہوں گے۔

حدود حرم مکہ مکرمہ کے چاروں طرف متعین ہیں، کسی طرف کم اور کسی طرف زیادہ، سب سے زیادہ قریب حد حرم تنعیم ہے جو مکہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے اور سب سے بعید نو میل پر ہے۔

چوتھا حلقہ ان سب سے وسیع تر ہے، جس میں یہ پہلے تینوں حلقے سمائے ہوئے ہیں۔ وہ حدود مواقیت ہیں۔ مواقیت میقات کی جمع ہے۔ حرم محترم کے تمام اطراف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مقامات متعین فرما دیے ہیں، جہاں سے مکہ مکرمہ میں آنے والے پر لازم کیا گیا ہے کہ بغیر احرام کے آگے نہ بڑھے۔ احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا۔ ان مقامات میں سے ہر ایک کو میقات کہتے ہیں۔ اور پورے حلقۂ مواقیت کو فقہاء کی اصطلاح میں حل کہا جاتا ہے۔ اس حلقے سے باہر تمام کو آفاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس حل صغیر کے بھی کچھ مخصوص آداب و احکام ہیں۔ مگر پہلے تینوں

---

[۱] آج کل اس جگہ کو شمیسہ کہتے ہیں۔ مرتبہ

حلقوں سے کم ہیں۔ اس حلقے کی پابندی صرف اس قدر ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والا اس حلقے میں بغیر احرام کے داخل نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بغیر احرام کے داخل ہو جائے تو اس پر دم یعنی قربانی واجب ہو جاتی ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔
اس مقالہ میں زیر بحث یہی چوتھا حلقہ ہے۔

اس کے احکام کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے کچھ اصطلاحی الفاظ کی تشریح بیان کر دینا ضروری ہے۔

اصطلاحی الفاظ کی تشریح

پہلے حلقہ کا اصطلاحی نام مسجد حرام ہے۔ دوسرے کو مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے۔ تیسرے کا اصطلاحی نام حرم ہے۔ چوتھا حلقہ حدود حرم سے باہر مگر حدود مواقیت کے اندر ہے۔ اس کا اصطلاحی نام حل ہے۔ یعنی اس میں شکار وغیرہ حلال ہے۔ حدود مواقیت سے باہر سارا عالم آفاق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ حرم کی پابندی شکار وغیرہ کی جیسے حل میں نہیں ہے، ایسے ہی حل سے باہر آفاق میں بھی نہیں، اس لیے حل کے مفہوم میں آفاق بھی داخل ہے۔ اسی لیے بعض علماء حلقہ مواقیت کے اندر حرم سے باہر کے حل کو حل صغیر کہتے ہیں اور حدود مواقیت سے باہر آفاق کو حل کبیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مواقیتِ حج کی تعیین

صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ حدیث منقول ہے:۔

وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاھل المدینۃ ذا الحلیفۃ ولاھل الشام الجحفۃ ولاھل نجد قرن المنازل ولاھل الیمن یلملم (بخاری کتاب الحج)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ اور اہل شام کے لیے جحفہ اور اہل نجد کے لیے قرن المنازل اور اہل یمن کے لیے یلملم میقات مقرر فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار میقات مقرر فرمائے۔ ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل اور یلملم۔ ان مواقیت کی تفصیلی تحقیق آگے آجائیگی۔

اور صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں بروایت ابن عمرؓ یہ بھی منقول ہے کہ جب فاروق اعظمؓ کے زمانے میں عراق فتح ہونے کے بعد اس کے دو شہر بصرہ اور کوفہ بسائے گئے تو اہل عراق حضرت فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجد کے لیے میقات قرن المنازل کو مقرر فرمایا ہے اور وہ ہمارے راستہ سے بہت دور ہے۔ اگر ہم اس راستہ کو اختیار کریں تو ہماری مسافت اور مشقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا:۔

فانظروا حذوها من طريقكم — اپنے راستہ سے اس کی محاذات دیکھ لو۔ چنانچہ
فحد لهم ذات عرق. — (اس طریقہ سے، فاروق اعظمؓ نے ان لوگوں کے
(صحیح البخاری، کتاب الحج) — لیے ذات عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ پانچواں میقات ذات عرق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مقرر نہیں فرمایا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے اجتہاد سے مقرر فرمایا۔

لیکن صحیح مسلم کی روایت میں شک و تردد کے ساتھ اور نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں بغیر شک کے یہ بھی منقول ہے کہ اہل عراق کے لیے ذات عرق کی تعیین خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی —— یہ روایتیں قوت و صحت کے اعتبار سے اگرچہ بخاری کی روایت کے ہم پلہ نہیں ہیں مگر ان کو غیر معتبر بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اسی لیے شیخ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ کوئی بعید نہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس واقعہ سے پہلے وہ حدیث نہ پہنچی ہو جس میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذات عرق کو اہل عراق کا میقات مقرر فرمانا مذکور ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر تعیین فرمایا، اور یہ حضرت فاروق اعظمؓ کے خصوصی فضائل میں سے ہے کہ ان کا اجتہاد ٹھیک حدیث کے مطابق واقع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل عراق کا میقات ذات عرق قرار پایا. خواہ اس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمایا ہو یا حضرت فاروق اعظمؓ نے، اس لیے کل مواقیت پانچ ہو گئے. ان پانچوں مواقیت اور ان کے مقامات کی ضروری تشریح یہ ہے۔

مواقیتِ خمسہ کی ضروری تشریح

ذوالحلیفہ اہل مدینہ کا میقات ہے. مصر اور شام کے مسافر جو تبوک کے راستہ سے آتے ہیں، ان کا میقات بھی یہی ہے. یہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستہ پر مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے جس کو آبار علی یا بیر علی بھی کہا جاتا ہے اور آج کل یہی نام مشہور ہو گیا ہے (حاشیہ ارشاد الساری) اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ تک نو یا دس مرحلے ہیں (البحر الرائق)۔

اور مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات القلوب میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ایک سو اٹھانوے میل بتلایا ہے. اس مقام سے ذرا ہٹ کر ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد شجرہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہاں ایک درخت تھا، اس کے نیچے آپ نے احرام باندھا تھا، پھر اس جگہ مسجد بنا دی گئی. افضل و اولیٰ یہی ہے کہ سنت کے مطابق احرام اسی مسجد سے باندھا جائے اگرچہ یہ ذوالحلیفہ کے ابتدائی حصہ کے بعد ہے اور عام مواقیت میں افضل یہ ہوتا ہے کہ میقات کے ابتدائی حصہ پر احرام باندھا جائے تاکہ پوری میقات پر اس کا گذر بحالت احرام ہو جائے مگر ذوالحلیفہ بوجہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہاں ابتداء ذوالحلیفہ کے بجائے مسجد شجرہ سے احرام افضل ہے۔

سید نور الدین سمہودی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ میں نے مسجد نبوی سے مسجد شجرہ تک ہاتھ سے پیمائش کی تو مسجد نبوی کے دروازے باب السلام سے مسجد شجرہ تک انیس ہزار سات سو بتیس (۱۹۷۳۲) ہاتھ پایا. حاشیہ ارشاد الساری میں یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ اس لحاظ سے یہ فاصلہ پانچ میل سے کچھ کم ہوا. کیونکہ

میل ہمارے نزدیک چار ہزار ذراع کا ہوتا ہے۔ اور اس لو ہے کے ذراع سے جو آج کل مستعمل ہے۔ (حاشیہ ارشاد صفحہ ۱۴۷)

جحفہ یہ رابغ کے قریب ایک گاؤں تھا۔ جس کو مہیعہ بھی کہا جاتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے اس کے فاصلہ میں شدید اختلاف ہے۔ ارشاد الساری میں ملا علی قاری نے بتیس میل بتلایا ہے۔ اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی نے بحوالہ مسند مرشدی بیاسی میل لکھا ہے۔ اس طرح مراحل کے اعتبار سے فتح الباری شرح بخاری میں بحوالہ شرح مہذب نووی اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تین مرحلے بتایا اور شیخ عبد اللہ بن سالم نے شرح بخاری میں مکہ مکرمہ تک پانچ منزل کا فاصلہ لکھا ہے، اور مدینہ منورہ تک سات منزل (حیات القلوب قلمی صفحہ ۲۱) غالباً وجہ اس اختلاف کی یہ ہے کہ جحفہ سے مکہ مکرمہ کے لیے راستے مختلف ہیں، کسی راستہ سے مسافت کم ہے، کسی سے زیادہ، یہ گاؤں جحفہ یا مہیعہ عرصہ دراز سے ویران اور بے نشان ہو گیا ہے اس لیے اس طرف آنے والے رابغ سے احرام باندھتے ہیں۔ کیونکہ رابغ جحفہ سے کچھ پہلے ہے۔ یہاں سے احرام باندھنے والا گویا اصل میقات سے کچھ پہلے احرام باندھتا ہے جو سب کے نزدیک جائز ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے۔

اور رابغ ساحل سمندر پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے والوں کے راستہ پر مشہور قصبہ ہے اور آجکل تو اچھا شہر بن گیا ہے۔ جس میں مسافروں کے قیام کے لیے بڑے بڑے ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں۔

قرن المنازل یہ اہل نجد کا میقات ہے۔ جس میں نجد یمن نجد حجاز و نجد تہامہ شامل ہیں۔ لغت فقہ المغرب میں ہے کہ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو میدان عرفات کے اوپر ہے اور شرح مصابیح میں ہے۔ بیضہ کی مانند ایک چکنا صاف اور مدور پہاڑ ہے۔ عرفات کے اوپر آیا ہوا ہے۔ اہل مکہ اور ان کے اطراف کے لوگ اس پہاڑ کو کرا بفتح الکاف کہتے ہیں اور قاموس میں ہے کہ قرن اس پہاڑ کا نام بھی ہے اور اس کے متصل وادی کو بھی قرن کہتے ہیں اور اس وادی کے اندر ایک گاؤں جو طائف

کے قریب ہے اس کو بھی قرن کہا جاتا ہے (حاشیہ ارشاد الساری ۲۶۵)

البحر الرائق میں ہے کہ قرن کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے اور حیات القلوب میں مخدوم ہاشم سندھی نے بھی بحوالہ نہایہ شرح ہدایہ دو مرحلہ کا فاصلہ اور باقانی شرح ملتقی الابحر کے حوالہ سے بچاس میل کا فاصلہ بتلایا ہے (حیات القلوب قلمی صـ۲۱)

یلملم: اہل یمن تہامہ کا میقات ہے۔ مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے، اس زمانہ میں اس کو سعدیہ کہا جاتا ہے، علامہ عینی اور حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے (حیات القلوب)، علامہ عینی نے لکھا ہے:

قال ابن حزم هو جنوب مكة و منه الى مكة ثلاثون ميلا۔	ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ مکہ مکرمہ کے جنوب میں ہے اور اس سے مکہ مکرمہ تک تیس میل کا فاصلہ ہے۔ (عمدہ صـ۱۴۰ ج ۵)

اور شیخ عبدالرحمٰن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام نور الظلام صـ۳۶ ج ۱ میں اس کا فاصلہ چالیس میل بتلایا ہے، اور قسطلانی شرح بخاری، فتح القدیر شرح ہدایہ، اور معجم البلدان وغیرہ میں میلوں کا فاصلہ بتلانے کے بجائے مرحلتین یا لیلتین کہا گیا ہے۔

ذات عرق: اہل عراق کا میقات ہے، ایک گاؤں کا نام ہے جو عراق کی طرف سے عقیق کے بعد مکہ مکرمہ سے دو منزل کے فاصلہ پر تھا۔ آج کل ویران ہو گیا ہے اسی لیے اب اس کے بجائے عقیق سے احرام باندھا جاتا ہے کیونکہ ذات عرق کا صحیح تعین نہ رہا۔ عقیق سے احرام باندھنے میں اصل میقات سے کچھ پہلے احرام ہوگا۔ اسی میں احتیاط ہے۔

علامہ عابد مالکیؒ نے ہدایۃ الناسک میں فرمایا کہ ذات عرق مکہ مکرمہ سے دو مرحلے کے فاصلہ پر طائف کے راستہ پر ایک گاؤں تھا جو اب ویران ہو گیا ہے۔ اس کا

محل وقوع اس مقام کے قریب تھا جس کو آجکل سَیل کہا جاتا ہے (حاشیہ ارشاد الساری ص۵۵) قسطلانی نے شرح بخاری میں اس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے بیالیس[۴۲] میل بتلایا ہے۔ اسی طرح فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس[۴۲] میل کا فاصلہ لکھا ہے نووی" ابن حجر مکی نے فرمایا کہ اس کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ کا ہے جیساکہ قرن اور یلملم کا فاصلہ دو مرحلے ہیں (حیات القلوب) ومثلہ فی البحر۔

مواقیتِ خمسہ کے احکام

جو لوگ آفاق یعنی اطراف عالم سے آنے والے ان میقاتوں کے راستے سے گذرتے ہیں، اگر وہ مکہ مکرمہ میں جانے کے مقصد سے ان مواقیت سے آگے۔ حلّ صغیر کی طرف جائیں جو مواقیت کے اندر اور حرم سے باہر کے علاقے کا نام ہے تو ان پر لازم ہے کہ ان مقامات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر آگے بڑھیں۔ بغیر احرام کے آگے بڑھنا گناہ ہے اور جو ایسا کرے گا اس کے ذمہ دم (قربانی) دینا واجب ہوگا (ہدایہ۔ ارشاد الساری)

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک آفاق یعنی حلّ کبیر سے آنے والا جو شخص مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا ارادہ کرے خواہ یہ ارادہ کسی دنیوی غرض تجارت یا عزیزوں سے ملاقات وغیرہ کی نیت سے کیا ہو۔ مگر بیت اللہ کی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو، میقات سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر داخل ہو اور بیت اللہ کا یہ حق ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص میقات سے آگے مکہ کی طرف بغیر احرام کے نہ بڑھے (ہدایہ)

امام شافعیؒ کے نزدیک یہ پابندی صرف اس شخص کے لیے ہے جو عبادت حج یا عمرہ کے قصد سے مکہ مکرمہ کا ارادہ کر رہا ہے کسی تجارتی غرض یا عزیزوں سے ملاقات یا تفریحی طور سے جانے والے پر احرام باندھ کر جانے اور کم از کم عمرہ ادا کرنے کی پابندی نہیں ہے۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ)

یہ حکم تو ان لوگوں کے لیے ہے جو آفاق کے کسی علاقے سے آئیں، مگر کسی میقات کے راستہ سے مکہ مکرمہ جانے کے لیے حل صغیر میں داخل ہوتے ہیں، اب یہ دیکھنا ہے کہ جو لوگ پانچ میقاتوں میں سے کسی میقات پر نہیں گزرتے دوسرے راستوں سے حل صغیر پھر حرم میں داخل ہوتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے، کیا وہ اس پابندی ہی سے آزاد ہیں اور بغیر احرام کے حرم میں داخل ہو سکتے ہیں اور اگر ان پر بھی یہ پابندی ہے تو ان کو کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا۔ ملا علی قاری نے اپنے شرح مناسک میں اس کے متعلق فرمایا ہے:۔

وعين هذه المواقيت ليست بشرط ولهذا يصح الاحرام قبلها بل الواجب عينها أو حذوها اى محاذاتها و مقابلتها فمن سلك غير ميقات اى طريقا ليس فيه ميقات معين برًا أو بحرًا اجتهد وأحرم اذا حاذى ميقاتا منها اى من المواقيت المعروفة ومن حذو الابعد اولى فان الافضل ان يحرم من اول الميقات وهو الطرف الأبعد عن مكة حتى لا يمر بشئ مما يقال ميقاتا غير محرم ولو احرم من الطرف الاقرب إلى مكة جاز باتفاق الاربعة. وإن لم يعلم المحاذاة فانه لا يتصور عدم المحاذات. فعلى مرحلتين من مكة كجدة المحروسة من طرف البحر (ارشاد الساری ص۵۶)

وقال فی حاشیته قوله كجدة فانها على مرحلتين عرفيتين من مكة وثلاث مراحل شرعية ووجهه ان المرحلتين اوسط المسافات والاولى لاحتياط الزيادة كذا فى شرح نظم الكنز واقول لعل وجهه ايضا ان اقرب المواقيت الى مكة على مرحلتين عرفيتين من مكة فقدر بذلك (ارشاد ساری ص۵۶).

یہی مضمون دوسری تمام کتب فقہ میں مختصراً یا مفصلاً مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی میقات معین کے اوپر سے نہیں گزرتے بلکہ درمیانی راستوں میں سے کسی راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آتے ہیں، احرام کی پابندی ان پر بھی لازم ہے اور طریقہ ان کے لیے یہ ہے کہ وہ جس راستہ سے حِلّ صغیر کے اندر داخل ہو رہے ہیں، اس راستہ کا جو حصہ کسی میقات کی محاذات میں ہو، اسی جگہ سے احرام باندھ لیں۔[1] اگر راستہ ایسا ہے کہ ایک سے زائد میقاتوں کی محاذات راستہ میں آتی ہے، تو افضل یہ ہے کہ میقات ابعد کی محاذات سے احرام باندھیں اور اگر اس سے آگے بڑھ کر قریبی میقات کی محاذات سے احرام باندھ لیا تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اصل بنیاد اس حکم کی صحیح بخاری کی وہ حدیث مذکورہ ہے جس میں اہل عراق نے یہی سوال حضرت فاروق اعظمؓ کے سامنے پیش کیا اور آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:۔

انظروا حذوها من طريقكم ثم حدّ لهم ذات عرق (بخاری)	اپنے راستہ سے ان کی محاذات دیکھو پھر فاروق اعظمؓ نے (اس طریقے سے) ان کے لیے ذاتِ عرق کو میقات مقرر فرمایا۔

اس میں حضرت فاروق اعظمؓ نے دوسرے راستوں سے گزرنے والوں کے لیے ایک ضابطہ بنا دیا کہ ان کا راستہ جو حل صغیر میں داخل ہونے کا ہے، اس راستہ پر جہاں کسی میقات کی محاذات آجائے وہی ان لوگوں کے لیے میقات کے حکم میں ہے۔ یہاں سے مکہ کی طرف آگے بڑھنا بغیر احرام کے جائز نہیں۔

پھر اس ضابطہ کی رو سے اہل عراق کے لیے ان کے راستہ کے اس حصہ کو میقات قرار دیدیا جو قرن المنازل کے محاذات میں ہے۔ یعنی ذاتِ عرق۔

محاذات میقات کس طرح معلوم کی جائے؟

محاذات کے لغوی معنی مسامتت کے ہیں۔ جس کی تشریح شیخ ابن حجر ہیثمی مکی نے

[1] خط کشیدہ عبارت کا مفہوم کلام فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ میں نہیں ملتا۔

تحفۃ المحتاج شرح منہاج میں بالفاظ ذیل کی ہے:۔

(ومن سلك طريقاً لا ينتهي الى ميقات فان حاذى) بالمعجمة (ميقاتا) اى سامته بان كان على يمينه او يساره ولا عبرة بامامه او خلفه (احرم من محاذاته)	محاذت کا مطلب یہ ہے کہ میقات اس کے دائیں یا بائیں آ جائے۔ سامنے اور پیچھے ہونے کا کوئی اعتبار نہیں۔

(تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیہ صا۴۱ ج۴)

* * * *

مطلب ظاہر ہے کہ محاذات سے مراد یہ ہے کہ میقات مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے مسافر کی دائیں یا بائیں جانب آجائے اور جب تک میقات اس کے آگے رہے تو محاذات نہیں ہوئی اور جب اس کے پیچھے پڑ جائے تو محاذات سے تجاوز ہو گیا۔ مسائل نماز میں بھی محاذات کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ اس کتاب میں اس کے بعد فرمایا ہے:۔

(لم تجز مجاوزته) الى جهة الحرم (بغير احرام) وخرج بقولنا الى جهة الحرم مالو جاوزه يمنة او يسرة فله ان يؤخر احرامه لكن بشرط ان يحرم من محل مسافته الى مكة مثل مسافة ذلك الميقات كما قاله الماوردى وجزم به غيره وبه يعلم ان الجائى من اليمن فى البحر له ان يؤخر احرامه الى جدة لان مسافتها الى مكة كمسافة يلملم انتهى۔

عبارت مرقومہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مسافر جب راستہ میں کسی میقات کی محاذات پر پہنچا، مگر اس کو کسی وجہ سے اس میقات کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانا نہیں ہے، بلکہ اس کا راستہ کسی دوسری سمت سے ہے تو اس کے لیے اس محاذات پر احرام باندھنا واجب نہیں ہے، بلکہ جس راستہ سے اس کو مکہ مکرمہ کی

طرف جانا ہے۔ اس راستہ پر محاذات کو دیکھا جائے گا۔ کیونکہ محاذات میقات سے بغیر احرام تجاوز کرنا جو شرعاً ممنوع ہے۔ اس تجاوز سے مراد تجاوز الی جہۃ الحرم ہے دوسری کسی سمت میں تجاوز ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جیسا کہ تحفہ کی عبارت مذکورہ سے واضح ہوگیا۔

اور غنیۃ الناسک میں مواقیت کی تعریف ہی اس طرح کی ہے۔

هی المواضع التی لا یجوز ان یتجاوزها الی مکة والحرم ولو لحاجة الا محرماً۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بلا احرام تجاوز ممنوع وہ ہے جو تجاوز الی الحرم ہو دوسری کسی جہت کی طرف تجاوز ممنوع نہیں۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اس دوسری محاذات میں یہ ضروری ہے۔ کہ اس محاذات سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ کم سے کم اتنا ہی ہو جتنا اصل میقات سے فاصلہ ہے مثلاً کوئی شخص یلملم کی محاذات سے جدہ کی طرف بڑھا اور جدہ کے راستہ سے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کا قصد کیا تو اس کو احرام اس جگہ سے باندھنا چاہیے جہاں سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ یلملم کے فاصلہ کی برابر ہو۔ اور حسبِ تصریح فقہاء یلملم کا فاصلہ بھی مکہ مکرمہ سے مرحلتین کا ہے اور جدہ کا فاصلہ بھی مرحلتین ہے تو دونوں فاصلے مساوی ہونے کی وجہ سے جدہ سے احرام باندھنا جائز ہوگا۔

محاذات کی یہ تفسیر لغوی معنی کے لحاظ سے بھی اقرب ہے اور فقہاء کی تفسیر سے بھی اسی کی ترجیح ہوتی ہے۔ صاحب بدائع کی ایک عبارت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے:۔

فاما اذا قصدها من طریق غیر مسلوک فانه یحرم اذا بلغ موضعاً یحاذی میقاتاً من هذه المواقیت لانه اذا حاذی ذلک الموضع میقاتاً من المواقیت صار فی حکم الذی یحاذیه فی القرب من مکة۔ (بدائع صـ۱۶۴ ج ۲)

محاذات کی ایک دوسری تفسیر

علامہ داملا اخوند جان مرغینانی مہاجر مکیؒ نے مواقیت حج کی تحقیق میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کی تاریخ تصنیف ١٣١٣ھ ہے اور ١٣٢٣ھ میں تاشقند کے ایک پریس میں چھپا ہے۔ یہ رسالہ حضرت حاجی شیر محمد صاحب سندھیؒ مہاجر مدنی نے احقر کو عطا فرمایا تھا۔ جو احقر کے پاس موجود ہے۔ اس رسالہ میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح حدود حرم کے ذریعہ تمام حلقہ حرم کی تعیین کی جاتی ہے۔ کہ حد حرم سے دوسری حد تک ایک خط ملایا جائے، اسی طرح تیسری چوتھی حدود کے باہم خطوط ملا کر ان خطوط کے درمیان جو رقبۂ زمین آتا ہے۔ وہ حرم کہلاتا ہے۔

اسی طرح مواقیت کے حلقے کو سمجھنا چاہیے۔ ایک میقات سے دوسرے میقات تک خط ملا کر یہ خط محاذات ہوگا۔ خط سے باہر آفاق اور خط کے اندر حل کہا جائے گا اس خط محاذات سے بغیر احرام کے مکہ مکرمہ کی طرف تجاوز کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس کی شکل بھی رسالہ کے حاشیہ پر ایک مخمس کی صورت میں یہ دی ہے۔
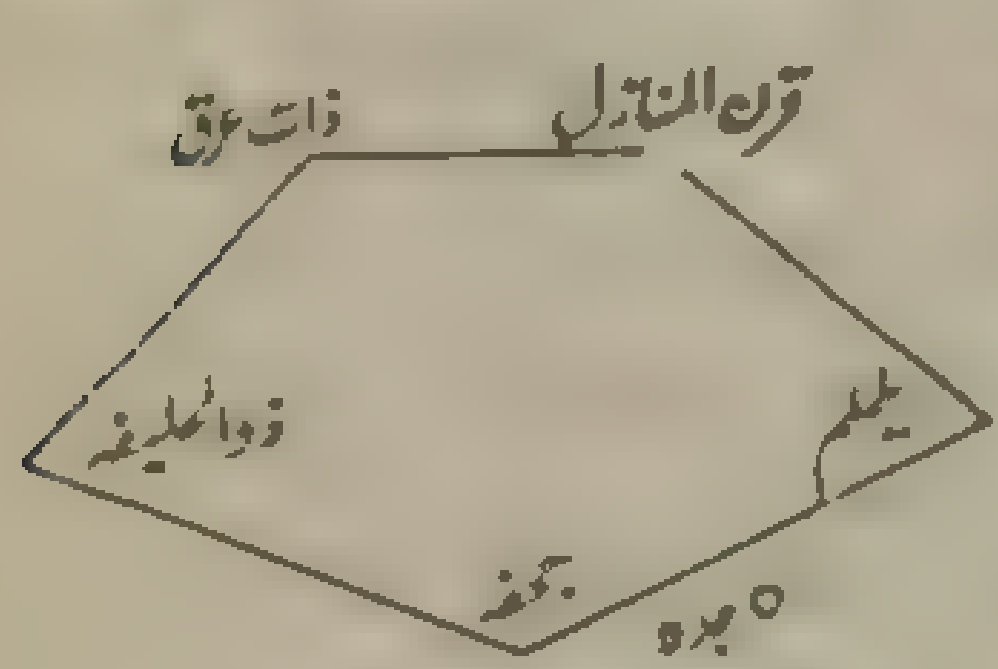
ذات عرق
قرن المنازل
ذوالحلیفہ
یلملم
جحفہ
جدہ

اس تفسیر محاذات کے مطابق یلملم سے جو خط جحفہ کے ساتھ ملایا جائے گا تو جدہ اس خط سے باہر کافی فاصلہ پر رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شہر جدہ سے بھی آگے بحرہ کے قریب تک بلا احرام جا سکیں۔ محاذات کی یہ تفسیر اگرچہ قواعد محاذات کی رو سے تو معقول ہے مگر فقہاء کے کلام میں اس کی تائید نہیں ملتی، بلکہ اس کے خلاف یہ تصریحات اوپر گذر چکی ہیں کہ اہل یمن و بلاد مشرق کے باشندے جو جدہ کی طرف سے داخل حل ہوں تو ان پر یہ پابندی لازم ہے کہ جس قدر مسافت یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے اسی قدر مسافت اس طرف سے بھی ہونی چاہیے۔ مثلاً وہ مرحلتین ہے تو اس جانب بھی مرحلتین کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے ضروری ہے اور وہ جدہ پر ہی ہو سکتا ہے۔ جدہ سے آگے نہیں۔

والا اخوند جان کی عبارت اس کے متعلق یہ ہے :۔

ظاہر ان المسجد مشتمل علی البیت وحاولہ من کل جہۃ ومکۃ مشتمل بھما والحرم مشتمل بالثلاثۃ ممتد من کل جہۃ الی الحِلّ الصغیر المحیط بالحرم ولاشک ان الحرم غیر مختص بالعلامات الموضوعۃ فی الطریق بل ھو السطح الممتد من کل جہۃ قربًا و بعدًا ولایتوھم احد ان الحرم المکانات المتصلۃ بالعلامات فقط وکل عاقل یفھم ان الاماکن بین العلامات من ارض الحرم مثلاً العلامۃ عند التنعیم الی العلامۃ عند حدیبیۃ کلھا حرم لایقتل صیدہ ولایقطع شجرہ۔

ثم الحل الصغیر یبتدء من اطراف الحرم من کل جہۃ الی المواقیت کانھا مخمسۃ الشکل والحل الصغیر بین الحرم والحل الکبیر الذی ھو جمیع الآفاق والمواقیت بعض اجزاء الحل ولھذا یجوز لاھلھا تاخیر الاحرام الی قریب حد الحرم کما یجوز لاھل الحل الصغیر (الی قولہ) فتحصل من ذلک ان حرم الحرم ای المواقیت مثل الحرم المحیط بما فی جوفہ مثل الخطوط الممتدۃ بین النقاط فکما ان النقاط مواقیت فکذلک الخطوط بینھا والاجاز الدخول الی الحرم بلا احرام من بین المواقیت

(رسالہ اخوند جان ص۱۲۳ طبع تاشقند)

پاکستان، ہندوستان اور مشرقی ممالک سے آنے والوں کا میقات!

آج کل ان ممالک مشرقیہ سے آنے والے حجاج کے لیے راستے دو ہیں۔ ایک ہوائی دوسرا بحری۔ ہوائی جہازوں کا راستہ عمومًا

خشکی کے اوپر سے براہ قرن المنازل ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز قرن منازل اور ذات عرق، دونوں میقاتوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے اول حل میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اور پھر جدہ پہنچتے ہیں۔ اس لیے ہوائی سفر میں تو قرن المنازل کے اوپر آنے سے پہلے پہلے احرام باندھنا لازم و واجب ہے۔ اور چونکہ ہوائی جہازوں میں اس کا پتہ چلنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس وقت اور کب یہ جہاز قرن المنازل کے اوپر سے گزرے گا اس لیے اہل پاکستان اور ہندوستان کے لیے تو احتیاط اسی میں ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔ اگر بغیر احرام باندھے ہوئے ہوائی جہاز کے ذریعہ جدہ پہنچ گئے تو ان کے ذمہ دم یعنی قربانی ایک بکرے کی واجب ہوجائے گی اور گناہ اس کے علاوہ ہوگا، جس کی وجہ سے حج ناقص رہ جاتا ہے، مقبول نہیں ہوتا۔ بہت سے حجاج اس میں غفلت کرتے ہیں۔

چین، انڈونیشیا، جاوا وغیرہ کے ہوائی جہاز بھی اگر خشکی پر پرواز کریں تو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ ہاں اگر ان کے جہاز خشکی کے بجائے سمندر کے اوپر سے پرواز کر کے جدہ پہنچیں تو ان کا حکم وہ ہوگا، جو بحری جہاز سے آنے والوں کا ابھی لکھا جائے گا۔

مشرقی ممالک کے لیے دوسرا راستہ بحری سفر کا ہے۔ اس راستہ سے جانے والے بحری جہاز قدیم زمانے میں تو یلملم کے ساحل پر اترتے تھے جو یمن کا ایک حصہ ہے اور اہل یمن کی طرح وہ بھی میقات یلملم سے گزر کر حل میں پھر حرم اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے، اسی لیے عام فقہاء کی تصریحات بھی ہیں کہ ہندوستان، پاکستان اور تمام بلاد مشرق کا میقات یلملم ہے لیکن مدت دراز سے یہ ساحل متروک ہوگیا۔ اب بحری جہاز یہاں نہیں ٹھہرتے۔ بلکہ ساحل یلملم سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر محاذات یلملم سے گزرتے ہوئے سمندر ہی میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور ساحل جدہ پر قیام کرتے ہیں۔ جدہ ہی سے سب مسافر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں

اس صورت میں یہ تو ظاہر ہے کہ ان ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والے مسافروں کے راستے میں عین میقات تو کوئی پڑتا نہیں البتہ محاذات میقات یلملم سے

دوجگہ ہوتی ہے۔ ایک درمیان سفر یلملم کے مقابل سے گزرتے ہوئے، دوسرے سفر کے اختتام پر جدہ میں، سابقہ تحریر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کسی میقات، یا اس کی محاذات سے بلا احرام تجاوز کرنا جو ممنوع و ناجائز اور موجب دم ہے، وہ اس وقت ہے جبکہ یہ ان کا تجاوز الی جہۃ الحرم ہو اور اگر اس محاذات سے سمندر ہی میں آگے بڑھتا ہوا آفاق ہی کے اندر سفر کرے تو یہ تجاوز عن المیقات اور موجب دم نہیں ہوگا۔ جیسا کہ تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے اس کی تصریح پہلے آچکی ہے جس کے بعض الفاظ یہ ہیں:-

وخرج بقولنا الی جهة الحرم مالو جاوزه يمنة او يسرة فله ان يؤخر احرامه لكن بشرط ان يحرم من محل مسافته الى مكة مثل مسافة ذلك الميقات، كما قاله الماوردي وجزم به غيره و به يعلم ان الجائي من اليمن في البحر له ان يؤخر احرامه من محاذاة يلملم الى جدة لان مسافتها الى مكة كمسافة يلملم كما صرحوا به (تحفہ علی ہامش الحواشی الشروانیہ ص۴۵ ج ۴)

اس کا حاصل یہ ہے کہ مشرقی ممالک سے بحری جہازوں پر آنے والوں کے لیے محاذات یلملم پر احرام باندھنا واجب نہیں۔ ہاں کوئی یہیں پر احرام باندھے تو افضل ہونے میں شبہ نہیں۔ کیونکہ میقات سے جتنا پہلے کوئی احرام باندھے اتنا ہی ثواب زیادہ ہے۔

اب قابل غور سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب ان لوگوں پر محاذات یلملم سے احرام باندھنا واجب نہ ہوا تو پھر کس جگہ سے احرام باندھنا واجب ہوگا۔ جہاں سے تجاوز بلا احرام جائز نہیں۔

جدہ سے احرام باندھنے کا مسئلہ یہ بات اوپر واضح ہو چکی ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ خشکی کے اوپر سے جدہ پہنچنے کے

لیے میقات قرن لمنازل در میقات ذات عرق کے اوپر سے گزرنا ہوتا ہے اس لیے ہوائی جہاز کے مسافروں کو بلا احرام جانا جائز نہیں۔ پاکستان، ہندوستان والوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہی احرام باندھ لیں۔

البتہ غور طلب مسئلہ بحری جہازوں کا اور ان کے مسافروں کا ہے کہ جب میقات یلملم کی محاذات سے احرام واجب نہ ہو تو اب کہاں واجب ہوگا۔

داملا اخوندجان کی تحریر کے مطابق تو یہ مقام جدہ شہر سے کچھ آگے چل کر آئے گا مگر فقہاء کی تصریحات اس سے مختلف ہیں۔ عام فقہاء کے نزدیک جدہ کی طرف سے جانے والے مشرقی مسافروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس مقام پر احرام باندھیں جس کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے اس فاصلہ سے کم نہ ہو جو یلملم اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے اب یہ مقام کونسا ہوگا۔ اس کے متعلق علامہ ابن حجر مکی کی کتاب تحفہ شرح منہاج کے حوالہ سے یہ تصریح الجی گذر چکی ہے کہ یہ مقام جدہ ہے۔ کیونکہ مسافت جدہ کی مکہ مکرمہ سے اتنی ہی ہے جتنی یلملم کی مکہ مکرمہ سے ہے۔

له ان یؤخر احرامه من محاذات یلملم الی جدة لان

مسافتها الی مکة کمسافة یلملم۔

علامہ ابن حجر مکی کی تصریحات بالا سے تو یہ معلوم ہوا کہ حقیقی محاذات اس طرف سے معلوم کرنے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ مسافت مرحلتین کا اعتبار کیا جائے جس طرح یلملم سے مکہ مکرمہ دو مرحلے پر ہے اسی طرح جدہ سے دو مرحلہ ہے۔ اس لیے مسافت برابر ہونے کی وجہ سے جدہ ہی محاذات یلملم قرار دیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ میں حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کسی قدر فرق کے ساتھ اس کی موافقت فرمائی وہ یہ کہ اگر حقیقی محاذات کا علم نہ ہو تو پھر دو مرحلے کی مسافت کا اعتبار کر کے جدہ ہی کو بحکم میقات سمجھا جائے گا۔ ان کے الفاظ مناسک ملا علی قاری میں یہ ہیں:-

وان لم یعلم المحاذاة فعلی مرحلتین من مکة

كجدة المحروسة من طرف البحر (ارشاد ساری ص۵۲)

اسی طرح غنیۃ الناسک میں بحوالۂ طوالع لکھا ہے:۔

وان لم یعلم المحاذاة فعلی مرحلتین عرفیتین من
مکة کجدة من طرف البحر، ذ نفا علی مرحلتین عرفیتین من
مکة وثلث مراحل شرعیة طوالع (غنیۃ الناسک ص۲۲)

اسی طرح فقیہ العصر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اب سے پچاس سال پہلے ۱۳۲۹ھ میں یہی فتویٰ دیا تھا کہ تحقیق محاذات معلوم نہ ہونے کے سبب جدہ ہی کو میقات قرار دیا جائے گا۔

امداد الفتاویٰ تتمہ خامسہ طبع قدیم کے ص۱۴۱ پر اور طبع جدید کی جلد دوم ص۲۲ میں ان کا یہ ارشاد بالفاظ ذیل منقول ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے عرض کیا کہ مدینہ کا راستہ بند ہونے کی صورت میں حج کا احرام کہاں سے باندھے گا تو اس کے جواب میں فرمایا کہ حج بدل کا احرام جدہ سے ہوگا۔
مناسک ملاعلی قاری میں عبارت موجود ہے۔ وان لم یعلم المحاذاة فعلی مرحلتین من مکة کجدة المحروسة من طرف البحر۔ اور یہ ظاہر ہے۔ اہل ہند کے لیے یلملم کی محاذات کسی معتبر طریقے سے نہیں ہوتی۔ لہٰذا جدہ ان کے لیے میقات ہے۔

۱۰ شعبان ۱۳۲۹ھ۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی دامت برکاتہم جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، ان سے زبانی بھی اس کی تصدیق ہوئی، کہ حضرت مولانا موصوف اہل ہند کے لیے بحری جہاز سے آنے کی صورت میں جدہ ہی کو ان کا میقات قرار دیتے تھے۔ یہ تمام اقوال سابقہ اس پر تو متفق ہیں، کہ مکہ مکرمہ کی مسافت یلملم اور جدہ سے مساوی یعنی مرحلتین ہے۔ علامہ ابن حجر مکی اس

مرحلتین کو عین محاذات قرار دے کر جدہ سے احرام کو جائز لکھتے ہیں اور ملا علی قاری اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اس بنا پر جدہ کو قائم مقام محاذات کا قرار دیتے ہیں کہ اصل محاذات کا علم نہیں، اس لیے مسافت کا اعتبار کر کے مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ پہلے احرام باندھنا واجب ہے اور جدہ چونکہ دو مرحلہ کی مسافت پر ہے۔ اس لیے جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہو گیا۔

ان تمام عبارات مرقومہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرات فقہاء نے اس مسافت کی تعیین میں میلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا بلکہ مراحل کا اعتبار کیا ہے۔۔ اور مراحل کی مسافت میلوں کے اعتبار سے کم و بیش ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ فتح الباری و عمدۃ القاری میں بحوالہ ابن حزم یلملم کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس میل لکھا ہے اور بعض علماء نے چالیس میل بھی فرمایا ہے اور آج کل کے پیمائش کرنے والوں نے باون تک بتلایا ہے۔ پھر اسی کو سب نے مرحلتین بھی فرمایا ہے اور قرن المنازل کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے مخدوم ہاشم سندھیؒ نے حیات القلوب میں بحوالہ باقانی شرح ملتقی الابحر پچاس میل بتلایا ہے۔ اور اس کو بھی تمام فقہاء نے مرحلتین ہی فرمایا ہے کما فی البحر الرائق۔

اسی طرح ذات عرق کو بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ پر لکھا ہے۔ ارشاد الساری ص۵۵ والنووی شرح مسلم، تحفہ ابن حجر مکی۔ اور میلوں میں اس کا فاصلہ قسطلانی اور فتح الباری شرح بخاری میں بیالیس میل بتلایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ میلوں کے اعتبار سے فاصلوں کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ تیس میل کو بھی دو مرحلے قرار دیا۔ پچاس میل کو بھی۔ بیالیس میل کو بھی اور اعتبار مراحل کا کر کے ان کی مسافتوں کو مکہ مکرمہ سے مساوی قرار دیا گیا ہے۔

جدہ کو میقات اہل یمن و اہل مشرق قرار دینا اسی اصول پر مبنی ہے۔ کہ مسافت مرحلتین پر ہے۔ اب میلوں کے اعتبار سے کتنا ہے۔ اس کی تحقیق ضروری نہیں رہی۔ آجکل کی پیمائش کے اعتبار سے جدہ کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تقریباً چھیالیس میل ہے۔

میقات یلملم کے فاصلہ میں اختلاف کی وجہ

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ فقہاء کے نزدیک اس جگہ مسافت میں مراحل کا اعتبار ہے۔ میلوں کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم میلوں کا فاصلہ بھی اکثر فقہاء و علماء لکھتے چلے آئے ہیں۔ شرح بخاری، عمدۃ القاری، فتح الباری وغیرہ میں تو بحوالہ ابن حزم یہ فاصلہ تیس میل بتلایا ہے اور شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن نجدی نے اپنی کتاب مفید الانام و نور الظلام ص۵۵ ج۱ میں یہ فاصلہ چالیس میل لکھا ہے۔ اور آجکل بعض اہل فن نے یہ فاصلہ باون میل کا بتلایا ہے۔ اس اختلاف کا اصل منشاء موجود ہے جو تحفہ شرح منہاج کے حاشیہ میں شیخ عبدالحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے بتلایا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:-

وقد علمت ان یلملم جبل محاذ للسعدیۃ وسمعت ان بحذاء السعدیۃ جبلین احدھما بین طرفیھا المحاذی لمکۃ بینہ و بین مکۃ اکثر من مرحلتین والثانی ممتد لجھۃ مکۃ بینہ و بین مکۃ باعتبار طرفہ الذی بجھتھا مرحلتان فاقل۔ (حواشی شروانیہ ص۴۲ ج۴)

اس سے معلوم ہوا کہ یلملم اس پہاڑ کو کہا جاتا ہے جو سعدیہ کے محاذ میں واقع ہے اور وہ دو پہاڑ ہیں، ایک کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے میلوں کے اعتبار سے دو مرحلے سے زیادہ ہے۔ دوسرے کا فاصلہ دو مرحلے سے بھی کم معلوم ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اس دوسرے فاصلہ کا اعتبار کر کے تیس میل بتایا ہے اور جنھوں نے پہلے فاصلہ کو لیا انھوں نے چالیس پچاس میل تک کا فاصلہ قرار دیا۔

میقات جدّہ کے متعلق علماء کا اختلاف

تحفہ شرح منہاج ابن حجر مکیؒ کے حوالہ سے جو بات اوپر لکھی گئی ہے کہ جدہ کی مسافت بھی یلملم کی مسافت کے مساوی ہے۔ اس لیے جدہ سے احرام باندھنا صحیح ہے، اس کتاب کے حاشیہ میں شیخ عبدالحمید شروانی نزیل مکہ مکرمہ نے اس وقت کے

علماء کا اختلاف بھی نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ علامہ شبلی مفتی مکہ اور فقیہ احمد بلجاج اور ابن زیاد یمنی وغیرہ علماء نے اسی پر فتویٰ دیا ہے جو تحفہ میں لکھا ہے۔ یعنی جدہ سے احرام باندھنے کو درست و جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل یمن کے بعض علماء عبداللہ بن عمر بالحزم، محمد بن ابی بکر اشخر، شیخ عبدالرؤف کا اختلاف بھی نقل کیا ہے۔ ان حضرات کا قول یہ ہے کہ جدہ کی مسافت مکہ مکرمہ تک بہ نسبت مسافت یلملم کے کم ہے، اس لیے حجاج کو چاہیے کہ ساحل جدہ میں اترنے سے پہلے جس جگہ سے جہاز ساحل جدہ اور حرم کی طرف رخ موڑتا ہے وہاں سے احرام باندھ لیں۔ ساحل جدہ تک مؤخر نہ کریں۔ ان کے الفاظ بحوالہ وفائی یہ ہیں:۔

عبارۃ الوفائی فله ان یؤخر احرامه من محاذاۃ یلملم الی رأس العَلَم المعروف قبل مرسی جدۃ وھو حال توجه السفینة الی جھة الحرم ولیس له ان یؤخر الی جدۃ لانھا اقرب من یلملم بنحو الربع وقولھم ان جدۃ و یلملم مرحلتان مرادھم ان کلا لا ینقص عن مرحلتین وان تفاوتت المسافتان کما حققه من سلك الطریق الخ (ص۴۵ ج ۴)

علماء عصر کی مجلس میں اس مسئلہ پر بحث

دارالعلوم کراچی، مدرسہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی، مدرسہ اشرف المدارس کراچی کے اہل علم و فتویٰ نے عرصہ سے ایک مجلس کی تشکیل کی ہوئی ہے جس کی غرض ایسے ہی جدید و قدیم مسائل پر بحث کر کے کوئی جہت متعین کرنا ہے۔ جس کا کوئی صریح حکم قرآن و سنت اور ائمہ فقہاء کے کلام میں موجود نہیں اور علماء عصر کی رائیں ان میں مختلف ہیں، اب تک اس مجلس میں بہت سے اہم مسائل پر بحث ہو کر متفقہ رائے سے احکام مع تفصیل دلائل لکھ دیے گئے جو مستقل رسالوں کی صورت میں ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

یہ مسئلہ بھی مجلس میں زیر بحث آیا۔ اور متعدد مجالس میں بحث وتمحیص کے باوجود سب کا اتفاق کسی جانب نہیں ہو سکا۔ کچھ رائیں مختلف رہیں۔ چونکہ ایسا اختلاف کوئی نئی چیز نہیں، ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر آج کل اس طرح کے اختلاف کو عموماً ایک افتراق بنا لیا جاتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں جن حضرات نے اختلاف کیا ہے ان کی رائے مع ان کے دلائل کے لکھ دی جائے۔ تاکہ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ علماء کا اختلاف کس طرح ہوا کرتا ہے اور اختلاف علماء کے وقت عوام کے لیے طریقۂ کار کیا ہے۔

حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی رائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ رسالہ الیواقیت فی احکام المواقیت مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم وزیدت حسناتہم کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا اور کچھ حصہ حضرت مصنف سے زبانی سنا اور بحری حجاج مسافروں کے لیے جدہ سے جواز احرام کا مسئلہ ہماری مجلس فقہی کی متعدد مجالس میں زیر بحث آیا اور کافی غور و خوض ہوا۔ اور تحفۃ المحتاج شرح المنہاج کی عبارت اور مخدوم ہاشم سندھی وغیرہ کی عبارات و آراء پر بھی غور ہوا اور بہت عرصہ پہلے انفرادی طور بھی بار ہا غور کیا۔ کبھی انشراح صدر نہیں ہوا کہ جدہ سے احرام کی جواز کی صورت درست ہو سکتی ہے، جو کچھ فہم قاصر میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سرزمین حرم یا مکہ معظمہ میں آنے والوں کے لیے دنیا کے کسی گوشے سے آئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود مقرر فرما دی ہیں۔ بلا احرام ان سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔ بیت اللہ الحرام کے شمال سے آنے والوں کے لیے ذی الحلیفہ ہے، مغرب سے آنے والوں کے لیے جحفہ ہے (جدید نام رابغ) جنوب سے آنے والوں کے لیے یمن کی سرزمین جبل یلملم ہے (جدید نام جبل سعدیہ) جنوب مشرق سے آنے والوں کے لیے قرن المنازل ہے اور شمال مشرق سے آنے والوں کے لیے ذات عرق ہے۔

(جدید نام مقام عتیق)۔ اب یا تو انہی مقامات پر گزر ہو گا تو انہی مقامات سے احرام باندھنا ہو گا یا ان سے فاصلے سے گزرنا ہو گا تو دائیں یا بائیں یہ مقامات واقع ہوں گے۔ ان کی محاذات و مسافت سے احرام باندھنا ہو گا۔

اگر محاذات کی جگہ متعین نہ ہو سکے اور علم یا ظن غالب سے تعین ممکن نہ ہو تو اس وقت ایسے مقام سے احرام باندھنا ہو گا جس کا فاصلہ کم از کم دو مرحلہ عرفیہ یا تین مراحل شرعیہ ہوں۔ کیونکہ قریب ترین مواقیت کا فاصلہ اتنا ہی ہے ظاہر ہے کہ میقات یا محاذات میقات سے تجاوز جائز ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ محاذات میقات مجہول ہو، نیز جب تمام فقہاء حنفیہ کی تصریحات کے مطابق داخل میقات سے اب جو شخص بحری سفر کر رہا ہو۔ محاذاتِ میقات سے بلا احرام گزرے گا، اور داخل میقات کے مقام پر پہنچے گا۔ اس پر تجاوز عن المیقات بلا احرام کا حکم لگے گا۔ رہا کہ محاذات کا علم صحیح طریقہ سے ممکن نہیں، یہ بات صحیح نہیں۔ آج کل کے آلات اور نقشہ جات اور جہاز رانوں کی معلومات کے پیش نظر یہ محض خیال خام ہے۔ نیز آج کل پاکستان سے جو جہاز جاتے ہیں۔ جہاز ران تمام مسلمان ہوتے ہیں اطلاع دینے والے کافر کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے۔

شیخ ابن حجر ہیثمی مکی کا یہ فرمانا کہ جب تجاوز یمنۃً و یسرۃً یعنی دائیں بائیں ایسے حال میں ہو کہ مسافر کا رخ مکہ کے سمت میں نہ ہو اور جب رخ مکہ کی طرف ہو اس وقت محاذات میقات سے احرام باندھنا ہو گا۔ قابل اطمینان نہیں ہے۔ جب مسافر کا قصد مکہ ہی ہے اور آگے چل کر صحیح تعین محاذات مشکل ہو۔ پھر متعین محاذات کو چھوڑنا غیر معقول ہے۔ جبکہ میقات سے اور محاذات میقات سے احرام باندھنا زیادہ بہتر ہو۔ اور اسی وجہ سے ابن حجر مکی کے چند شارحین نے ان کی رائے کی مخالفت کی ہے۔ اگرچہ مدار خلاف کچھ اور ہے۔ صرف اتنی بات تجاوز عن المیقات کے لیے کہ مسافت جدہ اور یلملم برابر ہے، جدہ سے احرام باندھنے کے لیے کافی نہیں یہ تو صرف اسی وقت حکم ہے کہ محاذات میقات کا تعین نہ ہو سکے۔ بہر حال جو کچھ ابن حجر ہیثمی

نے فرمایا ہے، وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے اور تعجب ہے کہ موصوف نے دعویٰ کی تائید یا تدلیل میں کوئی فقہی یا حدیثی دلیل پیش نہیں فرمائی۔ اس لیے موصوف کا دعویٰ بلا دلیل پر اتنی بڑی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں اور میرے نزدیک فقہی مسئلہ یہی ہے کہ بحری مسافر کو یلملم کی محاذات ہی سے احرام باندھنا ضروری ہے۔ ورنہ دم لازم آئے گا۔ اور توبہ بھی کرنا پڑے گی۔

مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدرسہ اشرف المدارس کی رائے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ بندہ نے مسئلہ محاذات میقات پر قدیماً و حدیثاً، اجتماعاً و انفراداً جب بھی غور کیا تو ہر دفعہ یہی نتیجہ نکلا کہ محاذات بصورت دائرہ لی جائے گی۔ یعنی مکہ مکرمہ سے جس مقام کا فاصلہ میلوں کے اعتبار سے میقات کے فاصلے سے برابر ہوگا، وہ مقام محاذی میقات کہلائے گا۔ اس نظریہ پر مختصراً چند دلائل عرض کرتا ہوں۔

۱۔ محاذات میقات کے اصل معنی یہ ہیں کہ مکہ مکرمہ کی طرف جاتے ہوئے میقات کے دائیں بائیں جانب برابر ہو جائے کما فی التحفۃ المسامتۃ، بان کان علی یمینہ او یسارہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ معنی اسی صورت میں متعین ہو سکتے ہیں کہ مسافت کی مساوات میلوں کے اعتبار سے لے لی جائے، البتہ میقات سے بہت دور سے گذر ہو تو دونوں میں تفاوت ہوگا۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے قول فانظروا حذوھا من طریقکم سے بھی ظاہر ہے کہ اصل اعتبار میقات کے دائیں یا بائیں جانب سے مسافت کا ہے جو کہ مساواۃ بُعد بحسب الامیال کو مستلزم ہے۔ الا یہ کہ میقات سے بہت دور سے گذر ہو بلکہ من طریقکم کا لفظ بتلا رہا ہے کہ مسامتت انسان کی بجائے محاذاۃ مقام یعنی مساواۃ مسافت کا اعتبار کیا جائے گا اور مسافت کی صحیح مساواۃ مراحل ترک کسور سے نہیں ہو سکتی۔

۲- وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ المحروسۃ من طرف البحر (ارشاد الساری) اس سے ثابت ہوا کہ محاذاۃ میں مساواۃ مسافت کا اعتبار میلوں سے کیا جائے گا نہ کہ مراحل سے۔ کیونکہ اکثر مواقیت مرحلتین پر ہیں پس اگر محاذاۃ میں بُعد بحساب مراحل لیا جائے تو عبارت مذکور کا حاصل یہ نکلے گا۔ وان لم یعلم بعد المرحلتین فعلی مرحلتین، وھو بیّن البطلان۔

۳- عبارۃ الوفائی- فلہ ان یؤخر احرامہ من محاذاۃ یلملم الی راس العلم المعروف قبل مرسی جدۃ وھو حال توجہ السفینۃ الی جھۃ الحرم و لیس لہ ان یؤخر الی جدۃ لانھا اقرب من یلملم بنحو الربع وقولھم ان جدۃ و یلملم مرحلتان مرادھم ان کلا لا ینقص عن مرحلتین وان تفاوتت المسافتان کما حققہ من سلک الطریقین وھو عدد کادوا ان یتواتروا الخ (حاشیہ شروانی علی تحفہ) اس سے معلوم ہوا کہ جن حضرات نے مرحلتین کا اعتبار کرتے ہوئے جدہ کو یلملم سے محاذی قرار دیا ہے، ان کا بھی یہ مقصد نہیں کہ میلوں کا فرق غیر معتبر ہے بلکہ ان کے نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ انھوں نے مرحلتین کے اطلاق سے دونوں کی مسافت کو مساوی سمجھ لیا۔ لہٰذا اس پر تنبیہ کی گئی کہ دونوں کی مسافت مساوی نہیں بلکہ یلملم ابعد ہے۔

۴- قال الش- ای الامر الاول وھو ان مبنی المواقیت علی التقریب کلام التحفۃ والنھایۃ و یلزمھم صریح خلافہ (حاشیہ شروانی ص۴۳) حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ مختلفۃ المسافت مواقیت کو دو مرحلے لکھتے ہیں اس پر کوئی دلیل نہیں کہ محاذاۃ میں میلوں کا فرق غیر معتبر ہے۔ اس سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسافت کو شمار کرتے وقت مراحل کی کسور کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی مراحل کی خصوصیت نہیں، بلکہ ہر حساب میں ترک کسور کی عام عادت تھی، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان مواقیت کی مسافت کو برابر قرار دیا ہے۔ ورنہ قرن المنازل کو آخر المواقیت قرار دینے کے کیا معنی؟ ڈھائی یا پونے تین مراحل

کو بحذف کسر دو مرحلہ تو کہا جا سکتا ہے مگر دو اور پونے تین مراحل کی مسافت کو برابر کہنا معقول نہیں۔ جیسے کہ دو ہزار اور پونے تین ہزار کو برابر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ امر ویسے بھی بدیہی ہے اور مسلّم ہے کہ مساواۃ باہم بالکل برابری کو کہا جاتا ہے۔ البتہ اتنا قلیل فرق کہ جس کا حساب مشکل ہو، عرفاً ہدر ہوتا ہے۔ چونکہ احکام شرعیہ کا مدار تیسّر پر ہے۔ لہٰذا مسافت کی مساواۃ معلوم کرنے میں فرلانگ وغیرہ کا حساب لگانا تو ضروری نہیں بلکہ ایک آدھ میل کا فرق بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مگر میلوں کا حساب تو سہل ہے، ہاں اگر کہیں میلوں کا حساب بھی مشکل ہو تو اسے بھی ہدر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرن المنازل کی محاذاۃ میں ذات عرق کی تعیین اسی طرح فرمائی تھی۔ بعض حضرات کا جدہ اور یلملم کی مسافت کو برابر کہنا بھی اسی پر مبنی ہے۔

آگے یہ بحث رہ جاتی ہے کہ یلملم اور جدہ میں سے کسی کی مسافت زیادہ نہیں ہے سو جدید تحقیقات کے علاوہ متقدمین نے بھی یلملم کی مسافت زیادہ ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ وان لم یعلم المحاذاۃ فعلی مرحلتین من مکۃ کجدۃ [illegible] تھانوی اور حضرت سہارنپوری قدس سرہما کے فتاویٰ بھی اسی پر مبنی ہیں کہ یلملم کی محاذاۃ جدہ پہنچنے سے قبل ہو جاتی ہے۔ اگر کسی نے دونوں کو برابر کہا ہے تو دوسرے حضرات نے اسے عدم العلم پر مبنی قرار دیا ہے۔ یلملم کی ابعدیت قول الاکثر اور احوط ہونے کے علاوہ ارجح بھی ہے۔ اس لیے کہ قول مساواۃ تو اندازاً بھی کیا جا سکتا ہے اور حکم تفاوت خصوصاً مقدار زیادہ کی تعیین اور دوسرے پر عدم علم کا حکم (کما فی حاشیہ شروانی) بدون کامل تحقیق کے نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ قول الوفائی وکی حققہ من سلک الطریقین و ہم عدد کادوا ان یتواتروا۔ میں اس کی تصریح ہے کہ یہ فیصلہ جم غفیر نے کامل تحقیق کے بعد کیا ہے۔ شروانی نے وفائی اور عبدالرؤف تلمیذ شلیؒ سے مقدار زیادۃ کی تعیین نقل فرمائی ہے۔ تحقیقات جدیدہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ——

نتیجہ یہ کہ محاذاۃ یلملم کا علم ہوتے ہوئے (جو اس زمانہ میں مشکل نہیں) جدہ تک تجاوز

بدون احرام ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

رشید احمد عفی عنہ، از اشرف المدارس ناظم آباد کراچی۔

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ۔

مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے علمی اور عملی کمالات مجھ پا بر کاب ضعیف کے لیے قابل غبطہ ہیں۔ زادہم اللہ تعالیٰ علماً نافعاً وعملاً متقبلاً زیادات لاتتناہی۔

لیکن جن وجوہ کی بنا پر ان حضرات نے بحری مسافروں کے لیے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز موجب دم قرار دیا ہے۔ ان پر احقر کا قلب منشرح نہیں۔ احقر نے جہاں تک غور و فکر کیا، ترجیح اسی کی معلوم ہوئی کہ بحری مسافروں کے لیے جدہ تک احرام کو مؤخر کرنا ۔ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے نہ اس سے دم لازم آتا ہے۔

اس کی تفصیلی وجوہ کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ اجمالاً پھر اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ

۱۔ یلملم کی محاذات سے جو تجاوز بحر میں ہوتا ہے وہ تجاوز آفاق کے اندر ہے، حل یا جہت حرم کی طرف نہیں ہے۔ اس کو موجب دم قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ جن لوگوں کا راستہ یلملم سے مکہ معظمہ کی طرف براہ راست جانے کا تھا یا اب ہے، وہ اگر یلملم کی محاذات سے جانب مکہ مکرمہ تجاوز کریں تو بے شک دم واجب ہوگا۔ لیکن آجکل بحری جہاز کے مسافر سمندر میں یلملم سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ سے آفاق کے اندر سفر کرتے ہیں۔ ان کا یہ سفر تجاوز عن المیقات یا عن ذات المیقات نہیں کہلا سکتا۔

۲۔ جدہ کو فقہاء کا داخل میقات کہنا بھی اس کے منافی نہیں کہ جدہ سے احرام باندھنے کو جائز قرار دیا جائے، کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جتنے بھی مواقیت ہیں وہ سب اجزاء حل ہوتے ہیں۔ باہر سے بقصد مکہ مکرمہ آنے والا یہاں سے احرام باندھ سکتا ہے اور یہاں کا یا اس کے قرب وجوار کا رہنے والا حِلی کہلاتا ہے۔ اس کے لیے دخول مکہ بلا احرام جائز ہے، اسی لیے فقہاء نے ضرورت کے مواقع کے لیے یہ حیلہ لکھا ہے کہ جو شخص باہر سے بقصدِ جدہ، جدہ میں داخل ہو اس پر احرام لازم نہیں۔ پھر جدہ میں مقیم ہو کر اگر وہ مکہ مکرمہ میں بلا قصد حج وعمرہ جانا چاہے تو اس وقت بھی اس پر

احرام کی پابندی نہیں۔

۲۔ بحری جہاز یلملم کی محاذات سے آگے جو جدہ کی طرف سفر کرتا ہے، وہ تمام سفر آفاق میں ہے۔ جب جہاز بڑے سمندر سے ساحل جدہ کا رخ کرتا ہے اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب محاذات میقات کس جگہ ہوگی۔ اس کے متعلق عام فقہاء کا ارشاد یہ ہے کہ حقیقی محاذات کا علم ہونا مشکل ہے۔ اس لیے اقرب مواقیت کی مسافت کا اعتبار کر لیا جائے، یعنی جس جگہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلے ہے وہاں سے احرام باندھنا ضروری ہوگا اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جدہ سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ دو مرحلہ ہے۔ اسی لیے شیخ ابن حجر مکی، ملا علی قاری، مخدوم ہاشم سندھی، و ملا اخوند جان وغیرہ اکابر علماء نے جدہ کو بحکم میقات قرار دیا۔

رہا یہ معاملہ کہ آج کل حقیقی محاذات کا علم کچھ دشوار نہیں، کیونکہ فاصلوں کی پیمائش اور زاویوں کی تحقیق کے ایسے جدید آلات موجود ہیں، جن کی وجہ سے حقیقی محاذات معلوم کرنے کو مشکل کہنا بے معنی ہے۔ اس میں قابل نظر یہ بات ہے کہ بلا شبہ پیمائش کے آلات و ذرائع تو اس زمانے میں بہت موجود ہیں، سیاروں کے فاصلے اور زاویے ان سے صحیح لگائے جا سکتے ہیں، زمین کی مسافتوں کا تو کہنا کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مبداء و منتہیٰ کا تعین تو آلات سے نہیں روایات سے ہوگا۔ منتہیٰ تو متعین ہے کہ بیت اللہ ہے لیکن مبداء یعنی میقات جس کی محاذات دیکھنا ہو وہ کیا ہے، اس کا عرض و طول کتنا ہے۔ اس کے کس گوشہ سے محاذات دیکھی جائے گی یہ کام تو جدید آلات کا نہیں، اس میں تو قدیم فقہاء کا قول ہی مستند ہو سکتا ہے۔ تحفہ شرح منہاج کے حواشی سے یہ بات اوپر لکھی جا چکی ہے کہ یلملم جس کی محاذات کا یہاں اعتبار کرنا زیر بحث ہے وہ حسب تصریح فقہاء سعدیہ کے بالمقابل پہاڑ ہے اور یہ پہاڑ دو ہیں، ایک پہاڑ سے مکہ مکرمہ کی مسافت دو مرحلہ سے بھی زائد ہے اور دوسرے پہاڑ سے مسافت لی جائے تو دو مرحلے یا اس سے بھی کچھ کم ہے۔

فتح الباری، عمدۃ القاری اور تمام کتب معتبرہ میں بحوالہ ابن حزم یلملم سے جو مسافت

مکہ مکرمہ کی بیان کی گئی ہے، وہی قابل اعتماد ہے۔ آج کل کے نئے پیمائش کرنیوالوں میں کسی نے تو خود سعدیہ ہی کو یلملم قرار دے کر وہاں سے مسافت لی ہے، کسی نے کسی دوسری جگہ سے۔ ان کے آلات اور پیمائش کے حسابات کتنے ہی صحیح ہوں، مگر مبداء کے تعین میں ان کا قول بمقابلہ علماء سابقین کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور ان حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ یلملم کی محاذات بھی مکہ مکرمہ سے دو مرحلہ ہے۔ اور جدہ کی مسافت بھی۔ اب رہا میلوں کا فرق، سو احکام شرعیہ کا مدار کسی جگہ بھی اسی طرح کی تدقیقات پر نہیں ہے۔ مواقیت کے مسائل و احکام پر نظر کرنے سے یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ اس معاملہ میں اتنی تدقیق کا اعتبار نہیں کیا۔ یہ سطور اتفاق سے ایسے حال میں لکھ رہا ہوں جبکہ ایک شدید مرض کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے پر قدرت نہیں، لیٹے ہوئے لکھی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آراء مختلفہ مع وجوہ کے علماء کے سامنے آجائیں تاکہ ان میں غور کر کے وہ کوئی فیصلہ فرمادیں۔

عوام کے لیے ایسے حالات میں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلافِ رائے ہے۔ احتیاط اسی میں ہے کہ بحری جہاز میں یلملم ہی سے احرام باندھ لیں۔

یا ساحل جدہ پر اترنے سے پہلے احرام باندھ لیں کیونکہ حسب تصریح فقہاء عمل اختلاف میں احتیاط کا پہلو اختیار کرنا بہتر ہے تاکہ اپنی عبادت کے جواز میں کسی کا اختلاف نہ رہے۔ اس کے علاوہ احرام کو میقات سے پہلے باندھنا سب ہی کے نزدیک افضل ہے، بلکہ بعض روایات حدیث میں اپنے گھر سے ہی احرام باندھ کر چلنے کی فضیلت آئی ہے، شرط یہ ہے کہ محظورات احرام میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو اور جس کو یہ خطرہ ہو کہ محظورات احرام سے بچنا اس تمام عرصہ میں اس کے لیے مشکل ہوگا۔ اس کے لیے آخری حد تک مؤخر کرنا بہتر ہے۔ ایسے شخص کو آخری حد میں اتنی احتیاط کر لینا چاہیے کہ اس کا احرام علماء کے اختلاف سے نکل جائے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ نسأل ان یھدینا لما اختلف فیہ الی الحق باذنہ۔

وھو ولی التوفیق واللہ اعلم بالصواب وبہ نستعین ولاحول ولا قوۃ الا بہ۔

حدِ مواقیت کے اندر رہنے والے

اوپر جو احرام کے احکام کا بیان ہوا ہے وہ اہل آفاق کے لیے ہے یعنی جو حلقۂ مواقیت سے باہر تمام دنیا میں کسی جگہ رہتے ہیں۔ اور وہاں سے بقصد مکہ مکرمہ حلِ صغیر یعنی حدود مواقیت کے اندر داخل ہوتے ہیں، ان پر مواقیت یا ان کی محاذات سے احرام باندھنا لازم ہے اور جو لوگ خود مواقیت اور یا ان کے اور حد حرم کے درمیان کے رہنے والے ہیں جس کو حِل کہا جاتا ہے ان کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ حج یا عمرہ کے سوا کسی دوسرے کام کے لیے مکہ مکرمہ جانا چاہیں تو ان پر احرام باندھنے اور حج یا عمرہ کرنے کی کوئی پابندی باتفاق ائمہ نہیں ہے۔ وہ جیسا چاہیں بلا احرام مکہ مکرمہ جا سکتے ہیں۔
ہاں اگر حج یا عمرہ کے ارادے سے جائیں تو ان کے لیے افضل تو یہ ہے کہ اپنے گھر سے ہی احرام باندھ لیں ورنہ حد حرم میں داخل ہونے سے پہلے احرام باندھنا لازم و واجب ہوگا۔ بقصد حج و عمرہ اگر یہ لوگ حدود حرم میں بلا احرام داخل ہوں گے تو ان پر بھی دم (قربانی) لازم ہوگی۔
مناسک ملا علی قاری میں ہے:۔

الصنف الثانی وھم الذین منازلھم فی نفس المیقات او داخل المیقات الی الحرم فوقتھم الحل ای میقاتھم جمیع المسافۃ من المیقات الی انتہا الحل للحج و العمرۃ وھم فی سعۃ ای جواز ورخصۃ و عدم لزوم کفارۃ مالم یدخلوا ارض الحرم ای بلا احرام و من دویرۃ اھلھم افضل ولھم دخول مکۃ بغیر احرام اذا لم یریدوا نسکا۔ (ارشاد الساری ص۵۴)

مسئلہ۔ اگر کوئی حدود میقات کے اندر یعنی حل صغیر میں رہتا ہے اور کسی ضرورت

سے آفاق یعنی حدود میقات سے باہر گیا تو وہ بھی آفاقی کے حکم میں ہو گا یعنی اگر وہ بھی بقصد دخول مکہ مکرمہ یا حرم حد میقات کے اندر آئے گا تو اس پر بھی احرام حج یا عمرہ کا لازم ہو جائے گا۔ اب بغیر احرام کے اس کو مکہ مکرمہ یا حرم میں داخل ہونا جائز نہیں ہو گا ہاں آفاق سے واپس اپنے گھر آنے کا قصد ہو، مکہ مکرمہ یا حرم کا اس وقت ارادہ نہ ہو تو اپنے گھر میں بلا احرام آسکتا ہے اور جب یہاں بلا احرام پہنچ گیا، اب اگر یہاں سے مکہ معظمہ جانے کی کوئی ضرورت پیش آئے تو بغیر احرام کے جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں اس کا جانا بقصد حج و عمرہ نہ ہو کسی اور ضرورت کے لیے ہو۔

مسئلہ یہ جو اوپر لکھا گیا ہے کہ جو لوگ عین میقات پر یا داخل میقات رہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ تمام مواقیت کے اندر رہتے ہیں، ان کا وہ حکم ہے جو ابھی لکھا گیا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو کسی ایک میقات کے اندر ہیں۔ مگر دوسرے میقات سے باہر جیسے ذوالحلیفہ سے رابغ تک کے وہ مقامات جو حد حل میں داخل ہیں ان کے رہنے والے میقات ذوالحلیفہ کے تو اندر ہیں مگر میقات جحفہ کے باہر، تو ایسے لوگوں کا حکم یہ ہے کہ وہ بھی آفاقی لوگوں کے حکم میں ہیں، ان کے لیے دخول مکہ مکرمہ یا حرم بغیر احرام کے جائز نہیں۔ (حاشیہ ارشاد الساری بحوالہ درالمختار ص۵۷)

مسئلہ۔ جبکہ مشرقی ممالک سے بحری راستہ پر آنے والوں کے لیے جدہ کو میقات قرار دیا گیا جیسا کہ پہلے بتلایا گیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جدہ والے بھی مکہ مکرمہ میں بغیر احرام کے نہ جا سکیں، کیونکہ مواقیت سب اجزاء حل ہوتے ہیں۔ ان میں یا ان کے قرب و جوار میں رہنے والوں پر بدون حج و عمرہ کے احرام کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اسی لیے بعض فقہاء نے اس شخص کے لیے جو کسی وجہ سے احرام باندھنے پر مجبور ہو، حیلہ یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے سفر میں جدہ یا خلیص کا قصد کر کے دائرۂ مواقیت یعنی حل صغیر میں داخل ہو جائے۔ اور جب وہ ان مقامات میں سے کسی جگہ جا کر اتر گیا تو وہ بھی میقاتی اور حلی لوگوں کے حکم میں ہو گیا۔ اب اگر وہ بلا قصد حج و عمرہ کسی ضرورت سے مکہ مکرمہ جانا چاہے تو وہ بھی بغیر احرام کے

جا سکتا ہے

حدودِ حرم کے اندر رہنے والے جو لوگ حدودِ حرم کے اندر مثلاً مکہ مکرمہ یا منیٰ وغیرہ میں رہتے ہیں۔ اگر وہ حج کا ارادہ کریں تو ان کا میقات حرم ہی ہے۔ حدودِ حرم میں جہاں سے چاہیں، احرام باندھ سکتے ہیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ مسجد حرام سے یا اپنے گھر سے احرام باندھیں۔ اور اگر عمرہ کرنا چاہیں تو ان کا میقات حل ہے۔ جو حدودِ حرم سے باہر ہے وہ حدودِ حرم سے باہر تنعیم یا جعرانہ وغیرہ میں جا کر عمرہ کا احرام باندھیں۔ پھر مکہ مکرمہ آکر افعال عمرہ ادا کریں۔

مسئلہ۔ جو لوگ آفاق کے رہنے والے مکہ مکرمہ یا حدودِ حرم میں داخل ہوئیں ان کا بھی حکم وہی ہے جو اہل مکہ کا ہے۔ کہ اگر یہ عمرہ کرنا چاہیں تو حدودِ حرم سے باہر تنعیم یا جعرانہ جا کر احرام باندھیں اور حج کا احرام حرم ہی سے باندھیں۔

مسئلہ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آفاقی لوگ جو اشہرِ حج میں جو شوال سے ذی الحجہ تک ہیں۔ احرام عمرہ باندھ کر داخل ہوئے اور عمرہ کر کے حلال ہو گئے ان کا یہ عمرہ تمتع کا ہوگا۔ اس عمرہ کے بعد حج سے پہلے کوئی دوسرا عمرہ یہ نہیں کر سکتے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد عمرہ کر سکتے ہیں۔

مسئلہ۔ جو آفاقی آدمی اشہرِ حج سے پہلے یعنی شوال شروع ہونے سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ میں عمرہ کا احرام باندھ کر آئے اور عمرہ کر کے حلال ہو گیا۔ اس کا یہ عمرہ تمتع کا نہیں ہے۔ اس لیے اس کو شوال شروع ہونے سے پہلے دوسرے عمرے کرنے کا بھی اختیار ہے۔

مسئلہ۔ کوئی مکہ مکرمہ یا حدودِ حرم کے اندر کا رہنے والا اگر حدودِ میقات سے باہر آفاق میں کسی وجہ سے چلا جائے تو اب اس کا حکم بھی آفاقی کا حکم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ وہاں سے مکہ مکرمہ یا حدودِ حرم کے اندر جانے کے قصد سے حدودِ مواقیت کے اندر آئے گا۔ تو اس پر لازم ہے کہ میقات یا محاذاتِ میقات سے احرام

باندھ کر آئے، بغیر احرام کے داخل ہونا آفاق میں جانے کے بعد اس کے لیے بھی جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ والحمد للہ اولہ وآخرہ وعلانیتہ وسرہ۔ ربنا تقبل منا، انک انت السمیع العلیم

ناکارۂ خلائق بندہ محمد شفیع
خادم دارالعلوم کراچی
۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ

منهج الخير
فی
الحج عن الغیر

حج بدل اور اس کے احکام

جس میں حج بدل انجام دینے اور حج بدل کرنے والے کو قران، تمتع، اِفراد میں سے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس کے علاوہ دیگر مسائلِ حج بھی بیان کیے گئے ہیں۔

مقامِ تالیف ________ دارالعلوم کراچی ۱۴

زمانۂ تالیف ________ رجب ۱۳۹۲ھ

اشاعتِ اوّل ________ ماہنامہ البلاغ شعبان ۹۲ھ

"اس مقالہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے،
اس کا اصل محرک اس مسئلہ کی تحقیق تھی کہ
حج بدل کرنے والا قِران یا تمتع کر سکتا ہے یا نہیں؛
پھر ضمناً دوسرے مسائل بھی اس میں جمع کر دیئے گئے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منهج الخير في الحج عن الغير

حج بدل اور اس کے احکام

حج بدل کے مسائل سے پہلے ایک اصولی سوال کا جواب سمجھ لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کی طرف سے کوئی عبادت ادا کرسکتا ہے یا نہیں۔ اس میں یہ تفصیل ہے کہ عبادات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک عبادت بدنی جیسے نماز روزہ۔ دوسرے عبادتِ مالی جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، تیسرے وہ عبادت جو بدنی اور مالی کا مجموعہ ہے۔ یعنی اس میں کچھ مال بھی خرچ ہوتا ہے، کچھ جسمانی محنت بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ جیسے حج وعمرہ وغیرہ۔

ان تینوں قسم کے احکام یہ ہیں کہ عباداتِ بدنیہ میں تو ایک کا فرض کوئی دوسرا آدمی مطلقاً ادا نہیں کرسکتا، ایک کی نماز کوئی دوسرا ادا نہیں کرسکتا۔ ایک کا روزہ دوسرا نہیں رکھ سکتا۔ اور عباداتِ مالیہ میں مطلقاً ایک کا فرض دوسرا ادا کرسکتا ہے۔ جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ کسی کو بھی اپنا وکیل بنا کر زکوٰۃ اس کے ذریعہ ادا کرسکتا ہے۔ اس کا مسلمان ہونا بھی شرط نہیں اور کوئی دوسرا آدمی اپنے مال سے دوسرے کی زکوٰۃِ فرض اس کی اجازت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے، اس میں کوئی شرط نہیں۔

تیسری قسم یعنی وہ عبادت جو مالی اور بدنی سے مرکب ہے اس کا حکم یہ ہے کہ خود ادائیگی پر قادر ہونے کی حالت میں تو کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہیں کرسکتا۔ البتہ

خود قدرت نہ ہو تو ضرورت کے وقت دوسرا آدمی اس کا فرض ادا کر سکتا ہے۔ حج اسی قسم میں داخل ہے کیونکہ اس میں مال بھی خرچ ہوتا ہے اور محنت بھی۔ اس تیسری قسم کے لیے کچھ شرائط ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

مسئلہ۔ یہ حکم ان فرض اور واجب عبادات کا ہے جو مالی اور بدنی دونوں عبادات پر مشتمل ہوں۔ کہ ایک کا فرض دوسرا آدمی ادا کر دے۔ لیکن نفل عبادات میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی عبادت کا ثواب جس کو چاہے بخش دے۔ خواہ عبادت بدنی نماز، روزہ ہو یا مالی صدقات ہوں۔ یا حج وغیرہ جو دونوں سے مرکب ہیں وہ ہوں، ہر قسم کی نفلی عبادات کا ثواب ہر آدمی کو حق ہے کہ جس کو چاہے بخشش کر سکتا ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ عبادت کرنے کے بعد دل سے نیت کر لے اور زبان سے کہہ دینا زیادہ بہتر ہے کہ اس عبادت کا ثواب فلاں شخص کو پہنچے۔ اس میں یہ بھی اختیار ہے کہ ایک عبادت کا ثواب چند آدمیوں کو پہنچا ے۔ اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ جو شخص اپنی عبادت کا ثواب کسی کو بخش دے تو وہ اس کو پہنچتا ہے البتہ بعض ائمہ فقہاء کے نزدیک بدنی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو نہیں بخشا جا سکتا (ہدایہ) اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص نفلی طور پر اپنے حج یا عمرہ کا ثواب دوسرے کو بخش دے تو یہ بھی جائز ہے اور اس کے لیے کوئی شرط نہیں، جبکہ یہ حج وعمرہ اپنے مال سے کیا ہو۔ اور اگر آمر اپنا مال اور خرچ دیکر اپنی طرف سے نفلی حج یا عمرہ کرنے کے لیے کسی کو بھیجے تو اس میں چند شرائط... ضروری ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

حج بدل فرض کے احکام

نفلی حج بدل کے احکام بعد میں بیان کیے جائیں گے۔

مسئلہ۔ جس شخص پر حج فرض ہو گیا اور اس نے ادائے حج کا زمانہ بھی پایا۔ مگر باوجود قدرت کے کسی وجہ سے حج ادا نہ کیا پھر وہ حج سے معذور اور عاجز ہو گیا تو اس پر فرض ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو بھیج کر خود حج بدل کرائے یا وصیت کرے کہ میرے بعد میری طرف سے حج کرایا جائے۔

مسئلہ۔ اگر حج کی مالی استطاعت حاصل ہو جانے کے بعد زمانۂ حج آنے

سے پہلے فوت ہوگیا تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں. کیونکہ حج اس کے ذمہ سے ساقط ہوگیا. اسی طرح اگر یہ شخص پہلے ہی سال حج کے لیے روانہ ہوگیا. پھر حج سے پہلے فوت ہوگیا تو اس کے ذمہ سے بھی حج ساقط ہوگیا وصیت کی ضرورت نہیں (غنیہ مناسک ملا علی قاری)

حج سے عاجز و معذور قرار دینے کی شرائط

حج سے عاجز اور معذور ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جو اوپر گزری. کہ حج کا موقع پانے سے پہلے انتقال ہوگیا. اس میں تو حج سر سے ساقط ہی ہوجاتا ہے. دوسری صورت یہ ہے کہ کسی نے اس کو قید کرلیا یا زبردستی مکہ معظمہ جانے سے روک دیا. تیسری یہ کہ کوئی ایسا مرض پیش آگیا جس سے صحت کی امید نہیں. مثلاً اپاہج یا نابینا یا لنگڑا ہوگیا یا بڑھاپے کا ضعف ایسا ہوگیا کہ خود سواری پر سوار نہیں ہو سکتا. چوتھی صورت یہ ہے کہ راستہ مامون نہیں رہا. سفر کرنے میں جان و مال کا اندیشہ ہے. پانچویں صورت خاص عورتوں کے لیے یہ ہے کہ کوئی محرم ساتھ کے لیے نہ ملا. ان سب صورتوں میں اس کو معذور سمجھا جائے گا. بشرطیکہ یہ عذر موت تک مسلسل جاری رہا ہو اگر یہ اعذار قبل الموت رفع ہوجائیں، مگر پھر خود زمانہ حج پانے کی صورت میں حج کرنے کی نوبت نہ آئے تو حج بدل کرانا یا اس کی وصیت کرنا واجب ہے اور اگر مرنے تک یہ اعذار قائم رہے تو امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک مشہور روایت کے مطابق وصیت کرنا واجب نہیں بشرطیکہ عذر سے پہلے زمانۂ حج نہ پایا ہو. کیونکہ شرط نہ پانے کی وجہ سے فرض ساقط ہوگیا. اور صاحبین کے نزدیک مالی استطاعت تو ایسی شرط ہے کہ اس کے نہ ہونے یا ایام حج آنے سے پہلے ختم ہوجانے کی وجہ سے فرض حج ساقط ہوجاتا ہے. باقی شرائط وجوب حج کے لیے نہیں بلکہ ادائے حج کے لیے ہیں. ان کے فوت ہوجانے کی وجہ سے فرض ساقط نہیں ہوتا. مگر جب خود ادا کرنے پر قدرت نہ رہے تو حج بدل کی وصیت کرنا واجب ہے. محقق ابن ہمام وغیرہ نے صاحبین کے مذہب کو ترجیح دی ہے. اس لیے احتیاط ان سب صورتوں میں یہ ہے کہ حج بدل

کی وصیت کرجائیں اور وارث حج بدل کرادیں۔ (مناسک ملا علی قاری)

حج بدل کی شرائط یہ شرائط کتب فقہ میں مذکور ہیں، یہاں ملا علی قاری کے مناسک سے لکھی جاتی ہیں، لیکن ترتیب کچھ بضرورت بدل گئی ہے۔

جس شخص کے ذمہ حج فرض ہو یا اس نے بذریعہ نذر (منت) اپنے اوپر حج یا عمرہ کو لازم کرلیا ہو۔ پھر خود ادا کرنے کی قدرت نہ رہی جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے تو ایسے شخص کا حج یا عمرہ بطور بدل ادا کرانے کے لیے بیس شرطیں ہیں۔ ان شرائط میں دو لفظ باربار آئیں گے۔ ان کے معنی سمجھ لیجیے، ایک آمر دوسرا مأمور، حج کرانے والے کو آمر کہتے ہیں اور جو دوسرے کے حکم سے حج بدل کرتا ہے اس کو مأمور کہتے ہیں۔

پہلی شرط: یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج بدل کیا جارہا ہو اس پر حج بدل کرانے کے وقت حج فرض ہو۔ اگر اس وقت اس پر حج فرض نہیں تھا، اس حالت میں اپنی طرف سے حج بدل کرادیا تو یہ نفلی حج ہوا، اگر اس کے بعد اس کو حج کی استطاعت ہو تو حج فرض ہوگیا اب دوبارہ حج خود کرنا پڑے گا۔ خود نہ کرسکا تو حج بدل دوبارہ کرانا پڑے گا۔

دوسری اور تیسری شرط، دائمی عجز اور حج بدل کرانے سے پہلے عاجز ہونا ہے۔ یعنی جن اعذار کی وجہ سے انسان کو حج سے عاجز قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل پہلے بیان ہوچکی ہے۔ ان اعذار کا موت تک باقی رہنا.......... حج بدل کرانے سے پہلے موجود ہونا بھی فرض حج بدل کے لیے شرط ہے۔ اگر کسی معذور شخص کا حج بدل کرا دینے کے بعد عذر رفع ہوگیا اور حج پر قدرت ہوگئی، مثلاً بیمار تھا اچھا ہوگیا۔ عورت کو محرم مل گیا تو دوبارہ خود حج ادا کرنا ضروری ہوگا۔ اور جو حج بدل پہلے کرایا ہے، وہ نفلی حج ہوجائے گا۔ (مناسک ملا علی)

چوتھی شرط: یہ ہے کہ جس کا حج فرض ادا کرنا ہے، اس کی طرف سے حج بدل کرنے والے کو امر کیا گیا ہو۔ یا کم از کم اجازت دی گئی ہو، اگر اس کے امر و اجازت کے بغیر کسی شخص نے اس کی طرف سے حج بدل کردیا تو اس کا فرض ادا نہ ہوگا۔

بس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جس پر حج فرض تھا اور اس نے ادا نہیں کیا اور ادا کرانے کے لیے وصیت بھی نہیں کی تو کوئی آدمی اگر اس پر احسان کرکے اس کی طرف سے حج بدل کر دے تو اس کا حج فرض ادا نہ ہوگا. لیکن امام اعظم ابو حنیفہؒ نے ایک حدیث کی بناء پر فرمایا کہ اگر کسی شخص نے اپنے والدین کی طرف سے یا کسی اور وارث یا اجنبی نے اپنے مرنے والے عزیز کی طرف سے بغیر اس کے امر اور وصیت کے ہی حج بدل ادا کردیا تو انشاء اللہ اس کا فرض ادا ہو جائے گا انشاء اللہ اسلیے کہا کہ کسی نص صریح سے اس کا ادا ہو جانا یقینی طور پر ثابت نہیں۔

پانچویں، چھٹی، ساتویں شرط: یہ ہے کہ مامور یعنی حج بدل کرنے والا مسلمان ہو عاقل ہو. مجنون پاگل نہ ہو. اگر نابالغ ہو تو ممیز ہو. یعنی احکام حج ادا کرنے اور سفر کے انتظام کی تمیز رکھتا ہو۔

مسئلہ. معلوم ہوا کہ مامور کا بالغ ہونا شرط نہیں. نابالغ بھی حج بدل کر سکتا ہے. بشرطیکہ اس میں اتنی تمیز اور صلاحیت ہو کہ احکام حج ادا کر سکے یعنی قریب البلوغ ہو. مگر اس میں بعض علماء کا اختلاف ہے اس لیے احتیاط یہ ہے کہ نابالغ سے حج نہ کرایا جائے (از مناسک ملا علی قاری)

آٹھویں شرط: یہ ہے کہ حج بدل کرنے پر کوئی اجرت و معاوضہ نہ لیا دیا جائے. اگر کسی نے باقاعدہ اجرت طے کرکے کسی سے حج بدل کرایا تو لینے اور دینے والے دونوں گناہ گار ہوں گے. مگر حج آمر کا ادا ہو جائے گا. اور جو معاوضہ حج پر لیا ہے وہ واپس کرنا واجب ہوگا. البتہ بقدر اخراجات حج مامور کو آمر کی طرف سے مال دلایا جائے گا۔

نویں، دسویں شرط: یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے حج بدل کیا جا رہا ہو اس کے مال سے حج کرے. اور سواری پر کرے، پیادہ نہ ہو. اگر حج بدل کرنے والے نے اپنا مال خرچ کرکے اس کی طرف سے حج بدل کر دیا تو اس کا فرض ادا نہیں ہو گا. اور شرط یہ ہے اکثر حصہ مصارف حج کا اس کی طرف سے ہو. اگر کچھ تھوڑا مال خود

حج بدل کرنے والے نے اپنا بھی خرچ کر لیا تو مضائقہ نہیں. اسی طرح اگر پیادہ حج کیا تو آمر یعنی حج کرنے والے کا حج فرض ادا نہیں ہوگا. اس میں بھی اکثر سفر کا سواری پر کرنا کافی ہے، کچھ حصہ سفر کا پیادہ بھی طے کر لیا تو حرج نہیں۔

گیارہویں شرط: یہ ہے کہ آمر یعنی حج کرنے والے کے وطن سے سفر حج شروع کیا جائے۔ اگر حج کرانے والے کے کئی وطن ہوں تو اس وطن کا اعتبار ہوگا جو بہ نسبت دوسرے کے مکہ مکرمہ کی طرف قریب ہو۔

مسئلہ۔ جو شخص ہندوستان میں فوت ہوا اور حج بدل کی وصیت کر گیا مگر بعد میں اس کے اہل و عیال یا جس کو وصیت کی تھی وہ ہجرت کر کے پاکستان آگیا تو وصی پر لازم ہے کہ اس کا حج ہندوستان کے وطن سے کرائے، ہندوستان ہی سے کسی آدمی کو حج بدل کے لیے مامور کر دے لیکن اگر وہاں سے کسی کو حج بدل کے لیے بھیجنے پر قدرت نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ رقم وہاں بھیجنا مشکل ہو جائے. یا وہاں سے کسی آدمی کا بھیجنا قدرت میں نہ ہو تو پاکستان ہی میں اس جگہ سے جہاں وصی ہجرت کر کے آیا ہے، کسی کو حج بدل کے لیے بھیج دے تو امید ہے کہ انشاء اللہ اس کا حج فرض ادا ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ صراحتً کتبِ فقہ میں موجود نہیں ہے مگر اس کی ایک نظیر یہ موجود ہے کہ میت کا مال اگر اس کے وطن سے حج کرانے کے لیے کافی نہ ہو تو جس جگہ سے کافی ہو، وہاں سے حج کرا دینے کی اجازت ہے. اس صورت میں بھی آمر کے وطن سے حج کرانے پر قدرت نہ رہی تو جہاں سے قدرت ہے، وہیں سے حج کرا دینا انشاء اللہ کافی ہوگا۔

بارہویں شرط: یہ ہے کہ مامور یعنی حج بدل کرنے والا احرام باندھنے کے وقت حج کی نیت آمر یعنی حج کرانے والے کی طرف سے کرے، اگر احرام کے وقت نیت نہیں کی تو امام اعظمؒ کے نزدیک افعالِ حج شروع کرنے سے پہلے پہلے نیت کرنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ احرام کے وقت زبان سے کہے کہ میں فلاں شخص کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں۔ اور پھر جب تلبیہ کہے تو اس میں یہ الفاظ کہے لبیک عن

فُلَانٍ، لفظ فلاں کی جگہ اس کا نام لے۔ اگر نام یاد نہ رہے تو صرف اتنا کہہ دے، کہ جس نے مجھے حج بدل کے لیے بھیجا ہے۔ اس کی طرف سے حج کی نیت کرتا ہوں۔ اور لبیک عن الآمر کہہ دے۔ اور اگر زبان سے کچھ بھی نہ کہے، صرف دل سے نیت آمر کے حج کی کرے تو یہ بھی کافی ہے اگر احرام باندھنے کے وقت مطلق حج کی نیت کرلی، اپنی یا دوسرے کی کوئی نیت نہیں کی تو افعالِ حج شروع کرنے سے پہلے آمر کی طرف سے نیت کرلینا کافی ہو جائے گا۔

تیرہویں اور چودہویں شرط، یہ ہے کہ مامور یعنی جس کو حج بدل کے لیے کہا گیا ہے وہ خود ہی اس کی طرف سے حج بدل کرے، کسی دوسرے سے بغیر اجازت آمر کے کرانا جائز نہیں۔ اگر بغیر اجازت کے کسی کو بھیجا تو وہ حج مامور کا ہو جائے گا، آمر کا نہیں ہوگا اور اس کو آمر کی رقم واپس کرنا پڑے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ مامور کو اجازت عام دے دی جائے۔ کہ وہ کسی وجہ سے خود نہ کرسکے تو دوسرے سے کرا دے۔

اسی طرح اگر مرنے والے نے حج بدل کی وصیت میں کسی خاص شخص کو معین کرکے کہہ دیا کہ اس کے سوا میرا حج بدل کوئی اور نہ کرے تو کسی دوسرے سے اس کا حج بدل کرانا جائز نہیں اور اگر معین تو کیا مگر دوسرے کی نفی نہیں کی یعنی صرف اتنا کہا کہ میرا حج بدل فلاں سے کرا دیں، اس صورت میں بہتر تو یہی ہے کہ اسی معین شخص سے حج کرائیں۔ ہاں اگر وہ انکار کردے یا کسی وجہ سے معذور ہو جائے تو دوسرے سے کرا سکتے ہیں۔ اس کے انکار اور معذوری کے بغیر بھی اگر وصی نے کسی اور کو بھیج دیا، تو حج فرض آمر کا ادا ہو جائے گا۔

مسئلہ۔ اگر وصیت کرنے والے نے صرف اتنا کہا کہ میری طرف سے حج بدل کرا دیا جائے اور کسی کو وصی مقرر نہیں کیا، تو سب وارث جمع ہو کر باہم مشورے سے کسی کو بھی حج بدل کے لیے بھیج سکتے ہیں۔ حج فرض آمر کا ادا ہو جائے گا۔ (ملا علی)

پندرہویں اور سولھویں شرط: یہ ہے کہ مامور حج کو فاسد نہ کرے اور فوت بھی نہ کرے۔ فاسد ہونے کی صورت یہ ہے کہ وقوفِ عرفات سے پہلے جماع کرلے اور فوت کرنے کی صورت یہ ہے کہ احرام کے باوجود عرفات کا وقوف نہ کرے، اگر فاسد کردیا یا فوت کردیا تو آمر کا حج ادا نہیں ہوا۔ اور فاسد کرنے والے پر واجب ہوگا کہ آمر کی رقم جتنی اس نے حج بدل کے لیے دی تھی واپس کرے اور آئندہ سال اپنے مال سے حج کی قضا کرے۔ یہ قضا بھی اسی مامور کی طرف سے ہوگی، آمر کی طرف سے نہیں ہوگی، آمر کو اپنا حج بدل الگ کرانا ہوگا۔

اور فوت ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اپنی غفلت و کوتاہی سے ارکان حج ادا نہیں کیے، اس صورت میں اس کو بھی آمر کی رقم کا ضمان دینا پڑے گا اور اپنے فوت شدہ حج کی قضا اپنے مال سے الگ کرنا ہوگی۔ اس قضا سے بھی آمر کا حج فرض ساقط نہیں ہوگا اور خود مامور کا بھی حج فرض اس سے ادا نہیں ہوگا، اگر بعد میں اس کو حج پر قدرت ہوگئی تو اپنا فرض الگ ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آسمانی آفت بیماری یا قید ہو جائے، وغیرہ کے سبب ارکان حج کی ادائیگی سے معذور ہوگیا، اس صورت میں اس پر لازم ہے کہ اگلے سال اس کی قضا کرے اور آمر کو کوئی ضمان دینا نہیں پڑے گا۔ مگر اگلے سال جو قضا کرے گا اس سے آمر کا حج ادا ہو سکتا ہے۔ اگر آمر اس کو حکم کرے اور یہ قضا میں آمر کی نیت کرے۔

سترہویں اور اٹھارہویں شرط: یہ ہے کہ مامور صرف ایک حج کا احرام باندھے ایسا نہ کرے کہ بیک وقت دو حج کی نیت کرکے احرام باندھے ایک اپنا ایک آمر کا اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ ایک ہی شخص کی طرف سے احرام باندھے، ایسا نہ کرے کہ دو آدمیوں کے حج کی نیت کرے اور دونوں کے لیے احرام باندھے۔

انیسویں شرط: یہ ہے کہ مامور یعنی حج بدل کرنے والا، آمر یعنی حج کرانے والے کے میقات سے احرام باندھے۔ یعنی اس کے وطن سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے جو میقات آتا ہے۔ اس سے احرام حج بدل کا باندھے، جیسے ہند و پاکستان والوں کے لیے

بحری جہاز سے سفر کرنے میں یلملم ہے۔ اگر مامور نے یہاں سے احرام عمرہ کا باندھا، عمرہ ادا کر کے مکہ معظمہ سے احرام حج کا باندھا جیسا کہ حج تمتع کا قاعدہ ہے، تو چونکہ حج میقاتِ آمر سے نہیں ہوا۔ اس لیے آمر کا حج ادا نہ ہوا۔ خود مامور کا ہو گیا۔ اس پر لازم ہے کہ آمر کی دی ہوئی رقم اس کو واپس کرے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بیسویں شرط: یہ ہے کہ مامور آمر کی مخالفت نہ کرے مثلاً آمر نے اس کو حج افراد کرنے کے لیے کہا تھا، اگر اس نے حج کے ساتھ عمرہ بھی ملا کر قران کر لیا تو آمر کا حج ادا نہ ہوگا۔ مامور پر ضمان آئے گا کہ آمر کی رقم واپس کرے۔ یہ حکم اس صورت میں تو متفق علیہ ہے۔ جبکہ اس نے عمرہ کی نیت اپنی طرف سے اور حج کی نیت آمر کی طرف سے کی ہو اور اگر عمرہ بھی آمر کی طرف سے کیا، حج بھی، تو اس میں امام اعظمؒ کا قول تو یہی ہے کہ مخالفت آمر کی وجہ سے یہ حج آمر کا نہیں مامور کا ہو گیا۔ اس پر ضمان لازم ہوگا مگر صاحبین کے نزدیک آمر کا حج اس سے ادا ہو جائے گا۔ (مناسک ملا علی قاری)

امام اعظمؒ کے نزدیک چونکہ اس حکم کا مدار مخالفت آمر پر ہے اس لیے اگر آمر نے خود ہی اجازت قران کی دے دی ہے تو مقتضائے کلام یہ ہے کہ بہ اتفاق حج آمر کا ادا ہو جائے گا۔ یہ حکم قرآن کا ہے۔ اگر مامور نے عمرہ کا اضافہ بصورت تمتع کر لیا کہ میقاتِ آمر سے صرف عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کر لیا۔ پھر مکہ مکرمہ سے احرام حج کا باندھا تو امام صاحب اور صاحبین دونوں کے نزدیک آمر کا حج ادا نہیں ہوا۔ مامور پر ضمان واجب ہے۔ (کما یظہر من البحر والفتح) اس مسئلے کی تفصیل آگے آئے گی۔

خلاصۂ شرائط

شرائط مذکورہ میں چار شرائط تو آمر یعنی حج کرانے والے کی ذات سے متعلق ہیں۔ (۱) اس کا مسلمان ہونا اور اس پر حج فرض ہونا اور خود قادر نہ ہونا (۲) اس کے عجز کا دائمی ہونا۔ (۳) حج بدل کرانے سے پہلے عاجز ہونا۔ (۴) حج بدل کے لیے کسی کو خود مامور کرنا

یا اس کے لیے وصیت کرنا۔ اور چار شرائط مامور کی ذات سے متعلق ہیں (۵) مسلمان ہونا (۶) عاقل ہونا (۷) اگر نابالغ ہو تو ممیز قریب بلوغ ہونا (۸) حج بدل کی کوئی اُجرت ومعاوضہ نہ لینا۔ باقی شرائط افعالِ حج سے متعلق ہیں کہ (۹) حج بدل کرنے میں اکثر مال حج کرانے والے آمر کا خرچ کرے۔ کچھ تھوڑا اپنی طرف سے بھی خرچ کردے۔ تو مضائقہ نہیں (۱۰) اکثر حصہ سفر کا سواری سے طے کرے، پیادہ حج کرے تو آمر کا حج نہیں ہوگا۔ (۱۱) آمر کے وطن سے سفر شروع کرے۔ (۱۲) حج کو فاسد نہ کرے (۱۳) آمر ہی کی طرف سے نیت حج کی بوقت احرام کرے۔ (۱۴) فوت بھی نہ کرے (۱۵) آمر کی مخالفت نہ کرے۔ باقی پانچ شرطوں کا تعلق اسی شرط مخالفت سے ہے وہ درحقیقت الگ شرط نہیں۔

یہ سب شرائط فرض حج بدل کے لیے ہیں حج نفل اور عمرہ نفلی کے لیے اگر مامور اپنے مال سے تبرعاً واحساناً کرتا ہے تو کوئی شرط نہیں اور مال آمر کا خرچ کرتا ہے تو پہلی تین شرطیں جو آمر کی ذات سے متعلق ہیں وہ نہیں رہیں گی، باقی شرائط بدستور رہیں گی (غنیۃ الناسک)

مسئلہ۔ شرائط مذکورہ کے مطابق حج فرض جس کی طرف سے کیا گیا، صحیح اور راجح فقہاء کے نزدیک یہی ہے کہ یہ حج وعمرہ آمر یعنی حج کرانے والے کا ہوگا اور حج وعمرہ کرنے والے کو اس کی امداد کرنے کا ثواب ملے گا۔ اور حج کے بعد زائد عمرے یا طواف وغیرہ کرے گا تو وہ خود اس کے ہوں گے، عمرہ یا حج نفل میں بھی جبکہ آمر کے خرچ سے کیا گیا ہو یہی حکم ہے کہ آمر کا ہوگا، مامور کو اس کے عمل کا ثواب ملے گا (کذا فی کافی الحاکم، ارشاد الساری وغیرہ)

البتہ اگر نفلی حج یا عمرہ کسی نے اپنے خرچ سے کیا اور کرنے کے بعد کسی کو ثواب پہنچا دیا تو یہ حج وعمرہ خود کرنے والے کا ہوگا۔ اور جس شخص کو ثواب پہنچایا ہے اس کو ثواب ملے گا۔ (غنیہ)

مسئلہ۔ جس شخص نے اپنا حج فرض ادا کرلیا ہے، اس کے لیے نفل حج کرنے

سے بہتر اور افضل یہ ہے کہ کسی دوسرے کی طرف سے فرض کا حج بدل کرے۔ حدیث میں ہے جو شخص کسی دوسرے کی طرف سے حج بدل کرتا ہے۔ اس کو سات حجوں کا ثواب ملتا ہے۔ (غنیہ)

جس نے اپنا حج نہیں کیا اس سے حج کرانا | افضل اور بہتر تو سب کے نزدیک یہی ہے کہ حج فرض کا بدل اس شخص سے کرایا جائے جو اپنا حج فرض ادا کر چکا ہو اور جس نے اپنا حج ادا نہیں کیا اگر وہ ایسا ہے کہ اس پر حج فرض ہی نہیں تو اس کا حج بدل کے لیے امر کرنا جائز ہے۔ مگر مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولیٰ ہے اور اگر اس شخص کے ذمہ خود حج فرض ہے اور وہ ابھی ادا نہیں کیا، اس حالت میں دوسرا کوئی اس کو اپنے حج بدل کے لیے بھیجے تو بھیجنے والے کے لیے تو مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ ہی ہے مگر اس حج بدل پر جانے والے کے لیے مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے کیونکہ اس کے ذمہ لازم ہے کہ جب اس کو حج کی سہولت میسر آجائے تو اپنا حج فرض ادا کرے (غنیہ)

مسئلہ۔ جس شخص پر پہلے سے حج فرض نہیں تھا اگر یہ کسی دوسرے کی طرف سے حج بدل پر چلا گیا اور اسی کی طرف سے احرام باندھ کر مکہ معظمہ میں داخل ہوا تو بیت اللہ کے پاس پہنچنے سے اس کے ذمہ اپنا حج فرض نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس حالت میں مکہ مکرمہ پہنچا ہے کہ دوسرے کی طرف سے احرام باندھنے کی بناء پر اپنا حج کرنے پر اسں کو قدرت نہیں۔ اور واپسی کے بعد غریب ہونے کی بناء پر دوبارہ جانے کی قدرت نہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اگرچہ اس کے ذمہ پہلے سے حج فرض نہیں تھا، مگر بیت اللہ کو دیکھنے سے اس پر حج فرض ہوگیا۔ اس لیے اس پر لازم ہے کہ سال بھر وہیں ٹھہرے اور اگلے سال اپنا حج کرکے واپس آئے۔ (غنیہ)

آج کل چونکہ نہ قیام طویل اختیار میں ہے۔ نہ اس کے وسائل اختیار میں، اس لیے پہلے قول پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ بحیثیت دلیل بھی وہ ہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

آمر کے وطن سے حج بدل کرنے کا مسئلہ | جو اوپر شرائط میں مذکور ہے یہ اس وقت

سے جبکہ وصیت کرنے والے کے کل مال کا ایک تہائی اتنا ہو کہ اس کے وطن سے حج کرایا جا سکے۔ اور اگر تہائی مال میں یہ گنجائش نہ ہو اور وارث تہائی سے زائد خرچ کرنے کے لیے راضی نہیں تو ایک تہائی مال میں جس جگہ سے حج کرایا جا سکتا ہے۔ کرا دیا جائے۔ (غنیہ، ملا علی)

مسئلہ۔ اسی طرح اگر مرنے والے نے خود اپنے وطن کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے حج بدل کرنے کی وصیت کردی تو وصی اسی جگہ سے حج کرائے۔

حج بدل میں قِران اور تمتّع

حج بدل کرنے والا اگر آمر کی اجازت کے بغیر قران کرے، اس طرح کہ عمرہ اپنی طرف سے اور حج آمر کی طرف سے کرے، تو باتفاق فقہاء یہ حج آمر کا ادا نہیں ہوگا خود مامور کا ہو جائے گا، اور مامور پر نفقہ حج کا ضمان عائد ہوگا اور اگر عمرہ کی نیت بھی آمر کے لیے کی اور حج کی بھی تو امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ بھی جائز نہیں اور اس صورت میں حج آمر کا نہیں ہوگا، مامور پر ضمان واجب ہوگا۔ مگر صاحبین رحمہا اللہ کے نزدیک استحساناً حج آمر کا ادا ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ اور وجہ اختلاف کی مبسوط شمس الائمہ سرخسی میں بعبارت ذیل مذکور ہیں:۔

(۱) ولو قرن مع الحج عمرة کان مخالفا ضامنا للنفقة عند ابی حنیفةؒ وعندهما لا یصیر مخالفا استحسانا لانه اتی بالمامور به وزاد علیه ما یجانسه فلا یصیر مخالفا کالوکیل بالبیع اذا باع باکثر مما سمّی له من جنسه و ابو حنیفه یقول هو مامور بانفاق المال فی سفر مجرد للحج وسفره هذا ما تفرد بل للحج والعمرة جمیعا فکان

مخالفًا کمالو تمتع۔ ولا ولایۃ علیہ للحاج فی اداء نسک عنہ الا بقدر ما امرہ الاتری انہ لولم یامرہ بشی لم یجز اداءہ عنہ فکذلک اذا لم یامرہ بالعمرۃ فاذا لم تکن عمرتہ عن المیت صار کانہ نوی العمرۃ عن نفسہ وھناک یصیر مخالفًا (ثم قال بعد ذلک) ثم دم القرآن عندھما علی الحاج من مال نفسہ وکذلک عند ابی حنیفۃ اذا کان مامورًا بالقرآن من جھۃ المیت حتی لم یصر مخالفًا لان دم القرآن للنسک وسائر المناسک علیہ ثم قال بعد ذلک۔

(۲) واذا کان امر بالحج فبدأ واعتمر فی اشھر الحج ثم حج من مکۃ کان مخالفًا فی قولھم جمیعًا لانہ مامور بان یحج عن المیت من المیقات والمتمتع یحج من جوف مکۃ فکان ھذا غیر ما امر بہ ولانہ مامور بالانفاق فی سفر یعمل فیہ للمیت وانما انفق فی سفر کان عاملًا فیہ لنفسہ لان سفرۃ انما کان للعمرۃ وھو فی العمرۃ عامل لنفسہ۔

مبسوط کی عبارتِ مذکورہ سے چند امور ثابت ہوئے۔ اول یہ کہ حج بدل میں قران و تمتع دونوں کے ناجائز ہونے اور آمر کا حج ادا نہ ہونے کی علت باتفاق ائمہ مخالفت حکمِ آمر کی ہے۔ اور تمتع میں حج کا میقاتی نہ رہنا بھی فی نفسہٖ علت عدم جواز نہیں۔ بلکہ وہ بھی مخالفتِ آمر ہی کی بنیاد پر ممنوع ہے۔ جیسا کہ عبارت نمبر ۱، ۲ سے واضح ہے۔

دوسرے یہ کہ صاحبین نے اس مخالفت کو قران کی حد تک تو استحسانًا جائز قرار دے دیا۔ مگر تمتع میں مخالفت دوہری ہوگئی۔ ایک حج کے ساتھ بلا اجازت عمرہ کا

شامل کرنا۔ دوسرے امرِ حج کے میقاتی کرنے کا تھا۔ اس صورت میں وہ حج مکی ہو گیا۔ اس لیے اس مخالفت کو انھوں نے بھی جائز نہیں سمجھا اور حکم یہ دیا کہ آمر کا حج اس سے ادا نہیں ہوا۔ مامور پر ضمان آئے گا۔

تیسری بات اس سے یہ نکل آئی کہ جب عدمِ جواز کی علت مخالفتِ آمر ہوئی۔ تو اجازتِ آمر کے ساتھ قران اور تمتع دونوں جائز ہو جانے چاہییں۔ چنانچہ باجازتِ آمر قران جائز ہونے کی تصریح عبارت نمبر۲ میں آئی ہے۔ اسی طرح ہدایہ میں بھی باجازتِ آمر قران جائز ہونے کی تصریح ان الفاظ میں آئی ہے:۔

فان امرہ غیرہ ان یُقرن عنہ فالدم علی من احرم فانہ وجب شکرًا لما وفقہ اللہ تعالیٰ من الجمع بین النسکین والمامور ھو المختص بھذہ النعمۃ لان حقیقۃ الفعل منہ ۵۱-

مبسوط اور ہدایہ کی دونوں تصریحات میں ذکر صرف قران کا کیا گیا ہے۔ حالانکہ مدارِ اجازت جب آمر کی اجازت پر ٹھہرا تو مقتضا اس کا یہ ہے کہ قران ہو یا تمتع۔ جب باذنِ آمر ہو تو دونوں جائز ہونے چاہییں۔ اسی لیے مبسوط کی مذکور الصدر بحث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وارادبالقرآن الجمع بین النسکین قرآنًا کان او تمتعًا کما صرح بہ فی غایۃ البیان لکن بالاذن المتقدم۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ جب آمر کی طرف سے اجازت ہو تو قران و تمتع دونوں جائز ہیں اور حج و عمرہ آمر ہی کی طرف سے ہوگا۔

فتاویٰ قاضی خان میں امام ابوبکر محمد بن الفضل سے بھی جو کلام نقل کیا ہے۔ اس کا ظاہر یہی ہے کہ آمر کی اجازت سے حج کی تینوں قسمیں افراد۔ قران۔ تمتع سب جائز ہیں بلکہ ان کی ہدایت یہ ہے کہ آمر کو چاہیے کہ مامور کو عام اجازت دے دے تاکہ اس کو عمل میں تنگی اور دشواری پیش نہ آئے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

قال الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل رحمہ اللہ تعالیٰ

اذا امر غیرہ بان یحج عنه فینبغی ان یفوض الامر الی المامور فیقول حج عنی بهذا المال کیف شئت ان شئت حجة وان شئت حجة وعمرة وان شئت قراناً والباقی من المال لك وصیةً کیلا یضیق الامر علی الحاج ولا یجب رد ما فضل علی الورثة (قاضی خان برحاشیہ عالمگیری طبع مصر ص۳۰۷ ج ۱)

منسک علامہ سندی مسمی لباب میں قاضی خان کی مذکورہ عبارت کا یہی مفہوم قرار دے کر لکھا ہے:۔

وینبغی للآمر ان یفوض الامر الی المامور فیقول حج عنی کیف شئت مفرداً او متمتعاً۔ (ارشاد الساری، مناسک ملا علی قاری ص۳۰۴)

لیکن ملا علیؒ نے منسک سندی کی شرح میں لباب کے اس قول کو سہو قرار دیا اور اس کے قول متمتعاً پر فرمایا:۔

فیه ان هذا القید سهو ظاهر اذ التفویض المذکور فی کلام المشائخ مقید بالافراد والقران لا غیر (ثم قال) واما فی قاضی خان من التخییر بحجة او عمرة وحجة او بالقران فلا دلالة له علی جواز التمتع اذ الواو فی وحجة لا تقید الترتیب فتحمل علی حج وعمرة بان یحج اولاً ثم یاتی بعمرة له ایضاً فتدبر فانه موضع خطر۔

مگر علامہ حسین بن محمد سعید عبد الغنی نے عبارت مذکورہ کے حاشیہ میں اس کو سہو قرار دینے کی تردید ان الفاظ میں فرمائی ہے:۔

قوله فیه ان هذا القید سهو ظاهر: قال القاضی عبد فی شرحه لهذا الکتاب (یعنی اللباب) ولا یخفی ان هذا

سھو منہ (یعنی علی القاری) لان المیت لو امرہٗ بالتمتع
فتمتع المامور صح ولا یکون مخالفا بلا خلاف بین
الائمۃ الاسلاف کذا فی الحباب (ارشاد الساری ص۳۰۴)

امام ابوبکر بن الفضل کے قول بروایت قاضی خان میں تخییر کے لیے تین لفظ استعمال ہوئے، اول بحجۃ جس کے معنی افراد ہیں اور آخر میں قرانا ہے۔ اس سے پہلے بحجۃ وعمرۃ ہے۔ اس میں غور کرنے سے یہ تو ظاہر ہے کہ اگر تخییر صرف افراد اور قران کی مقصود ہوتی تو یہ تیسرا لفظ بحجۃ وعمرۃ فضول وبے معنی ہو جاتا ہے۔ مگر اس کو جواز تمتع کی تصریح بھی اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ حجۃ کو مقدم، عمرۃ کو موخر کر کے لکھا ہے جو تمتع کی ترتیب کے خلاف ہے۔

لیکن غنیۃ الناسک جو درحقیقت علامہ سندھی کے متن لباب ہی کی تشریح وتلخیص ہے۔ اس میں حجۃ وعمرۃ کے لفظ کی ایک دوسری تشریح کر کے باذن آمر اجازت کو صرف قران کے لیے مخصوص فرمایا۔ اور تمتع کی اجازت کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کی عبارات حسب ذیل ہیں:۔

فاذا وقع الاذن بخلافہ کما لو امرہ بالقرآن جاز لانہ
تداتی بما امر بہ ولا یصیر مخالفا باحرامہ من مکۃ
للاذن بہ دلالۃ وکذا لو امرہ بالتمتع علی القول بجواز
النیابۃ فیہ کما سیاتی (ص ۱۷۹)

اس کے بعد فصل نفقہ میں فتاویٰ خانیہ سے امام ابوبکر بن الفضل کا مذکور الصدر نقل کر کے فرمایا:۔

وقولہ ان شئت حجۃ وعمرۃ بتقدیم الحجۃ کما فی النسخ
الصحیحۃ بان یحج عنہ اولاً ثم یأتی بعمرۃ لہ ایضاً
فیکون افرادًا بھما۔ وھکذا فی الکبیر لکنہ قال فیقول
حج عنی بھذا کیف شئت ان شئت حجۃ وان شئت

فاقرن والباقی الخ فالتقیید بهما مع ان التمتع اسهل
و انسب بالتفویض بدل علی ان المتمتع لا یجوز عن
الآمر وان کان بامره . ثم سکوتهم عن دم المتمتع
حیث قالوا ودم القرآن علی المامور یؤید ذلک (الی
قوله) ولکن ما زاد فی اللباب یوافقه ما فی البحر
وغیره من جواز المتمتع حق الآمر اذا کان بامره کما
سیأتی عنقریب (وقال لقد ذلک) ودم الرفض علی الحاج
وان کان الحج یقع عن الآمر فی القرآن واما فی المتمتع
التمتع فلو امره بالتمتع فتمتع عنه فالحج یقع عن
المامور لا عن الآمر علی ما مر من المشائخ فاولی ان
یکون الدم علیه (غنیہ ص۱۸۶ تا ص۱۹۵)

خلاصۂ تحقیق

حضرات فقہاء کی مذکورہ بالا بحث وتحقیق میں غور کرنے سے حاصل یہ معلوم ہوتا ہے
کہ آئمہ مذہب کی تصریحات مندرجہ مبسوط وغیرہ سے حج بدل میں قران وتمتع دونوں
کے عدم جواز کی علت مخالفت آمر کو قرار دیا ہے اور درصورت تمتع حج کا آفاقی امر
کے بجائے مکہ مکرمہ سے ہوجانے کو بھی اسی علت پر مبنی کیا ہے کہ اس میں آمر کی
مخالفت ہے۔

اس کا مفہوم ظاہر یہی نکلتا ہے کہ جب یہ علت ممانعت یعنی مخالفت آمر نہ
رہے۔ آمر اجازت دے دے تو قران وتمتع دونوں جائز ہونے چاہییں۔
اور فی نفسہ نیابت کے معاملہ پر غور کیا جائے تو مقتضائے اصل یہی معلوم ہوتا
ہے کہ اصیل یعنی آمر اگر خود اپنا حج ادا کرتا تو اس کو حج کی تینوں قسموں میں جس کو
چاہے اختیار کرنے کا حق تھا کہ افراد کرے یا قران یا تمتع. جب حالت عذر میں شریعت

نے اس کو اپنے نائب کے ذریعہ حج فرض ادا کرنے کی اجازت دے دی تو اس کو یہ حق مل گیا کہ جن تین قسموں کا اس کو اختیار حاصل تھا وہ اختیار اپنے نائب کو سپرد کردے اور باذن آمر نائب یعنی مامور کے لیے بھی تینوں قسمیں جائز قرار دی جائیں اجازت آمر سے صرف قران جائز ہوسکے، تمتع جائز نہ ہو، اس کی کوئی فقہی وجہ باقی نہیں رہتی۔ قران و تمتع میں فرق کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی۔ کہ قران میں حج و عمرہ دونوں میقات آمر سے ہورہے ہیں، تمتع میں حج میقات آمر سے نہیں رہتا مگر اوپر مبسوط کی تصریح سے ثابت ہوچکا ہے کہ حج کا آفاقی ہونا کوئی اصلی شرط نہیں۔ اس کو شرط اس لیے کہا گیا ہے کہ عادتاً آمر مامور کو اپنے میقات سے احرام باندھنے کے لیے کہتا ہے، اس کے خلاف کرنے میں آمر کی مخالفت ہوتی ہے۔ جب یہ مخالفت آمر کی علت رفع ہوگئی تو تمتع میں حج کے میقاتی نہ ہونے کو علت عدم جواز نہیں کہا جاسکتا۔

خصوصاً جبکہ میقاتی ہونے کی شرط خود اصیل یعنی آمر میں بھی عائد نہیں ہے، وہ اگر کسی ضرورت سے سفر کرکے مکہ مکرمہ پہنچ جائے اور وہیں سے اپنا حج فرض ادا کرے تو باتفاق جائز ہے۔ تو اس کے نائب پر حج کے میقاتی ہونے کی پابندی صرف امر آمر کی اتباع ہی کی بناء پر عائد ہوسکتی ہے۔ جب وہ خود حج کے مکی کرنے کی اجازت دے دے تو عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

اشتباہ کی ایک وجہ یہ رہ جاتی ہے کہ فقہاء مذہب نے ایک طرف تو یہ واضح طور پر فرمایا کہ حج بدل میں قران و تمتع کی ممانعت کی وجہ مخالفت آمر ہے۔ مگر دوسری طرف اس کے مفہوم مخالف کو اولاً تو قصداً اور نصاً ذکر نہیں فرمایا۔ ضمنی طور پر وجوب دم شکر کے مسئلہ میں فرمادیا کہ جب قران باذن آمر ہو تو بھی دم بذمہ مامور ہوگا۔ اس بیان میں صرف قران کا ذکر کیا ہے، تمتع کا ذکر نہیں کیا۔ اسی عدم ذکر کو صاحب غنیہ نے اس کا قرینہ قرار دیا ہے کہ تمتع جائز نہیں، کیونکہ وہ بھی جائز ہوتا تو قران کے ساتھ اس کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ مگر عدم ذکر کو ذکر عدم

کا قائم مقام بغیر کسی واضح دلیل کے نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے صاحب بحر نے اس جگہ قران کو بمعنی جمع بین النسکین قرار دے کر تمتع کو بھی اس میں شامل کر دیا، اس توجیہہ پر تمتع کا عدم ذکر بھی باقی نہیں رہتا۔ اور عدم ذکر کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بظاہر کوئی دلیل قران و تمتع میں فرق کرنے والی موجود نہیں۔ لیکن علماء متاخرین میں حضرت ملا علی قاری اور صاحب غنیہ اور ہمارے زمانے کے اکابر علماء خصوصاً فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے زبدۃ المناسک میں اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے ابوداؤد کی شرح بذل المجہود میں حج بدل میں قران و تمتع کے فرق اور قران کے جواز اور تمتع کے عدم جواز کو اختیار فرمایا ہے۔ اگرچہ باجازت آمر ہو۔ اس کے ساتھ ائمہ فقہاء کے کلام میں بھی جواز تمتع باذن الآمر کی تصریح باوجود تلاش کے نہیں ملی۔ اس لیے مسئلہ پھر محلِ غور و تامل ہو گیا۔

عبارات فقہاء میں غور کرنے سے قران و تمتع میں ایک وجہ فرق کی کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فریضۂ حج بدنی اور مالی دونوں قسم کی عبادت کا مجموعہ ہے۔ عذر کی حالت میں اس کی بدنی اور جسمانی حیثیت تو ساقط ہو گئی، اب صرف انفاق مال ہی ادائے فرض کا طریق رہ گیا۔ اور تمتع کی صورت میں یہ مال حج پر خرچ نہیں ہوا بلکہ عمرہ پر خرچ ہو گیا۔ جو فرض نہیں۔ بخلاف قران کے کہ اس میں مال کا خرچ دونوں پر یکساں ہوا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آمر کو قران کی اجازت دینے کا تو حق دیا جائے، تمتع کی اجازت دینے کا اس کو بھی حق نہ ہو، کیونکہ ادائے فریضۂ حج کے لیے اس صورت میں نہ اس کا کوئی عمل ہوتا ہے اور نہ حج پر اس کا مال خرچ ہوتا ہے۔ اس لیے تمتع کی صورت میں اس کا حج ادا نہیں ہونا چاہیے۔ ملا علی قاری وغیرہ جن حضرات فقہاء نے باذن آمر بھی تمتع کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، مذکورہ تحریر سے ان کے کلام کی ایک وجہ ظاہر ہو گئی۔ مگر اس کو بھی کوئی قطعیت حاصل نہیں، دوسرے فقہاء صاحب لباب وغیرہ جو جواز تمتع کے قائل ہیں، وہ اس وجہ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات نا قابل تسلیم نہیں کہ تمتع کی صورت میں انفاق مال حج پر نہیں ہوا کیونکہ

اس نے یہ خرچ کسی عمرہ مفردہ پر نہیں کیا، بلکہ حج کی تین قسموں میں سے ایک قسم پر کیا ہے جس میں عمرہ مقدم ہوتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آیا کہ انفاق مال صرف عمرہ پر ہوگیا، حج انفاق مال سے خالی رہ گیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

خلاصۂ فتویٰ

اگرچہ من حیث الدلیل رجحان اس کا معلوم ہوتا ہے کہ حج بدل میں آمر کی اجازت سے قران اور تمتع دونوں جائز ہوں اور فقہاء متاخرین میں صاحب لباب اور اس کے حاشیہ حباب وغیرہ میں اسی کو اختیار بھی کیا گیا ہے مگر ملا علی قاری اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ کا فتویٰ اس سے مختلف ہے۔ وہ تمتع کو باذن آمر بھی جائز قرار نہیں دیتے۔ معاملہ ادائے فرض کا نازک ہے اس لیے احتیاط لازم ہے۔ جہاں تک ممکن ہو، حج بدل میں افراد یا قران کیا جائے، تمتع نہ کریں۔ لیکن اس زمانے میں حج وعمرہ کرنے میں عام آدمی آزاد نہیں کہ جب اور جس وقت چاہیں جا سکیں اور طول احرام سے بچنے کے لیے ایام حج کے بالکل قریب سفر کریں۔ ہر طرف حکومتوں کی پابندیاں شدید ہیں، اس لیے اگر کسی حج بدل کرنے والے کو وقت سے زیادہ پہلے جانے کی مجبوری ہو اور احرام طویل میں واجبات احرام کی پابندی مشکل نظر آئے تو اس کے لیے تمتع کر لینے کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حج بدل کے مصارف اور نفقہ حج بدل کے لیے تمام ضروری مصارف سفر کی آمد و رفت اور بقدر ضرورت قیام اور ایام حج میں جن چیزوں کی عادتاً ضرورت ہوتی ہے کھانے پینے کی ضروریات، کپڑوں کی دھلائی، رہنے کے لیے مکان یا خیمہ کا کرایا وغیرہ، وہ سب آمر یعنی حج بدل کرانے والے کے ذمہ ہیں فقہاء رحمہم اللہ نے ان تمام ضروری مصارف کی تفصیل لکھی ہے، مگر ہر زمانے کی ضروریات اس کے مناسب ہوتی ہیں، مامور کو چاہیے کہ احتیاط کے ساتھ ان ضروریات کا تعین کرے اور ان میں خرچ کرنے میں نہ اسراف و فضول خرچی سے کام لے نہ بہت تنگی

ہے بلکہ متوسط انداز سے خرچ کرے (خلاصہ از مناسک ملا علی) اور بعض مصارف ایسے بھی ہیں جن میں آمر کے مال سے خرچ کرنا جائز نہیں، مامور کو خود اپنے مال سے کرنا لازم ہے۔ مثلاً وضو اور غسل کے پانی کی قیمت، بیمار ہو جائے تو دوا دارو کا خرچ مامور کو اپنے مال سے کرنا لازم ہے۔ اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں کسی دوسرے کی تواضع کرنا، اس کو کھلانا آمر کے مال سے جائز نہیں مگر یہ سب اس وقت ہے جبکہ آمر نے اس کی اجازت اور وسعت نہ دی ہو۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ آمر خرچ میں وسعت سے کام لے، مامور کو اجازت دے دے، تاکہ ہر قدم پر اس کو یہ سوچنا نہ پڑے کہ یہ خرچ آمر کے مال سے کروں یا اپنے مال سے، کھانے کے وقت کوئی آجائے اور اس کو شریک کرنا پڑے تو اس میں حساب لگانا نہ پڑے کہ کتنا آمر کے مال پر ڈالے کتنا خود ادا کرے اسی طرح کے معمولی مصارف میں آمر کو چاہیے کہ مامور کو اجازت عام دے دے۔ اس صورت میں باتفاق مامور کو ان سب چیزوں میں آمر کا مال خرچ کرنا جائز ہوگا (مناسک ملا علی)

مسئلہ۔ احرام کے کپڑے اور سفر میں برتنے کی اشیاء آمر کے مال سے خریدنا جائز ہے۔ مگر حج سے فراغت کے بعد یہ سب سامان اور جو کچھ نقد بچے وہ سب آمر کو یا اس کے وارثوں کو واپس کرنا لازم ہے۔ اگر مامور نے یہ شرط کر لی ہو کہ یہ سامان اور جو کچھ نقد بچے وہ میرا ہے تو یہ شرط بھی باطل ہے کیونکہ یہ حج کرنے کا معاوضہ ہوگا جس کا لینا دینا حرام ہے۔ یہ چیزیں بہرحال اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ۔ البتہ اگر آمر خود اس کو کہہ دے کہ یہ سامان اور جو کچھ نقد بچے وہ میری طرف سے آپ کے لیے ہدیہ ہے یا مرنے والا وصیت کر رہا ہے تو وہ کہہ دے کہ باقی میری طرف سے بطور وصیت مامور کا حق ہے۔ اس صورت میں مامور پر باقی ماندہ نقد اور اشیاء کا واپس کرنا ضروری نہیں۔ فتاویٰ قاضی خان میں امام ابوبکر بن الفضل سے نقل کیا ہے کہ آمر کو ایسا کرنا بہتر ہے۔

مسئلہ۔ حج بدل کرنے والے کو راستہ میں کسی جگہ قیام کرنا پڑے یا حج سے پہلے اور بعد مکہ مکرمہ یا مدینہ طیبہ میں جہازوں کی روانگی اور ان میں جگہ ملنے کے انتظار میں جتنا

قیام کرنا پڑے۔ اس زمانہ قیام کے نفقات آمر کے مال سے لیے جائیں گے۔ خواہ یہ قیام پندرہ دن سے کم ہو یا زیادہ۔ البتہ اگر اپنی ضرورت سے زائد قیام کرے گا تو اس زائد قیام کے زمانے کا نفقہ خورد و نوش وغیرہ آمر کے مال سے لینا جائز نہیں، اس میں اپنا مال خرچ کرنا لازم ہے (یہ سب مسائل ارشاد الساری شرح مناسک ملا علی قاری سے ماخوذ ہیں)

مسئلہ۔ اگر آمر نے تیسرے درجے ڈیک میں سفر کرنے کا خرچ دیا اور مامور اس سے اوپر والے درجے سیکنڈ یا فسٹ میں سفر کرے یا ہوائی جہاز سے سفر کیا تو زائد خرچ مامور کو اپنے مال سے دینا ہوگا۔

تنبیہ: مگر اس صورت میں اگر مجموعہ خرچ مامور کا آدھے مصارف حج کی برابر یا زیادہ ہو جائے تو قاعدہ کا تقاضا یہ ہے کہ آمر کا حج ادا نہ ہو، کیونکہ شرائط حج بدل میں اوپر آچکا ہے کہ حج بدل ادا ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ اکثر مال آمر کا خرچ ہو، اس صورت میں اکثر مال مامور کا خرچ ہو گیا، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زیادتی سفر حج کے لوازم میں نہیں۔ بلکہ اپنی راحت کے لیے ہے، اس لیے اس زیادتی کا اثر مامور پر نہیں پڑنا چاہیے۔ مگر فقہاء کے کلام میں باوجود تلاش کے یہ مسئلہ نہیں ملا اس لیے عمل کرنے والوں کو چاہیے کہ ایسی صورت پیش آئے تو دوسرے علماء سے بھی استصواب کرلیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
رجب ۱۳۹۲ھ